غالب نامہ

غالب نامہ

از

شیخ محمد اکرام ایم۔ اے۔ ایم۔ آر۔ سی۔ اے۔ ایس (لنڈن)۔
آئی۔ سی۔ ایس

سب ڈویژنل افسر سورت۔ احاطہ بمبئی

سنہ ۱۹۳۶

ترجمانِ حقیقت علّامہ سر محمد اقبال مدظلہ

کی خدمت میں

ع حدیثِ اہلِ دل با اہلِ دل گو

اکرام

یادش بخیر۔ آج سے سات آٹھ سال اُدھر کی بات ہے۔ حصولِ تعلیم کا زمانہ تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ حسنِ اتفاق سے نہائت قابل اور شفیق اُستاد میسر آئے تھے۔ لیکن شائد اس سے بھی بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ چند ایسے احباب کا حلقہ جمع ہو گیا جنہوں نے بالعموم سائنس، فلسفہ، انگریزی ادبیات اور دوسرے مغربی علوم و فنون میں امتیازی کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن جن کی عزیز ترین خواہش "گیسوئے اردو" کی شانہ کشی" تھی۔ ہم جب جمع ہوتے تو گوئٹے، شکسپیر، نیٹشے، ہارڈی، سپینگلر کے ساتھ ساتھ اقبالؔ۔ غالبؔ۔ حالیؔ۔ رُومیؔ کا ذکر رہتا۔ اور جب ہم شیکسپیر کے متعلق سر والٹر رالے اور اور پروفیسر بریڈلے کی کتابیں پڑھتے۔ جنہوں نے شعر و ادب کے مطالعہ کو حیاتِ انسانی کی عمیق گہرائیوں اور اسکے اہم ترین پہلوؤں کا مطالعہ بنا دیا تھا۔ تو ہمیں اپنے تبصرہ نگاروں کی سطحی تنقید پر افسوس آتا۔ جنکے نزدیک فنِ تنقید کا ماحصل اتنا ہے کہ ایک شاعر کے اشعار میں زبان اور بیان کی خوبیاں بتا دی جائیں اور اُسکی چند غزلوں کا دوسرے شعرا کی ہم طرح غزلوں سے مقابلہ کر دیا جائے۔ یا زیادہ سے زیادہ دیوان سے پہلے ایک طول طویل دیباچہ میں آرٹ کی قسمیں اور آرٹ کے متعلق چند نظریئے مغربی کتب سے اخذ کر کے درج کر دیئے۔ جن سے شاید پڑھنے والا مرعوب تو ہو جاتا ہے۔ لیکن اُسکے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

ہمارا حلقۂ احباب بہت وسیع نہیں تھا۔ لیکن جلد ہی ہم میں سے دو کو آئی۔ سی۔ ایس کی کشش آسام

اور بنگال لے گئی۔ ہم تین باقی رہ گئے۔ چوہدری محمد علی۔ ممتاز حسن اور مَیں۔ چوہدری صاحب اسوقت لاہور میں اسسٹنٹ اکونٹنٹ جنرل تھے۔ ممتاز اور میں ابھی کالج اور یونیورسٹی کے امتحانات کے چکر سے نہیں نکلے تھے ممتاز صاحب بی۔ اے میں فلسفہ، عربی اور انگریزی تینوں مضامین میں اول آئے تھے۔ اُنکی بڑی خواہش تھی۔ کہ وہ انگریزی ایم۔ اے میں فسٹ کلاس حاصل کریں۔ انہیں پی۔ ای۔ ایس کے درجہ میں کوئی ملازمت ملجائیگی۔ اور وہ تمام عمر اردو ادب کی گیسو آرائی میں گزار دینگے۔ لیکن انہیں ایم۔ اے میں فسٹ کلاس نہ مل سکی۔ اور انہیں فنانس ڈیپارٹمنٹ میں ایک امپیریل سروس لینی پڑی۔ مجھے فسٹ کلاس ملگئی لیکن محکمہ تعلیم میں کوئی ملازمت نہ ملی۔ ناچار مجھے بھی سول سروس کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ لیکن حسنِ اتفاق سے پیشتر اسکے کہ ہم اس طرح منتشر ہوتے۔ میری اس کتاب کی بنیاد رکھی گئی۔ ہم تینوں ابھی لاہور میں ہی تھے۔ کہ غالب کے متعلق ڈاکٹر لطیف کی انگریزی کتاب شایع ہوئی۔ اسے پڑھکر ہم سب کے دلوں کو ایک ٹھیس سی لگی۔ ہم غالب پرست نہیں تھے۔ لیکن غالب کی عظیم اور دلآویز شخصیت کا جادو ہم پر بھی تھا۔ ہمیں اس کتاب کے بعض حصے بہت تلخ سے معلوم ہوئے۔ ممتاز صاحب کی رائے تھی کہ غالب کے متعلق ڈاکٹر لطیف کی تنقید نقادانہ غیر جانبداری سے عاری اور معاندانہ ہے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا چھٹا باب جسمیں انہوں نے شاعرانہ عظمت کی مثالیں دی تھیں پسند نہ تھا۔ اول تو جو مثالیں دی گئی تھیں ان سب کا میں مداح نہیں تھا۔ دوسرے مجھے یہ طرزِ تنقید بھی عجیب معلوم ہوتا تھا۔ کہ نقاد بجائے اسکے کہ شاعر کے کلام کا حُسن و قبح بوجہ خود دیکھے مغربی ادبیات کے چند نمونے مقرر کرلے۔ اور جو نظمیں اُن نمونوں کے مطابق نہ ہوں انہیں ناقص قرار دے۔ چوہدری محمد علی کہتے تھے۔ کہ ڈاکٹر لطیف نے غالب کے متعلق تو کتاب نہیں لکھی۔ اُن اصولوں پر ایک رسالہ لکھا ہے۔ جن کے مطابق ایسی کتاب لکھی جانی چاہئے۔ اب یہ کسی اور کا کام ہے۔ کہ وہ ان اصولوں کے مطابق مواد جمع کرے۔ اور کتاب لکھے۔ مجھے چوہدری صاحب کا یہ تبصرہ درست معلوم ہوا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ غالب کے متعلق ایک ایسی کتاب لکھی جانی چاہیئے جو ڈاکٹر لطیف کے کڑے معیار پر بھی پوری اُترے اور جسمیں مولانا حالی کی میانہ روی اور انکے مقدمہ دیوان کی بالغ نظری کی پیروی بھی ہو۔ یادگارِ غالب مجھے بہت پسند تھی۔ لیکن یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ کہ اس میں سوانحی تسلسل قریباً قریباً

مفقود تھا۔ اور شاعر کے کئی اہم واقعاتِ زندگی کے متعلق مصنف کا بیان نہایت سرسری اور سنِ وقوع یا اس طرح کی ضروری تفصیلات سے عاری تھا۔

میں نے اس کتاب کے لئے ہندوستان میں ہی مواد جمع کرنا شروع کردیا تھا۔ سب سے پہلی چیز غالب کا ایک ایسا تذکرہ مرتب کرنا تھا جسمیں واقعات سنِ وقوع کی ترتیب سے درج ہوں، لطائف وحکایات کی طرح ضمناً نہیں۔ غالب کے اردو خطوط اس مقصد کیلئے بہت کارآمد نہ تھے۔ اس لئے فارسی کلیات نظم و نثر کا بغور مطالعہ کرنا پڑا۔ اور میں جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ گیا۔ کہ غالب کے متعلق جو تذکرہ نگار ان کی فارسی تصنیفات کو دھیان میں نہیں رکھیگا۔ وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہوگا۔ چنانچہ میں نے مرزا کے فارسی خطوط کو تاریخی ترتیب سے مرتب کرنا شروع کیا۔ چونکہ وہ اکثر تاریخ تحریر سے معرّا تھے۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ لیکن جب میں ۱۹۳۱ء میں آکسفورڈ گیا۔ تو وہاں بوڈلین لائبریری میں مجھے ایک ایسی جنتری ملی جسکی مدد سے اگر ہجری سال اور مہینہ معلوم ہو تو عیسوی سال اور مہینہ معلوم ہوسکتا تھا۔ اور اگر عیسوی اور ہجری دونو مہینوں کی تاریخیں معلوم ہوں تو عیسوی اور ہجری سال معلوم ہوسکتے تھے۔ چنانچہ اس کتاب کی مدد سے میں غالب کے کئی خطوط کا سن تحریر اور اُنکی زندگی کے کئی واقعات (مثلاً تاریخ ولادت، سفر کلکتہ، واپسی وغیرہ) کی صحیح تاریخ معیّن کرسکا۔ اس کتاب کے علاوہ بوڈلین لائبریری میں اور کئی انگریزی کتابیں تھیں۔ جو اس کتاب کے ابواب سوم اور چہارم مرتب کرنے میں مفید ثابت ہوئیں مثلاً سلیمن کی "سیر و سیاحت" اور نائٹن کی "ایک مشرقی بادشاہ کی خانگی زندگی" پہلی میں مجھے نواب شمس الدین کے مقدمہ کے حالات ملے اور دوسری میں شاہانِ اودھ کے متعلق ایسی واقفیت حاصل ہوئی جس سے میں حالی کی کئی غلط فہمیوں سے بچ سکا۔

لیکن ان سے بھی قیمتی چیز جو قیامِ انگلستان میں میرے ہاتھ آئی "گلشن بیخار" کا ایک بیش قیمت قلمی نسخہ تھا۔ جو پہلے "گارسن دتاسی" کے پاس تھا۔ اور اب برٹش میوزیم کی ملکیت ہے۔ اسکی مدد سے میں غالب کی کئی ایسی غزلوں کو تیقن کے ساتھ علیحدہ کرسکا جنکا انتخاب ۱۸۳۲ء میں ہوا تھا۔ اور جو اس قلمی نسخہ میں موجود تھیں

لیکن مجھے جس چیز کی سب سے زیادہ تلاش تھی۔ وہ دیوان غالب کا پہلا مطبوعہ نسخہ تھا۔ جو ۱۸۴۱ء میں دہلی میں چھپا۔ یہ مجھے انگلستان کی کسی لائبریری میں نہ ملا۔ اور جب میں ہندوستان واپس آیا۔ تو رام پور

اسکی تلاش میں گیا۔ وہاں میں نے دیوان غالب کا وُہ قلمی نسخہ دیکھا جو شاعر نے ۱۸۵۵ء میں نواب رامپور کو لکھکر بھیجا تھا۔ اور جس سے نقل کر کے بعد میں متداول دیوان شایع ہوا۔ اسکے علاوہ دیوان غالب فارسی جو ۱۸۴۵ء میں چھپا تھا۔ اسکی ایک نقل ملی۔ پہلا مطبوعہ منتخب دیوان نہ ملا۔ لیکن میری اس محنت اور کوشش کو کامیاب ہونا تھا۔ یہاں سے مجھے یہ اطلاع ملگئی۔ کہ مطبوعہ دیوان کا ایک نسخہ جس میں عام ایڈیشن سے نصف اشعار ہیں پیلی بھیت کے کلکٹر خان بہادر سید ابو محمد صاحب کے پاس ہے۔ یہ اُنکی بڑی کرمفرمائی تھی۔ کہ انہوں نے مجھے یہ نسخہ عاریتاً دیا۔ اور میں اسکی مدد سے دیوان غالب کی تاریخی تدوین اپنی امیدوں سے بہتر طور پر کر سکا

یہ کتاب جو سات آٹھ سال کی تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اور جسکی تیاری میں محنت اور اخراجات میں کسیطرح کا بخل نہیں کیا گیا اب ناظرین کے سامنے ہے۔ اگر اسکے ذریعہ سے غالب اور کلام غالب پر زمانۂ حال کے تنقیدی اصولوں سے تبصرہ نگاری کی مثال قائم ہوگئی اور بہادر شاہی دور پر جو پردے ہماری ناواقفیت سے پڑتے جارہے ہیں کسی حد تک اُٹھ گئے تو میں سمجھونگا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ مجھے اس کتاب کی تیاری میں بہت حضرات سے قیمتی مدد ملی ہے۔ لیکن میرے محسنوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ فرداً فرداً سب کی کرمفرمائی کا اعتراف کرنا بہت مشکل ہے۔ میں اُن کا مجموعی طور پر ان سطور کے ذریعہ سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اکرام

کیمپ تیتھل۔ ۵۔ مئی ۱۹۳۶ء

استدراک:- مَیں اپنی کتاب اور اسکا دیباچہ ختم کر چکا تھا۔ اور اشاعت کے متعلق خط و کتابت میں مصروف تھا۔ کہ مجھے ۱۵ مئی کو لاہور سے پروفیسر حمید احمد خاں کا خط ملا۔ کہ مولینا غلام رسول مہر نے بھی غالب کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے۔ جو جلد شایع ہونیوالی ہے اور جسمیں غالب کے حالات زندگی اسکی تصنیفات سے ماخوذ ہیں۔ چونکہ مینے بھی تذکرہ لکھتے وقت زیادہ تلاش و تحقیق فارسی خطوط میں کی تھی۔ مجھے اس امر کا خدشہ پیدا ہوا کہ چونکہ مہر صاحب کی تصنیف اور میری کتاب کے ماخذ ایک ہیں۔ شاید مضامین بھی ایک ہوجائیں۔ اور اگر انکی کتاب پہلے شایع ہوگئی تو میری برسوں کی محنت رائیگاں جائیگی۔ مینے کوشش کی کہ کتاب بہت جلد شایع کردوں لیکن صوبہ بمبئی میں اُردو کی کتابت اور طباعت کے انتظامات نہایت ناقص ہیں۔ اسکے علاوہ میں

سُورت سے باہر دَورہ پر تھا۔ اور صوبہ بمبئی میں جب تک برسات کی وجہ سے سب سڑکیں اور راستے بند نہ ہو جائیں ہمیں مسلسل دَورے پر رہنا پڑتا ہے۔ جب میں سُورت واپس آیا۔ تو انقلاب کے ایک پرچہ میں جو اتفاقاً خان بہادر حاجی رحیم بخش صاحب سے دستیاب ہوا یہ پتہ چلا کہ مہر صاحب کی کتاب کی "چھپائی شروع ہو گئی" اب میرے لئے زیادہ کوشش کرنا بیسود تھا۔ باقی تردداتِ موقوف کر کے میں اس امر کا منتظر رہا۔ کہ مہر صاحب کی کتاب شایع ہو تو میں دیکھوں کہ اسکے بعد میری کتاب کی گنجائش ہے یا نہیں ۲۸ اگست کو یہ کتاب مجھے ملی اسکے پڑھنے سے مجھے ایک گونہ تسلی ہوئی۔ مولینا کی کتاب بہت طویل اور مفصل تھی۔ اور اُنکی نظر بھی حالی کی اُن غلط فہمیوں پر پڑ گئی تھی۔ جنکی اصلاح میں اپنی کتاب کی امتیازی خصوصیت سمجھتا تھا اسکے علاوہ چونکہ اُنکی رسائی خاندانِ لوہارو کے بعض افراد تک ہوئی تھی۔ غالب کے خاندان اور جاگیر کے قضیوں کے متعلق اُنکی معلومات مجھسے زیادہ تھیں لیکن مینے دیکھا کہ انہوں نے اپنی کتاب میں وہ سوانحی تسلسل برقرار نہیں رکھا تھا جو ایک مربوط اور مکمل تذکرہ کیلئے ضروری ہے۔ مثلاً انہوں نے اپنی کتاب کے چوتھے باب میں مرزا کے سفر کلکتہ کا ذکر کیا ہے۔ جو میری تحقیق کے مطابق ۱۱۔ نومبر ۱۸۲۹ء کو ختم ہوا اور اسکے فوراً بعد پانچویں باب میں رام پور اور میرٹھ کے سفروں کے حالات ہیں۔ جو اسکے قریباً تیس سال بعد یعنی ۱۸۶۰ء میں مرزا کو پیش آئے چھٹے باب میں پھر پنشن کے مقدمہ کی تفصیلات ہیں۔ جن کا ذکر حقیقتاً سفر کلکتہ کے ساتھ ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ اسی طرح مرزا کی زندگی کے کئی اہم حصوں کی نسبت (مثلاً ۱۸۳۱ سے ۱۸۵۷ تک) کوئی مسلسل بیان نہیں قلعہ سے تعلقات کا ذکر دو صفحوں سے زیادہ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ مولینا کی کتاب پڑھنے کے بعد مَیں نے محسوس کیا کہ اگرچہ انہوں نے چند عنوانات کی تحت میں مرزا کی کتابوں سے اور دوسرے ذرائع سے مفصل اقتباسات جمع کر دیئے ہیں اور کتاب کا حجم بڑھ گیا ہے مگر ان کی کتاب میں مرزا کی مسلسل اور مربوط سوانحعمری لکھنے کی کوئی کوشش نہیں۔ اور ڈاکٹر لطیف کے اعتراضات کا جواب دینا باقی ہے۔ مولینا کی کتاب کا تنقیدی حصہ بیحد مختصر تھا۔ اور وہ بھی بیشتر مورخانہ۔ غالب اور کلام غالب کے متعلق ادبی تبصرہ چند سطروں سے زیادہ نہ تھا۔ اسکے علاوہ مَینے دیکھا کہ اگرچہ مرزا کے واقعاتِ حیات کے متعلق مہر صاحب کی معلومات بہت مفصل اور صحیح تھیں مگر غالب کی تصنیفات کے متعلق انکے اندراجات اکثر غیر مکمل اور کہیں کہیں غلط تھے۔ مثلاً وہ صفحہ ۱۲۹ پر لکھتے ہیں "غالباً ۱۸۵۴ء تک تاریخ کا پہلا حصہ جو ابتدائے آفرینش سے لیکر ہمایون بادشاہ

کی وفات تک کے حالات پر مشتمل تھا، مکمل ہوا۔ اس کا نام "مہر نیمروز تھا"۔ یہ کتاب جیسا کہ غالب کے دو فارسی خطوں سے پتہ چلتا ہے ۱۸۵۲ء میں ختم ہو گئی تھی۔ مثنوی "ابر گہربار" کی تاریخ تصنیف کے متعلق مولینا کو کوئی واقفیت نہیں۔ اسی طرح منتخب اردو دیوان کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن کی نسبت انہیں کوئی اطلاع نہیں۔ مولوی کریم الدین کا اندراج ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں خان بہادر سید ابو محمد والے نسخے کی نسبت انہیں کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اردو اور فارسی دواوین کے جو ابتدائی قلمی نسخے رام پور لائبریری کی زینت ہیں وہ مولینا کی نظر سے نہیں گزرے۔ بانکی پور لائبریری میں فارسی دیوان کا جو قلمی اور نہایت پرانا نسخہ ہے۔ اُسکے وجود کے متعلق بھی مولینا کو کوئی خبر نہیں۔ میں نے ان کتابوں کی تلاش میں برسوں محنت کی تھی۔ اور غالب کے اردو فارسی کلام کی جو تاریخی تدوین مرتب کی تھی۔ اس کی بنا انہیں پر رکھی تھی۔

مولینا مہر کی محنت اور تحقیق و تفتیش کی داد نہ دینا بے انصافی ہے لیکن مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر میں اسی نتیجہ پر پہنچا کہ میری کتاب کے دو حصص یعنی "تبصرہ" اور "انتخاب" کو تو انہوں نے چھوا تک نہیں۔ پہلے حصہ میں بھی چونکہ میں نے سوانحی تسلسل خاص طور پر ملحوظ رکھا تھا۔ میری اور اُنکی کتاب میں کئی اصولی باتیں مختلف تھیں۔ اور میری خود ستائی کہیے یا ادب اُردو کی خدمت کی خواہش۔ کہ مولینا مہر کی کتاب پڑھنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنی کتاب شایع کر دینی چاہیئے۔

میں لکھ چکا ہوں کہ مولینا مہر کی کتاب شایع ہونیسے بہت پہلے میری کتاب مکمل تھی۔ مولینا کی کتاب پڑھنے کے بعد چند فٹ نوٹ میں نے بڑھا دیئے اور غالب کی بیوی، عارف کی والدہ اور والد کے نام اُنکی کتاب سے نقل کر دیئے۔ انکے علاوہ اپنی کتاب میں کوئی اندراج نہیں بدلا اور واقعات کی تفصیل کو جوں کا توں رہنے دیا۔

آخیر میں میں جناب سالک کی اس تمنا میں اُن کا ہم نوا ہوں۔ کہ خدا مہر صاحب کو صحتِ کامل عطا کرے اور انہیں مرزا کے رقعات نئے سرے سے مرتب کرنے کا موقع دے۔ میرے خیال میں اردو فارسی دونو زبانوں کے رقعات کا انتخاب ہونا چاہیئے۔ اور وہ بھی تاریخی ترتیب سے۔ اگر مولینا اس کام کو ہاتھ میں لیں تو فارسی رقعات کی جو سرسری سی تاریخی ترتیب میں نے کی تھی۔ یا تاریخ تحریر معین کرنے کیلئے جو کتابیں فراہم کی تھیں انہیں مولینا کے حوالے کر سکتا ہوں۔

محمد اکرام ۴ ستمبر ۱۹۳۶ء۔ سورت

تذکرہ

بوادیے کہ دراں خضر را عصا خُفتست
بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خُفتست

غالبؔ

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خان

غالب

بابِ اوّل

اکبرآباد

مغلوں کا بیشتر زمانہ دہلی میں گزرا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ نہ صرف اُن کے فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ اکبرآباد میں ہے۔ بلکہ ان کے سب سے بڑے شاعر کا مولد بھی وہی بلدہ حسن وشعر ہے "مرزا اسد اللہ خاں" خود ترک کی نسل سے تھے۔ اور ان کے دادا سلطان زادہ رستم خاں ان کے پہلے بزرگ تھے۔ جنہوں نے اُنکی پیدائش سے فقط پچاس ساٹھ سال پہلے سمرقند چھوڑ کر ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔

مرزا شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا، پہلے لکھنؤ اور اسکے بعد عرصے تک حیدرآباد میں ملازم رہے۔ لیکن غالب نے اپنے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیداں کے پاس آگرے ہی میں پرورش پائی۔ وہ پانچ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اور ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا۔ جب اسکے چار پانچ برس بعد ۱۸۰۶ء میں چچا کا بھی انتقال ہوگیا۔

تو مرزا کو ان کا وارث ہونے کی وجہ سے ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ پنشن ملتی رہی۔ لیکن مرزا کے خطوط اور معاصرانہ تذکروں سے ظاہر ہے کہ آگرے میں اُن کا قیام اپنے نانا کے ہاں ہی تھا۔

غالب کے ننھیال کی نسبت ہماری واقفیت بہت محدود ہے۔ لیکن جو خط انہوں نے منشی شیو نرائن کو لکھا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ننھیال آگرے کے ممتاز ترین گھرانوں میں سے تھا۔ اور وہاں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام اور ہر طرح کی آزادی میسر تھی۔ ایسی آزادی کا اثر ایک نوجوان امیر زادے پر جس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہو۔ جو ہو سکتا ہے۔ وہی غالب پر ہوا۔ نواب اعظم الدولہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں :۔

"اسد اللہ خاں، مرزا نوشہ، از سمر قند مولدش
جوان قابل و یار باش و دردمند، ہمیشہ
بخوش معاشی بسر بردہ...... در خاطر متمکن
غمہائے عشق مجاز۔ تربیت یافتہ غملدۂ نیاز"

غالب نے اپنے خطوں میں اس رنگین زمانہ کی طرف کئی جگہ اشارہ کیا ہے۔ ان کے ایک ابتدائی فارسی قصیدے کی تشبیب ہے :۔

آں بلبلم کہ در چمنستاں بشاخسار ... بود آشیانِ من شکن طرۂ بہار
ہر غنچہ از دمم بفضائے شگفتگی ... فیض نسیم و جلوۂ گل داشت پیشکار
ہر جلوہ راز من بتقاضائے دلبری ... از غنچہ بود محمل نازے برہگزار
ہم سینہ از بلائے جفا پیشہ دلبراں ... فرہنگ کاروانی بیداد روزگار
ہم دیدہ از ادائے مغاں شیوہ شاہداں ... فہرست روزنامۂ اندوہ انتظار

ہموارہ ذوق مستی و لہو سرور و شور
پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار

لیکن اس آزادی اور مطلق العنانی کے باوجود مرزا کی تعلیم سے بے پروائی نہیں برتی گئی۔ اور

آگرے میں جو قابل ترین استاد مل سکتے تھے۔ مرزا کی تعلیم ان کے زیر اثر ہوئی۔ انکے ایک استاد نظیر اکبر آبادی تھے۔ اور اگرچہ غالب اور نظیر میں طبعی تفاوت کی وجہ سے غالب پر نظیر کا اثر نہ پڑ سکا۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ غالب جیسا ذہین طالب علم آگرے کے مشہور ترین عالم مولوی محمد معظم سے کسب فیض نہ کر سکے۔ مرزا کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ علوم مروجہ سے انہیں کافی واقفیت تھی۔ منطق۔ فلسفہ اور علم ہیئت کی علمی اصطلاحیں ان کے بالکل ابتدائی کلام میں موجود ہیں۔ اسلامی نظام تعلیم کے ماتحت علمِ طب کی واقفیت ہر تعلیم یافتہ انسان کیلئے ضروری تھی۔ اور مرزا کی تصانیف اور دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طب کی مشہور کتابوں سے بخوبی واقف تھے۔ عربی صرف و نحو سے بھی وہ ناواقف نہیں تھے۔ اور بقول حالی جن ٹیڑھی ردیفوں میں انہوں نے غزلیں لکھی ہیں۔ ان میں غزل گوئی علم عروض کی واقفیت کے بغیر ناممکن تھی۔ لیکن ان علوم سے واقفیت سے زیادہ جو چیز مرزا کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ فارسی زبان اور ادب سے واقفیت اور اس زبان میں قدرتِ اظہار ہے۔ انہوں نے ۱۱ برس کی عمر میں ہی فارسی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس چھوٹی سی عمر میں ظہوری کا کلام اور دوسری فارسی کتابیں زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ فارسی سے دلچسپی مولوی محمدؒ معظم کی شاگردی کے زمانے ہی سے ہوگئی تھی۔ لیکن غالباً اس بارے میں ملا عبدالصمد ہرمز کے احسانات ان پر سب سے زیادہ ہیں۔ مرزا اور ہرمز کے تعلقات بہت واضح نہیں۔ ہرمز سنہ ۱۸۱۱ء کے قریب آگرے میں سیاحانہ آیا تھا۔ وہ دو سال تک مرزا کے ساتھ رہا۔ اور جب مرزا آگرہ چھوڑ کر دہلی آئے تو وہ بھی ہمرکاب تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ مرزا کا اتالیق مقرر ہو گیا ہوگا۔

مرزا ابھی تیرہ برس کے تھے کہ میر محمد کاظم بیقرار جو ولی عہد شاہ دہلی ظفر کے استاد تھے۔ ایک سفارت پر الفنسٹن صاحب کے ساتھ سندھ گئے اور انکی جگہ ذوق ولی عہد کے استاد مقرر ہوئے۔ اس وقت ولی عہد کے استاد کا مشاہرہ چار روپیہ ماہوار تھا۔ لیکن چونکہ ولی عہد کی تخت نشینی کے وقت اسکے استاد کا استاد شاہ ہو جانا قدرتی امر تھا۔ اس تقرر سے مرزا کا

راستہ بند ہوگیا ۔ جب ہم یہ دھیان میں رکھتے ہیں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں معلوم ہوتا۔ کہ ذوق کی زندگی میں غالب کا استاد شاہ نہ ہونا بہادر شاہ کی بدذوقی کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ اتفاقی حوادث کا نتیجہ تھا۔

لیکن غالب کیلئے اس سال کا اور بھی اہم واقعہ مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے شادی تھی۔ مرزا کی کئی تحریروں سے بالخصوص اس دردناک مرثیہ سے جو انہوں نے ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھا۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل نہیں کہ وہ شادی کو" دامِ سخت" ہی سمجھتے رہے۔ اور "اُڑنے" سے پہلے "گرفتار" ہو جانا انہیں بہت ناگوار تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کے لئے یہ شادی ہزار آسانیوں کا موجب ہوئی۔ اور ان کی زندگی کے اکثر واقعات سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ مرزا الٰہی بخش کے خاندانی حالات ذرا وضاحت سے بیان کر دئیے جائیں۔
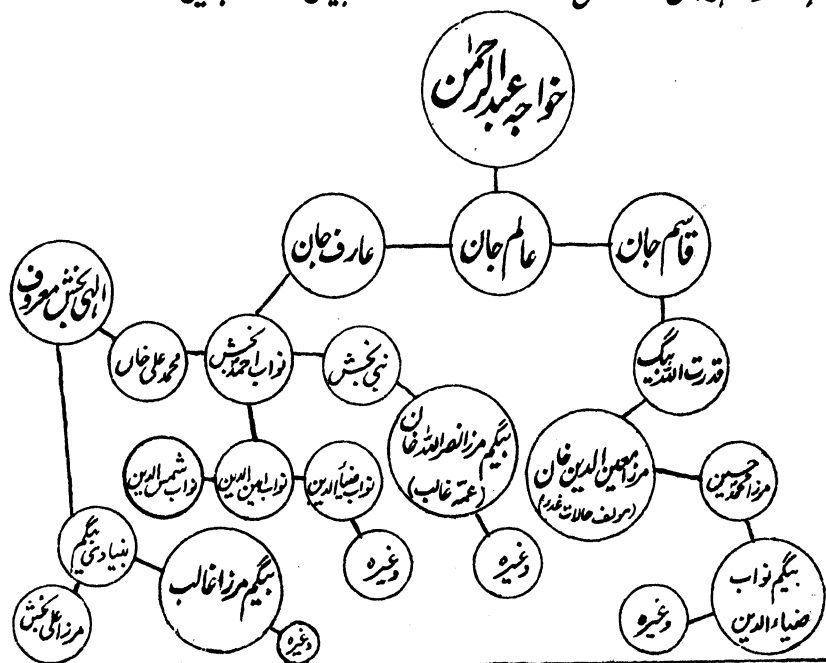
غالب کے خسر مرزا آلٰہی بخش معروف جن کے متعلق آزاد نے "آبِ حیات" میں کئی صفحے لکھے ہیں ذوق کے شاگرد تھے۔ اور نہایت پاکیزہ اور مؤثر شعر کہتے تھے۔ فخر الدولہ نواب احمد بخش جنہوں نے لارڈ لیک کی فتوحات میں نام پیدا کیا تھا۔ مرزا آلٰہی بخش کے بھائی تھے۔ نواب اور نواب کی اولاد سے غالب کے تعلقات کا ذکر بعد میں آئیگا۔ لیکن مندرجہ بالا شجرہ پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ امر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ مرزا کی شادی ایسے گھرانے میں ہوئی۔ جو نہ صرف جاہ و ثروت کے لحاظ سے ممتاز اور رو بہ ترقی تھا۔ بلکہ شعر و شاعری سے بھی گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔

غالب نے قیام آگرہ کے دوران میں جو اشعار لکھے وہ نسخۂ حمیدیہ میں محفوظ ہیں لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ کونسے آگرہ اور کونسے دہلی میں لکھے گئے۔ آسان نہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں اُردو شعرا کے دو تذکرے ہیں۔ "تذکرۂ سرور" اور "عیار الشعرا" جن میں غالب کو اکبر آباد کا ساکن بتایا ہے۔ لیکن ان قلمی نسخوں کی تاریخ کتابت موجود نہیں۔ اور چونکہ "تذکرۂ سرور" کے مصنف سے غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد تک ہوتی رہی۔ نا ممکن نہیں کہ اس میں کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لئے گئے ہوں۔ چنانچہ انڈیا آفس میں تذکرۂ سرور کا جو نسخہ ہے۔ اس میں کئی اشعار ایسے ہیں جو نسخہ بھوپال میں بھی نہیں اور کئی اشعار ایسے ہیں۔ جو اور کسی دیوان میں نہیں ملتے۔ مثلاً ؎

نیاز عشق خرمن سوز اسبابِ ہوس بہتر — جو ہو جاوے نثار برق مشت خار و خس بہتر
جگر سے ٹوٹی ہے سوئی ہوئی سناں پیدا — دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

"عیار الشعرا" میں جو خوب چند "ذکا" نے اپنے استاد شاہ نصیر کی فرمائش پر لکھی۔ غالب کے متعلق ذیل کا اندراج ہے ؎

"مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبداللہ خاں عرف مرزا دولہ نبیرۂ مرزا غلام حسین خاں کمیدان ساکن بلدۂ اکبر آباد شاگرد مولوی محمد معظم۔ شاعر فارسی ہندی"

اس تذکرہ میں دو شعر ایسے انتخاب ہوئے ہیں۔ جو اور کہیں ہماری نظر سے نہیں گزرے۔

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے   ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے
صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی!   کہ روئے غنچہ گل سوئے آشیاں پھر جائے

ان تذکروں کے قلمی نسخے ہندوستان کے چند کتبخانوں میں بھی ہیں۔ ان میں کوئی ایسا مل گیا جسپر تاریخ کتابت درج ہوئی تو مرزا کے چند نہایت ابتدائی اشعار کے متعلق کہا جاسکے گا۔ کہ وہ کس عمر سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ تاہم اب بھی اتنا یقینی ہے کہ مرزا نے آٹھ نو سال کی عمر میں اردو اور دس گیارہ برس کی عمر میں فارسی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور غالباً ان اشعار کا معتدبہ حصہ جنہیں مرزا نے دس پندرہ سال بعد دیوان ریختہ سے حذف کیا۔ آگرے میں ہی لکھا جا چکا تھا۔ ان تذکروں میں سے ایک میں مرزا کے حالات اسد اور دوسرے میں غالب کے تحت میں دیئے ہوئے ہیں۔ مرزا نے تمام فارسی غزلیات میں غالب تخلص استعمال کیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شعرگوئی شروع کرنے کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے اردو میں بھی غالب تخلص لکھنا شروع کر دیا۔ اور اس کے بعد بالعموم اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں یہی تخلص قایم رکھا اگرچہ شاعرانہ سہولت کی وجہ سے چند ایک بعد کی غزلوں میں اسد بھی استعمال کیا ہے۔

مرزا کا دہلی آنا جانا اس وقت سے شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ ان کی عمر ابھی پانچسال کی تھی۔ لیکن یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانہ میں وہ منتقلاً آگرہ چھوڑ کر دہلی گئے۔ البتہ ان کے چند خطوط سے خیال ہوتا ہے کہ وہ غالباً پندرہ سولہ برس کے ہونگے۔ جب انہوں نے آگرہ چھوڑ کر دہلی میں رہائش اختیار کی۔ لیکن چونکہ ننھیال آگرے میں تھا۔ وہاں بھی اکثر جاتے اور دیر تک مقیم رہتے اس زمانہ میں انکی والدہ زندہ تھیں۔ اور ننھیال خوش حال۔ ایسی حالت میں اُن کا آگرہ چھوڑنا ممکن ہے طلب علم کی خاطر ہو۔ جس کے لئے دہلی کی فضا آگرے سے زیادہ سازگار تھی۔ یا بیوی کے میکہ سے کسی ایسی خواہش کا اظہار کیا گیا ہو۔ اس زمانے کے متعلق انہوں نے ایک اردو خط میں لکھا ہے:۔

"روٹی کا خرچ پھوپھی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا کبھی
کچھ الور سے دلوادیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھجوادیا۔"

مرزا کی پھوپھی کے متعلق کسی تذکرہ نگار نے کچھ نہیں لکھا۔ لیکن اُن کی چچی جو اُن کی بیوی کی پھوپھی بھی تھیں۔ نواب احمدؔ بخش کی ہمشیر[1] تھیں۔ ممکن ہے انہیں کی طرف مؤدبانہ اشارہ ہو۔ اور قرین قیاس بھی یہی امر معلوم ہوتا ہے کہ آگرے سے آکر مرزا اپنی بیوی کے اقارب کے ہاں مقیم ہوئے ہونگے۔ اور "زندان دہلی" کی "حراست" بھی اسی مقدمہ کے سلسلہ میں ہوئی ہوگی۔ جس کا فیصلہ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو سنایا گیا تھا۔

مرزا کے اس زمانے کے حالات کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھے۔ اور نہ ان کے اس زمانے کے خطوط محفوظ ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی ادبی عظمت کی بنا اسی زمانے میں پڑی۔ ہم ان کے گردوپیش کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ آئندہ باب میں درج کرینگے۔

---

[1] ۔ مرزا نے فارسی خط وکتابت پر جو رسالہ لکھا۔ اس میں نواب احمدؔ بخش کو "عمّ عالی مقدار" لکھا ہے اس صورت میں نواب کی ہمشیر کو پھوپھی لکھنا کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی۔

مرزا کا دہلی میں آنا جانا اسی وقت سے شروع ہوا۔ جب شاہ عالم ثانی جنہیں غلام قادر روہیلا نے آنکھیں نکالکر اندھا کردیا تھا۔ تخت شاہی پر متمکن تھے۔ روہیلوں کی بغاوت کے بعد دہلی میں مرہٹوں کا اقتدار بڑھا۔ تو سندھیا نے انہیں قید خانے سے نکالکر قلعہ میں بادشاہی تخت پر بٹھادیا۔ اور اسکے بعد جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے سندھیا کو شکست دی اور دہلی میں انگریزی نظم ونسق قائم ہوا تو شاہ عالم ثانی کو بدستور تخت نشین رہنے دیا گیا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حالت پہلے سے بہتر ہوگئی۔ مسٹر آرچیبالڈ سٹین ریذیڈنٹ دہلی۔ بادشاہ کے جذبات کا ہر بات میں خیال رکھتے اور قلعہ اور شہر میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جاتی۔ بادشاہ کی جو خاصہ کی جاگیریں تھیں انکی آمدنی بڑھ گئی تھی۔ اسکے علاوہ اس زمانہ میں سکوں پر بادشاہ کا ہی نام ہوتا تھا۔ اور جاگیرداروں اور رئیسوں کی وراثت پر بادشاہ کی مہرِ توثیق کو ہی سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی۔ شاہ عالم کی وفات ۱۸۰۶ء میں ہوئی اور انکی بجائے شاہ اکبر ثانی جانشین ہوئے۔ انکے زمانہ میں مسٹر آرچیبالڈ سٹین کی پالیسی قائم نہ رکھی گئی۔ لیکن قلعہ میں پھر بھی کوئی مداخلت نہ ہوئی۔ اور شہر میں بھی شاہی جلوس اور سواری

کا اہتمام اسی شان سے جاری رہا۔ جو اس سے پہلے تھا۔ علاوہ ازیں اگرچہ بادشاہ کی ہستی شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ وہ اپنے موروثی حقوق پر اڑے رہتے۔ چنانچہ ۱۸۱۴ء میں جب گورنر جنرل کلکتہ سے دہلی آئے تو انکی ملاقات بادشاہ سے اسی وجہ سے نہ ہو سکی کہ بادشاہ نے انکو اپنے برابر کرسی دینا قبول نہ کیا۔

قلعہ سے قطع نظر اسوقت شہر دہلی کی حالت موجودہ زمانہ سے بہت مختلف تھی۔ شہر کے گرداگرد فصیل تھی۔ اور سارا شہر اس کے اندر آباد تھا۔ شہر کے دروازے شام کو بند ہوتے اور صبح کو کھول دیئے جاتے۔ جہاں شہر دہلی کا موجودہ سٹیشن ہے۔ وہاں اس زمانے میں مکانات تھے اور غدر سے پہلے ایک آباد محلہ تھا۔ جہاں امرا و اراکین سلطنت رہتے تھے۔ چاندنی چوک کے درمیان اس زمانے میں نہر بہتی تھی۔ جس کے دونوں طرف خوشنما سایہ دار درخت تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک دہلی میں مرہٹوں کا راج رہا۔ شہر اور شہر کا قرب و جوار لٹیروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ نہیں تھا۔ جہاں جان و مال خطرے میں ہو۔ وہاں قدرتی امر ہے کہ علم و فن عروج نہ پائے۔ چنانچہ دہلی میں جو کوئی شعر و سخن یا کسی اور فن میں نام پیدا کرتا۔ اُسے لکھنؤ کی کشش یہاں سے کھینچ لیجاتی۔ لیکن جب ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کا نظم و نسق قائم ہوا۔ تو نہ صرف شہر کی آبادی و خوشحالی بہت بڑھ گئی۔ بلکہ علم و فن کا جو شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ وہ پھر ایک دفعہ بندھ گیا۔ اور بقول حالی "دارالخلافہ دہلی میں چند ایسے اہل کمال جمع ہوگئے۔ جنکی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری اور شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتے تھے"۔ سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں اس زمانے کے اکابر علماء اور شعرا کے حالات لکھے ہیں۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسری ممتاز ہستیوں سے قطع نظر اس زمانے کے شعرا میں شاہ نصیر۔ ذوق۔ مومن۔ علماء میں شاہ عبدالعزیز۔ شاہ اسمٰعیل۔ شاہ عبدالقادر حضرت سید احمد بریلوی۔ مولینا فضل حق خیر آبادی۔ اطباء میں حکیم محمود خاں۔ حکیم احسن اللہ خاں حکیم رضا خاں اور نقادوں میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ موجود تھے۔ اور یہ وہی لوگ ہیں۔ جن کے زیر اثر سر سید حالی۔ نذیر احمد۔ آزاد۔ ذکاء اللہ۔ داغ کی تربیت ہوئی۔ جو اگرچہ خود پرانے نظام کے پروردہ تھے

لیکن بیس سال کے عرصہ میں شمالی ہندوستان کو ایک نیا نظام تعلیم نیا لٹریچر اور مذہب کی مدافعت کے لئے نئے ہتھیار دیئے گئے۔ تو ہمیں غالب کے اس ماحول کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ جس کا وہ خود ایک جزو تھا۔ اور جسکی ناواقفیت کی وجہ سے عوام کے نزدیک غالب کی شخصیت ایک معمہ بنکر رہ گئی ہے

حالی اُس زمانے میں دہلی آئے۔ جب یہاں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی باغ میں پھول اور پھولوں کے گرد بلبلیں موجود تھیں۔ چنانچہ انہوں نے حکیم محمود خاں کا جو مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں اس زمانے کی نہایت موثر تصویر کھینچی ہے۔ ؎

اے جہان آباد اے اسلام کے دار العلوم ۔۔۔ اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنر ور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم ۔۔۔ تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاق علم ودیں ۔۔۔ جیسے امی تجھ میں تھے، عالم نہ تھے ایسے کہیں
ہند میں تھا جو محدث تھا وہ تیرا خوشہ چیں ۔۔۔ تھی محدث خیز اسے پاتخت تیری سرزمیں
تھا تفقہ بھی مسلم تیری خاکِ پاک کا
بیہقیٔ وقت تھا ایک ایک فقیہ اس خاک کا

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم ۔۔۔ آن کر اس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغِ ارم ۔۔۔ بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم
ہند میں جاری تجھی سے طبِ یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

لیکے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم ۔۔۔ جن میں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم
دولت واقبال کا جب تک رہا تجھ پہ ہجوم ۔۔۔ کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے ان کے جھوم جھوم
آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصلِ خزاں
تیری سرحد میں رہا ہے علم و دانش کا سماں

دورِ آخر میں کہ تیرا تیسل تھا سب جل چکا | بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تونے سنبھالا سا لیا
خاک نے یاں پھر تری اُگلے وہ لعلِ بے بہا | جنسے روشن ہو گیا، کچھ دن کو نام اسلاف کا

عہدِ ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی | پر نہ کی عرضِ ہنر میں تونے اب بھی کوتہی
اس بزرگی سے گذاری تیرھویں تونے صدی | پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دورِ اکبری

علم دین و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم
ڈال دی پھر تونے اپنی چارسو ہر فن میں دھوم

جن جن لوگوں نے انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ ریفارمیشن (REFORMATION یعنی اصلاح مذہب) اور رینائیسنس (RENAISANCE یعنی حیات ثانی) کی دو تحریکوں سے واقف ہونگے۔ جنہوں نے سولہویں صدی میں وہاں نئی روح پھونک دی تھی - اور علمی اور مذہبی نقطۂ نظر سے ایک نئے دور کا آغاز کیا تھا۔ مرزا جسوقت دہلی آئے یہاں بھی وہی حالات رُو نما تھے - جنہوں نے دو صدیاں پہلے یورپ کی کایا پلٹ دی تھی۔ انگلستان میں چھاپہ خانہ کی ابتدا سولہویں صدی میں ہوئی۔ اور اس کے قائم ہونے کے بعد ہی علم صحیح معنوں میں عام ہونا شروع ہوا۔ دہلی میں چھاپہ کے آغاز کا قریب قریب یہی زمانہ تھا۔ اور یہاں بھی اس سے اشاعت علم کو وہی فائدہ پہنچ رہا تھا۔ جو انگلستان میں ہوا۔ "رینائیسنس" کا ایک اہم واقعہ بائبل کا انگریزی ترجمہ ہے۔ جس کی ابتدا میں بیحد مخالفت ہوئی۔ اور جس کی وجہ سے وکلف اور اسکے ساتھیوں کو سخت ایذائیں پہنچائی گئیں۔ ہندوستان میں بھی قران مجید کا پہلا فارسی ترجمہ کرنے پر شاہ ولی اللہ کو ننگی تلواروں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان کی جرأت اور قابلیت سے ۱۷۳۷ء میں ہی ہندوستان میں وہ مرحلہ طے ہو گیا۔ جس کیلئے ترکی کو دو صدیاں اور انتظار کرنا پڑا۔ لیکن جس طرح مغربی "رینائیسنس" کی ایک اہم خصوصیت عام ملکی زبانوں کی ابتدا تھی۔ ہندوستان میں بھی فارسی اور عربی کی جگہ اردو

لے رہی تھی۔ اور چونکہ علما زمانے کی رفتار پہچانتے تھے۔ اردو نثر کی سب سے پہلی کتابوں میں قرآن مجید کا اُردو ترجمہ تھا۔ جسے شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے ۱۸۰۳ء میں دہلی سے شایع کیا۔

علاوہ ازیں جسطرح مغربی "رینا ئیسنس" کی ایک اور قابل ذکر بات درس و تدریس کا بلند معیار تھا۔ دہلی بھی اس زمانے میں اپنے معلموں اور مدرسوں کی وجہ سے شہرۂ آفاق تھی۔ بالخصوص شاہ عبدالعزیزؒ کی ذات والاصفات کی موجودگی سے جو اپنی سلامت روی۔ صحیح قوت فیصلہ اور علمی قابلیت کی وجہ سے مغربی "رینا ئیسنس" کی ایک قابل احترام ہستی ایرازمس (ERASMUS) سے بہت مشابہ ہیں۔ اور جن کے درس کیلئے کشمیر۔ افغانستان اور بلخ بخارا سے طلبا کھنچے آتے تھے۔ ان کے علمی تبحر اور انصاف پسندی کے آگے سب سر جھکاتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ نہ صرف وہ علم و فضل میں بے نظیر تھے۔ بلکہ زمانے کی نبض بھی خوب پہچانتے تھے۔ چنانچہ جب سرکارِ انگریزی نے دہلی کالج قائم کیا۔ اور لوگ وہاں اولاد بھیجنے کے متعلق متامل تھے۔ تو شاہ صاحب نے بڑے زور سے وہاں تعلیم حاصل کرنے کی حمایت کی اور علیگڑھ کالج قائم ہونے سے کوئی پچاس سال پہلے مغربی اور سرکاری درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے حق میں فتویٰ دیا۔

جنرل سیلمن جو ٹھگی کے انسداد کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور جنہیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا اتفاق عام یورپین افسروں سے زیادہ ہوتا رہا اس زمانے کی تعلیمی حالت کے متعلق لکھتے ہیں۔ " دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہونگی۔ جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جسقدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ ان میں جو کوئی بیس روپیہ ماہوار کا مقتدی ہوتا ہے وہ اپنے لڑکوں کو اسی طرح تعلیم دیتا ہے جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو۔ اور جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں۔ وہی یہ لوگ عربی اور فارسی زبانوں میں سیکھتے ہیں۔ اور سات سال کے درس کے بعد ایک طالب علم اپنے سر پر جو آکسفورڈ کے پاس شدہ طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتا ہے۔ دستارِ فضیلت باندھتا ہے اور اسی طرح روانی سے سقراط۔ ارسطو۔ افلاطون، بقراط۔ جالینوس اور بو علی سینا کی نسبت گفتگو کر سکتا ہے۔ جس طرح آکسفورڈ کا پاس شدہ طالب علم"

جنرل سلیمن نے ایک اور جگہ لکھا ہے۔ "ایک تعلیم یافتہ مسلمان فلسفہ ادبیات اور دوسرے علوم وفنون پر قابلیت سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اور بالعموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور موجودہ زمانے میں ان میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، انہیں سمجھنے کا بہت خواہشمند ہوتا ہے۔"

ان سطور سے یہ تو واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کا نظام تعلیم اُس زمانے کے انگریزی نظام تعلیم سے یا اکسفورڈ کے موجودہ کلاسیکل کورس کے مقبول عام نصاب سے کسی طرح پست نہیں تھا۔ اور اس کے علاوہ اگر درخت فقط اپنے پھل سے پہچانا جا سکتا ہے تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں جن معلّموں کے حلقہ درس سے سر سیّد، حالی، آزاد، داغ، شیفتہ (اور غالب!) دستارِ فضیلت باندھ کر نکلیں۔ وہ اپنے درس و تدریس پر جتنا بھی فخر کریں، کم ہے۔

اس عام علمی اور ادبی چہل پہل کے علاوہ ایک تحریک جس سے اس وقت دہلی کے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ سید احمدؒ بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی تحریک اصلاح تھی۔ جسے سر سید احمدؒ نے لوتھر کی تحریک "ریفارمیشن" کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اور حضرت بریلوی کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر کے اعتراضات کا جواب دیتے لکھا ہے کہ جس طرح لوتھر نے یورپ کے بڑے حصے کو پوپ کی غلامی سے نجات دلائی۔ اسی طرح یہ تحریک بھی تقلید کی مخالفت میں تھی۔ اور سید احمد بریلوی نے ان فضول اور مضر رسموں کے خلاف جو ابتدائے زمانہ سے ہندوستانی معاشرتی زندگی کا جزو ہو گئی تھیں، کوشش کر کے نہ صرف مذہبی بلکہ معاشرتی نقطہ نظر سے بھی شمالی ہندوستان پر بڑا احسان کیا۔ ہمیں اس تحریک کے متعلق مفصل بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن غالب کا ما[illegible] سمجھنے کیلئے اس کا تذکرہ ضروری ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب دہلی میں تمام اہل الرائے یا اس تحریک کے طرفدار تھے یا مخالف۔ شاہ نصیر دہلوی نے جن کی خوش اعتقادی کی آزاد نے "آبِ حیات" میں کئی مضحکہ خیز مثالیں دی ہیں اس تحریک کے خلاف نظمیں لکھیں۔ برخلاف اسکے مشہور شاعر مومنؔ مولینا سید احمدؒ بریلوی کے مرید تھے۔ اور دیوانِ مومن کا آغاز مولینا کی تعریف سے ہوتا ہے۔ غیر مقلدین میں سب سے زیادہ رسائل شاہ اسمٰعیل اور سر سید احمد خاں نے لکھے۔ اور مقلدین کی ترجمانی مولوی فضل حق نے کی۔ جو قدیم علم پرور خیرآبادی خاندان

کے رکن تھے۔ اور غالب کے نہایت عزیز دوست۔ مرزا نے بھی ان مباحثوں میں عملی حصہ لیا۔ اور عقائد وہابیہ کے خلاف ایک فارسی مثنوی لکھی۔ لیکن جیسا کہ حالی نے یادگار غالب میں واضح کیا ہے ان کا اپنا نقطہ نظر شاہ اسمٰعیل سے بہت ملتا تھا۔ اس مثنوی کے مطالب بہت اہم نہیں ہیں اور اس سے بھی کہیں زیادہ اہم وہ ذہنی تطابق ہے۔ جو شاہ اسماعیل اور مرزا کے عام نقطہ نظر میں تھا۔ شاہ صاحب کے مذہبی عقائد کیا ہوں لیکن آنجہان کی تصانیف کا اہم ترین پہلو تقلید کے خلاف جہاد تھا۔ بیشک وہ قرآن شریف اور مستند احادیث کے قائل تھے۔ لیکن عوام جس کو اسلام سمجھتے تھے۔ وہ یا تو رسوم وعقائد کا وہ طومار تھا۔ جو مقامی اثرات سے اسلام کا جزو بن گیا تھا۔ یا ائمہ اربعہ کی کورانہ تقلید۔ شاہ اسمٰعیل اس میں کسی کے بھی قائل نہ تھے۔ اور جب ہم شاہ صاحب کی تصانیف پڑھتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ جس آزادی اور جرأت سے وہ رائے عامہ اور مسلمہ ہستیوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ اور جس بیباکی سے صدیوں کے معبود بُت گرا رہے تھے۔ نا ممکن ہے کہ اس کا اثر غالب پہ نہ ہوا ہو۔ اور اس کی طبعی آزاد خیالی اور راسخ ہو گئی ہو۔ شاہ صاحب اور مرزا کے خیالات کی راہیں مختلف تھیں۔ لیکن جس طرح انہوں نے شاہ صاحب کو مذہب یا رسوم ومعاشرت میں تقلید کی مخالفت کرتے دیکھا۔ اسی طرح خود فن لغت اور فن شعر گوئی میں استادوں پر آزادانہ نکتہ چینی کی۔ اور جسطرح شاہ صاحب بڑے بڑے بزرگوں کے نام گنا کر کہتے تھے۔ کہ آخر وہ انسان تھے۔ اور غلطی کر سکتے تھے۔ اسی انداز سے غالب نے بھی کہا کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے وہ سب سچ نہیں۔ اور ہر پرانی لکیر صراط مستقیم نہیں ہوتی۔

ان دونوں تحریکوں کا مرزا پر جو اثر ہوا ہوگا۔ وہ تو بیشتر ذہنی ہے۔ لیکن دہلی آنے سے جو اثر ان کی شاعری پر ہوا۔ وہ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ آگرے میں شعرا اور شعر فہم حضرات کی وہ کثرت نہ تھی۔ جو دہلی میں تھی۔ اور غالب کے عجیب وغریب اشعار پر جب یہ لوگ معترض ہوتے۔ تو وہ انہیں خاطر میں نہ لاتے۔ چنانچہ انہوں نے آگرہ میں ایک رباعی لکھی تھی:۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن جب مرزا دہلی آئے۔ اور مولینا فضل حق اور دوسرے مسلمہ استادوں نے انہیں ان اشعار کے حسن وقبح سے آگاہ کیا۔ تو مرزا کو ان کے علم وفضل کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اور حسبطرح مندرجہ بالا رباعی کا دوسرا مصرعہ تبدیل کیا۔ اور اپنے معترضوں کو بجائے "جاہل" کے "سخنورانِ کامل" کہا۔ اسی طرح اپنی شاعری کا رخ بدلا۔ دیوان ریختہ کا انتخاب انہی کے مشورے سے ہوا اور اگرچہ انتخاب کرتے وقت بعض بلند پایہ اشعار رہ گئے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ انتخاب ذوقِ سلیم کا ثبوت ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر دیوان غالب تمام کا تمام شایع ہو جاتا۔ تو خدشہ تھا۔ کہ جہاں اتنے سیپ اور کوڑیاں تھیں۔ وہاں سُچے موتی بھی نظر سے پنہاں ہو جاتے۔

مرزا کے اس زمانے کے احباب کی نسبت ہمیں پوری واقفیت نہیں۔ لیکن چونکہ ان کی شادی نواب مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ جو شعر کے بڑے دلدادہ تھے۔ تھے۔ اور جن کے اکثر شعراء سے مربیانہ تعلقات تھے۔ یقین ہے کہ مرزا بھی دہلی کے سب بڑے بڑے شعرا کی صحبت سے فیضیاب ہوئے ہونگے۔ معروف ذوق کے شاگرد تھے۔ اور وہ زبان میں صفائی اور روزمرہ کے بڑے مداح تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں مرزا کی شاعری بہت پسند نہ ہوگی لیکن یہ بھی قرین قیاس ہے کہ ان کی صحبت کے زیر اثر زبان کی صفائی کی طرف مرزا زیادہ متوجہ ہوئے ہونگے۔ معروف خود بھی شاعر تھے۔ نئی نئی زمین نکالتے۔ اور ان میں شعر کہتے اور کہلواتے چنانچہ مرزا کی وہ غزل جس میں ذیل کا شعر مشہور ہے۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا۔ نہ دے۔ شراب تو دے

انہی کی نکالی ہوئی زمین میں ہے۔ اور اس میں غالب کے علاوہ دہلی کے اور مشہور شعرائنے بھی طبع ازمائی کی۔

ہرمز کی نسبت ہم لکھ چکے ہیں کہ مرزا دہلی آئے تو وہ ہمرکاب تھا۔ اسکی صحبت سے مرزا کو فارسی زبان میں وہ ملکہ حاصل ہوگیا۔ جو عموماً اہل زباں کا حصہ ہوتا ہے۔ اور جس طرح عام ایرانی ہندوستانیوں

کی فارسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مرزا بھی شروع سے ہی ہندی زبانانِ فارسی نویس" کو تمسخر کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کے علاوہ ہرمز کی وجہ سے پارسیوں کے عقائد سے بھی مرزا کی واقفیت بڑھ گئی۔ اور مذہب کے متعلق عام طور پہ ایک آزاد خیالی پیدا ہو گئی۔ ہرمز کے عقائد کے متعلق ہمیں پوری خبر نہیں۔ لیکن عجب نہیں کہ وہ شیعہ ہو۔ اور مرزا کا اپنے خاندان کے طریقہ کو چھوڑ کر شیعہ ہونا اسی کے زیر اثر ہو۔

دہلی آنے کے بعد غالب کی شاعری میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اس کی ایک اہم وجہ ہندوستان کے فارسی شعرا کا غائر مطالعہ اور ان کی تقلید ہے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ مرزا کی شاعری کا صحیح اندازہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب بجائے میرؔ اور سوداؔ کے انہیں بیدلؔ اور عرفیؔ کا جانشین سمجھا جائے۔ بیشک انہوں نے اردو شعر لکھے۔ لیکن انہوں نے کسی اردو شاعر کی پیروی نہیں کی۔ بلکہ اردو میں بھی پہلے بیدلؔ اور بعد میں عرفیؔ نظیریؔ کی طرز میں اشعار لکھے۔ وہ میرؔ کے مداح تھے۔ لیکن میرؔ کی غزلوں پر بھی جو غزلیں انہوں نے کہی ہیں۔ وہ میرؔ نہیں بلکہ بیدلؔ کے رنگ میں ہیں۔ اور اگرچہ ان کے اس زمانے کے اشعار کی زبان اردو ہے۔ لیکن مضمون اور زبان کی تمام خصوصیات فارسی شاعری کی ہیں۔ مرزا اپنے اردو اور فارسی کلام میں وہ حدِ فاصل نہیں رکھتے تھے۔ جو اس زمانے میں عوام کی فارسی سے ناواقفیت سے ہو گئی ہے۔ وہ گلِ رعنا کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اردو اشعار کے لکھنے میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا۔ جو فارسی اشعار کے لکھنے میں۔ ان کی شاعری بقول انکے ایک باغ کی طرح ہے۔ جس کے دو دروازے ہیں ایک اردو اور ایک فارسی۔ اور مرزا کے مقابلہ میں باقی اردو شعرا کے کلام کی پستی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ان شعرا کی نظر دلی سے پیچھے نہیں جاتی تھی۔ اور ان کے کلام میں مضامین کی وہ شادابی اور تنوع نہیں۔ جو مرزا کے کلام میں ہے۔ جن کی روایات کا سلسلہ حزیںؔ۔ بیدلؔ ظہوریؔ۔ عرفیؔ۔ نظیریؔ کے واسطے سے امیر خسروؔ تک پہنچتا ہے۔ مرزا نے آغاز بیدلؔ کے رنگ میں کیا۔ لیکن جب انہوں نے فارسی شاعری کا زیادہ مطالعہ کیا۔ اور "شیخ علی حزیں نے مسکرا کر

ان کی بیرا۔۔ روی انہیں جتائی۔ اور طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ تھا۔ فنا کر دیا۔ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا سکھایا۔" تو ان کے کلام میں ان شعرا کی خصوصیات زیادہ آگئیں۔ اور وہ تشبیہوں کی غرابت اور پیچیدہ تراکیب کے اس سراب سے بچ نکلے۔ جہیں بیدل کی شعریت فنا ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کے دوسرے حصہ میں دکھائینگے۔ مرزا کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت انسانی فطرت کی واقفیت ہے۔ جو اردو کے اور شعر میں نہیں۔ لیکن آخر مرزا کا نفسیاتی تعمق اکبری شعرا کی وہی معاملہ بندی ہے۔ جو عرفی اور دوسرے شعراء میں تو محبت کے چند پہلوؤں تک محدود تھی۔ لیکن جسے مرزا نے وسعت دیکر تمام انسانی فطرت کا مطالعہ بنا دیا ہے۔ مرزا کو دہلی آنے سے پہلے ہی فارسی شاعری سے لگاؤ تھا۔ لیکن فارسی کا کلام پڑھنے اور سمجھنے کا زیادہ موقعہ انہیں یہاں آنے کے بعد ہی ملا ہوگا۔ اور ہمارے خیال میں ان کی شاعری پر خارجی اثرات میں سب سے اہم فارسی شعرا کا مطالعہ اور ان کی پیروی ہے۔

اسکے علاوہ مرزا کی شاعری میں جو انقلاب آیا۔ وہ بڑی حد تک اس انقلاب کا عکس تھا۔ جو مرزا کی ذہنی گہرائیوں میں وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں مرزا کی طبعی انفرادیت بہت کم ہوگئی تھی۔ عنفوانِ شباب میں انسان اپنے تئیں دنیا کا مرکز سمجھتا ہے۔ اور یہ خیال کرتا ہے۔ کہ میری رائے اور پسند کے آگے سب کو سر جھکانا پڑے گا۔ مرزا کی طبیعت میں یہ رجحان جیسا کہ ان کے خاص طرزِ شاعری (یا انکے بھائی کی علالت سے بھی) خیال ہو سکتا ہے۔ عوام سے بہت زیادہ تھا۔ اور اس انتہائی انفرادیت کے بقول ایڈلر دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں کہ یا تو انسان قناعت اور خودداری کو حد سے بڑھا کر اور اپنے سوا باقی سب کو جاہل اور ہوش سے عاری سمجھکر سوسائٹی سے اس طرح بیگانہ ہو جائے۔ کہ سوسائٹی کے نزدیک وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور یا دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھتے ہوئے اپنی انفرادیت کو ان حدود میں رکھے۔ کہ اپنا امتیازی رنگ بھی قائم رہے اور دوسروں کے نزدیک سڑی پن بھی نہ ہو۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی

تھی۔ کہ مرزا کی طبعی رجحانات پر ان کی عقل غالب آئی۔ اور انہیں خوش قسمتی سے ایسے دوست میسر آئے۔ جن کی صحبت نے ان کی بے قاعدگیاں ہموار کردیں۔ شخصی انفرادیت مٹانے اور مناسب حسنِ تناسب سکھانے کے لئے سوسائٹی کا سب سے بڑا حربہ ظرافت ہے۔ جیسے کنجِ تنہائی سے بزمِ احباب زیادہ راس آتی ہے۔ اور جوں جوں مرزا کا حلقۂ احباب وسیع ہوتا گیا۔ اور ساتھ ساتھ مشاہدے اور تجربے سے طبیعت کی زودحسی کم ہوئی۔ تو اُن کی انفرادیت بھی خوشگوار حدود میں آگئی۔ اور عجیب و غریب خیالات اور طبیعت کی یبوست کی جگہ خوشگوار خیالات اور ظرافت نے لے لی۔

دیوان غالب کا بھوپالی نسخہ اس وقت مرتب ہوا۔ جب غالب آلامِ دنیا سے بالکل آزاد تھے۔ اور جس رنگین زمانہ کی یاد سے ان کا ابتدائی کلام معمور ہے۔ غالب اس وقت نواب احمد بخش کے ساتھ رہتے تھے۔ نواب احمد بخش نے مرہٹوں کے خلاف لارڈ لیک کے معرکوں میں نام پیدا کیا تھا۔ اور ۱۸۰۵ء میں لارڈ موصوف نے ان خدمات کے عوض میں انہیں فیروز پور جھرکا کا علاقہ جواب ضلع گڑگاؤں کا حصہ ہے۔ تفویض کیا تھا۔ نواب نے مہاراجگان الور اور سرکار انگریزی کے درمیان تعلقات قائم کرنے میں بھی بہت حصہ لیا۔ اور مہاراجہ الور نے ان خدمات کے صلہ میں پرگنہ لوہارو انہیں بخش دیا تھا۔ نواب کی جائداد کافی تھی۔ اور جسطرح بڑے گھروں میں بہت سے متعلقین آسانی سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ نواب کے برادر زادہ مرزا علی بخش اور غالب نواب کے ساتھ بہت عرصہ مقیم رہے۔ اس سلسلہ میں غالب نے بہت سا وقت فیروز پور جھرکہ میں گزارا۔ اور جب انگریزی فوج نے ۱۸۲۵ء میں مہاراجہ بھرتپور کے خلاف چڑھائی کی۔ تو غالب اور مرزا علی بخش بھی نواب کے ہمرکاب تھے۔ غالب کی سب سے پہلی نثر کی تصنیف اسی زمانے

کی یادگار ہے۔

مرزا علی بخش نے جو غالب کی بیوی کے بھائی بھی تھے۔ غالب سے استدعا کی۔ کہ فارسی خط وکتابت کے قواعد اور القاب خیریت وغیرہ کے موزوں فقرے ایک جگہ جمع کر دیں۔ چنانچہ مرزا نے ایک مختصر رسالہ میں جواب "کلیات فارسی" میں موجود ہے۔ فارسی مکتوب نویسی کے قواعد جمع کئے ہیں۔ یہ رسالہ صاف اور سلیس زبان میں لکھا ہوا ہے۔ اور اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خط وکتابت کا جو نفیس اسلوب انہوں نے تیس برس بعد اردو زبان میں اختیار کیا (اور جس سے انکے فارسی خطوط بیشتر عاری ہیں) اسوقت بھی انہیں پسند خاطر تھا۔ وہ اس رسالہ میں لکھتے ہیں:-

"مکتوب الیہ را بلفظیکہ فراخور حال اوست آواز دہم وزمزمہ سنج مدعا گردم القاب وآداب گوئی وخیریت گوئی وعافیت جوئی حشو زائداست۔ وپختگان حشو را دفع نہند نامہ نگار را باید۔ کہ نگارش را از گذارش دور تر نبرده بنشتن را رنگ گفتن دہد" فارسی زبان میں انہوں نے بہت حد تک رواج عام کی پیروی کی ہے۔ لیکن اردو رقعات میں مندرجہ بالا اصولوں پر پوری طرح عمل کیا ہے۔ اور بقول اپنے "مراسلہ کو مکالمہ بنادیا۔ دُور سے بیٹھے بزبان قلم باتیں کیا کیجئے۔"

اس رسالہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ ہندوستانی فارسی نویسوں کی زباندانی سے جو نفرت انہیں تمام عمر رہی۔ اور جس نے بعض اوقات تلخ بحث کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس وقت بھی موجود تھی۔ اور غالباً ہرمز کی صحبت کا اثر تھی۔ وہ فارسی لکھنے والے کو ہدایت کرتے ہیں" اندازہ خوبیٔ زبان نگاہدارد دریں پارسی آمیختہ بتازی ،رادرکشاکش تصرفات ہندی زبانان پارسی نویس ضایع نگزارد"

بھرتپور کا معرکہ ۱۸۲۵ء میں ہوا۔ لیکن اگرچہ اس تصنیف سے غالب کی جائداد کے جھگڑوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ غالباً ان کی ابتدا اسی زمانہ میں ہوئی۔ نواب احمد بخش کے تین صاحبزادے تھے۔ نواب امین الدین۔ جن کے نام غالب نے اپنا دیوان فارسی معنون کیا ہے۔ نواب ضیاء الدین نیر ورخشاں جو غالب کے شاگرد اور عزیز دوست تھے۔ اور ان دونوں کے سوتیلے بھائی اور مشہور شاعر داغ کے والد نواب شمس الدین۔ نواب احمد بخش نے ۱۸۲۲ء میں سرکار انگریزی اور مہاراجہ الور

کی اجازت سے نواب شمس الدین ہی کو تمام جائیداد کا وارث قرار دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس فیصلہ پر سب بھائی متفق نہ تھے۔ اور اس میں بعد کو کچھ ترمیم بھی ہوئی۔ چنانچہ فروری ۱۸۲۵ء میں اپنے والد کے مشورہ پر نواب شمس الدین نے پرگنہ لوہارو ایک اقرار نامے سے اپنے دو بھائیوں کے نام منتقل کر دیا۔ اور بالآخر اکتوبر ۱۸۲۶ء میں جائیداد کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا۔

چونکہ مرزا کی جاگیر بھی نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے کہ مرزا کو بھی اپنی حق تلفی کا خیال اسی زمانہ میں ہوا ہوگا۔ جب نواب احمد بخش کی جاگیر کے متعلق آخری فیصلہ ہوا ان کو جاگیر اپنے چچا مرزا نصر اللہ خاں بہادر کے وارث ہونیکی وجہ سے ملی تھی۔ جو پہلے مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ اور جب لارڈ لیک کی عملداری ہوئی۔ تو چار سو سواروں کے رسالدار مقرر ہوئے۔

انہیں اسی کے صلہ میں علاوہ ذاتی زر معاوضہ کے معقول جائداد حین حیات ملی تھی۔ لیکن ایک سال کے بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی وفات پر ان کے وارثوں اور متعلقین کے لئے سرکار نے فیروز پور جھرکا کی ریاست سے پنشنیں مقرر کرادیں۔ جو نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل تھی۔ مرزا کا دعویٰ تھا۔ کہ انکے اپنے اور شرکائے حقیقی کیلئے دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے تھے۔ لیکن نواب فقط تین ہزار دیتے تھے۔ جن میں خاص مرزا کا اپنا حصہ فقط ساڑھے سات سو روپیہ کا تھا۔ شروع شروع میں تو ان کے نواب سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اور نواب ان کی مدد اور خبرگیری کرتے رہے۔ لیکن ۱۸۲۶ء کے قریب اختلافات کا آغاز ہوا۔ مرزا کے خسر نواب الٰہی بخش معروف جو نواب کے بھائی تھے۔ اسی سال فوت ہوگئے۔ اور ممکن ہے ان کی وفات کے بعد نواب سے مرزا کا اثر کم ہوگیا ہو۔ مرزا کی عمر اس وقت تیس اُنتیس سال کی تھی۔ اور تمام عمر عیش و عشرت کا عادی رہنے کے بعد اب عیش و مسرت کا سرچشمہ خشک ہوتا نظر آتا تھا۔ دوسرے جن لوگوں نے ابتدائی توقعات کی بنا پر قرضے دیئے تھے۔ وہ اب مختصر پنشن دیکھ کر تقاضے کر رہے تھے۔ اور سب سے بڑا صدمہ اس موقعہ پر یہ ہوا کہ ان کا چھوٹا بھائی مرزا یوسف دیوانہ ہوگیا۔

غالب کی حساس طبیعت کے لئے ذریعۂ معاش کی تنگی۔ بھائی کی بیماری۔ قرضخواہوں کے تقاضے اور دوسری مصیبتیں ناقابلِ برداشت تھیں۔ دوستوں نے مشورہ دیا۔ کہ نواب کی خدمت میں جاکر دردِ دل کہو۔ ممکن ہے وہ مدد کرے۔ چنانچہ مرزا دہلی سے فیروز جھرکا گئے۔ نواب ان دنوں الور تھا۔ اور مرزا کو فیروز پور جھرکا رکنا پڑا۔ یہاں سے انہوں نے جو خطوط اپنے شاگرد منشی جواہر سنگھ کے والد رائے چھجمل کھتری کے نام لکھے ہیں۔ ان سے ان کی مصیبتوں کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔
"چہ نالہ ہا کہ از بیم رسوائی از دل تا بہ زباں نرسیدہ خون میگردد و چہ خونہا کہ از دودِ بیکسی کسوت اشک پوشیدہ از چشم بیروں میرود۔ چارۂ رنج بیدلی معدوم و پایان کار نا معلوم است۔ پیداست کہ از قفس بدام افتادہ را چہ حال خواہد بود۔" اس کے بعد نواب کے انتظار میں جو بیقراریاں ہوئی ہیں۔ ان کا ذکر کرکے لکھا ہے۔" ہرچند در وطن نیم اما قرب وطن نیز قیامت است۔ ہنوز با اہل کاشانہ راہ نامہ و پیام است، ہرچہ دیدہ میشد آشوب چشم بود ہرچہ شنیدہ میشود زحمت گوش است۔ نیم جانے کہ از ان ورطہ بدر آوردہ ام ودیعت خاک فیروز پور است۔ کہ مرا ایں اقامت اضطراری اتفاق افتاد۔" آخر جب خدا خدا کرکے نواب الور کے قضیہ سے فارغ ہوا۔ اور فیروز پور واپس آیا تو معلوم ہوا کہ دوستوں کے مشورہ سے امیدوں کے جو قلعے بنائے ہوئے تھے۔ ان کی بنیاد ریت پر ہے۔ اور نواب سے کسی طرح کی توقع رکھنا عبث ہے۔ چنانچہ بقولِ غالب" نواب صاحب مرا بہ لطف زبانی فریفتند و بکرشمۂ ستمے کہ بالتفات میمانست از راہ بردند"۔ چنانچہ مرزا کو دہلی ناکام واپس لوٹنا پڑا۔

مرزا کو جب نواب کی طرف سے قطعی مایوسی ہوئی۔ تو انہوں نے نواب کی تقسیم کے خلاف کلکتہ میں اپیل کرنیکا ارادہ کیا۔ بقول حالی ریذیڈنٹ دہلی نے انہیں کامیابی کی اُمید بھی دلائی چنانچہ وہ تیس برس کے ہونگے۔ جب وہ اس دُور دراز سفر کے لئے گھر سے روانہ ہوئے۔

مرزا دہلی سے کب روانہ ہوئے۔ اس کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں۔ لیکن دہلی سے وہ لکھنؤ گئے اور وہاں سے ان کی تاریخِ روانگی ۲۷ جون ۱۸۲۶ء یا ۲۶ ذیقعد ۱۲۴۲ھ ہے۔ لکھنؤ میں غالب

نے بہت دیر قیام کیا۔ اور اگر اس فارسی نثر کی تاریخ تحریر کو جو انہوں نے وزیر اودھ کی تعریف میں لکھی تھی۔ درست مان لیا جائے۔ تو یہ ماننا پڑے گا۔ کہ کم از کم "دوم محرم الحرام" سے "۲۶ ذیقعد" تک یعنی قریباً ۱۱ مہینے وہ لکھنؤ مقیم رہے۔

مرزا جب لکھنؤ پونچے تو وہاں غازی الدین حیدر بادشاہ تھے۔ اپنے والد نواب سعادت علیخاں کی وفات کے پانچ سال بعد تک وہ نواب وزیر ہی کہلاتے رہے۔ لیکن جب ۱۸۱۸ء میں لارڈ ہیسٹنگز نے نظام حیدرآباد اور نواب وزیر اودھ کو بادشاہ کا خطاب اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ (اور مشہور ہے کہ نظام نے مغلیہ بادشاہ کے احترام کے خیال سے نہ مانا) تو غازی الدین حیدر نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ اور سال ۱۸۱۹ء میں بڑی دھوم دھام سے ان کی تخت نشینی کی تقریب ہوئی۔ جس کی ناسخ نے تاریخ کہی ؏ "بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید"۔ انہیں شعر سے تھوڑی بہت دلچسپی ضرور تھی۔ چنانچہ مشہور ہے کہ انہوں نے ناسخ کو ملک الشعرا کا خطاب دیکر اپنے دربار سے متعلق کرنا چاہا! لیکن ناسخ نے یہ کہکر کہ غازی الدین کو نہ تو شاہانِ دہلی کا مرتبہ حاصل ہے۔ اور نہ سرکار انگریزی کا زور و اقتدار۔ خطاب واپس کر دیا۔

جب مرزا لکھنؤ پہنچے۔ تو بادشاہ کی خدمت میں باریابی کیلئے نائب السلطنت کی مدد کی ضرورت تھی۔ نائب السلطنت اسوقت معتمد الدولہ آغا میر تھے۔ جنہوں نے ملازمت کا آغاز بطور ایک خدمتگار کے کیا تھا۔ لیکن نواب بیگم اور ریذیڈنٹ کی مدد سے بادشاہ پر اسقدر اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ کہ اب وہ سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جیسا کہ غالب کے خطوں سے پتہ چلتا ہے۔ ان کی نیابت تاریخ اودھ کا ایک نہایت تاریک باب ہے[ل]۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بھی شعر گوئی سے تھوڑی بہت دلچسپی ضرور تھی۔ اور (شاید اپنے مدمقابل حکیم مہدی کی ضد سے) وہ ناسخ کے مربی گنے جاتے تھے۔ چنانچہ مرزا نے بھی ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک مدحیہ

ل۔ غالب کے لکھنؤ سے جانیکے چند مہینے بعد ہی آغا میر معزول ہوگیا۔ اور قریباً چار سال تک گارد کے پہرے میں اپنے گھر کے اندر قید رہا۔ (سنیتھ)

نثر صنعتِ تعطیل میں لکھی۔ لیکن اس نثر کے پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی وجہ اس کی یہ تھی۔ کہ ملاقات کے لیے نائب نے جو شرطیں پیش کیں۔ انہیں مرزا باعث شرم اور خودداری کے خلاف سمجھتے تھے چنانچہ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں "آنچہ در باب ملازمت قرار یافت۔ خلاف آئین خویشتن داری و ننگ شیوہ خاکساری بود"۔ مرزا بقول اپنے اس وقت "خو آموز شیوۂ گدائی" تھے۔ اور شاہانِ اودھ کی تعریف میں سب سے پہلے جو قصیدہ انہوں نے لکھا ہے۔ اس میں بھی بار بار اس امر کی طرف اشارہ ہے

نازپروردۂ خلوت گہ آزادگیم — کافرم گر بسراپردۂ سلطان رفتم

من ہم از خیل کریمانم و خجلت نبود
کہ بدریوزہ بدرگاہِ کریماں رفتم

اس قصیدہ میں جس کی زبان بہت صاف ہے۔ مرزا نے اپنی مصیبتوں اور دہلی سے لکھنؤ جانے کی دردناک داستاں لکھی ہے:۔

چہرہ اندودہ بگرد مژہ آغشتہ بخوں — خود گواہم کہ ز دہلی بہ چہ عنواں رفتم
اضطرار آئینہ پرداز جلاے وطنت — نہ بدل رفتم از آں بقعہ بل از جاں رفتم
ہم جگر تفتہ ز کیں خواہی اغیار شدم — ہم دل آزردہ ز بے مہری خویشاں رفتم
ایمن از فتنہ عیاری عیارانم — باچنیں تجربہ کز یاری یاراں رفتم

منت از خویش بہ اندازۂ طاقت دارم
کہ بدیں بارالم ہائے فراواں رفتم[1]

غالب لکھنؤ سے ۲۷ جون ۱۸۲۷ء کو روانہ ہوئے اور ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو غازی الدین حیدر

[1] ۔ مرزا نے یہ قصیدہ دہلی سے پہلے شاہِ اودھ کے وکیل راجہ صاحب رام اور پھر منشی محمد حسن کے پاس اسلئے بھیجا کہ وہ اسے وزیر اودھ تک پہنچائیں۔ اور وزیر اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرے مرزا نے اسکے ساتھ منشی محمد حسن کو ایک خط لکھا ہے جسمیں وہ لکھتے ہیں "مہ بود کہ مرا بہ جائزہ بادخرانی وصلۂ مدح گستری اینما یہ سامان فراز آید۔ کہ خود را گرد آوردہ بہ لکھنؤ توانم برد و کالاے توانم کرد"۔ اس خط میں تاریخ کتابت یا بادشاہ یا وزیر کا نام درج نہیں اسلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ قصیدہ لکھنؤ کب بھیجا گیا۔ اور کیا شروع سے ہی اسمیں نصیر الدین حیدر اور روشن الدولہ کا نام تھا۔ یا پہلے غازی الدین حیدر اور معتمد الدولہ کا نام تھا۔ اور چونکہ ۱۸۲۲ء میں پیش نہ ہو سکا۔ بعد میں ناموں کی تبدیلی سے نصیر الدین کے دربار میں پیش کیا گیا۔

کا انتقال ہوگا۔ اور انکی جگہ نصیر الدین حیدر جو اُنکے بیٹے کہلاتے تھے۔ تخت نشین ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے سات آٹھ سال بعد جب روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ تو منشی محمد حسن اور روشن الدولہ کی وساطت یہ قصیدہ بادشاہ کے دربار میں پڑھا گیا۔ اور وہاں سے پانچ ہزار روپیہ دینے کا حکم ہوا۔ لیکن بقول ناسخ اس میں سے تین ہزار نواب روشن الدولہ نے کھائے۔ دو ہزار متوسط یعنی منشی محمد حسن نے۔ غالب بیچارے کو پانچ روپے بھی نہ ملے۔

حالی نے مرزا کے قیام لکھنؤ کی نسبت ایک آدھ لطیفہ لکھا ہے اس سے زیادہ اس قیام کی نسبت ہمیں بہت واقفیت نہیں۔ ناسخ سے ان کے تعلقات دوستانہ تھے۔ لیکن چونکہ اس نے بادشاہ کا خطاب حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ اندنوں بادشاہ کے زیرِ عتاب تھا۔ اور اس زمانے میں لکھنؤ سے باہر تھا۔ ورنہ قرین قیاس ہے کہ (اگر غالب سے اس کے تعلقات بعد کے نہیں) تو وہ آغا میر کے پاس رسائی میں مفید ہوتا۔

مرزا کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں اردو شعر گوئی ترک کر چکے تھے۔ لیکن چونکہ لکھنؤ میں فارسی کا قدردان کوئی نہ تھا۔ اس قیام میں انہوں نے چند ایک اردو غزلیں لکھی ہونگی۔ ایک غزل جس کے اخیر میں ذیل کے قطعہ بند اشعار ہیں۔ یقیناً اس زمانے کی یادگار ہے۔

لکھنؤ آنیکا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہمکو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہمکو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہمکو

غالب ۲۶ ذیقعد یعنی ۲۷ جون ۱۸۲۶ء بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ اور تین روز میں کانپور پہنچے۔ وہاں سے باندا گئے۔ جہاں مولوی محمد علی صدر امین نے باوجودیکہ مرزا سے پہلے تعارف نہیں تھا۔ انسے بہت نیک سلوک کیا۔ قیام باندا میں انہیں آرام سے رکھا۔ اور کلکتہ کے بارسوخ آدمیوں کے نام تعارفی خطوط بھی دیئے۔ باندا سے وہ موڈا گئے۔ اور موڈا سے چلہ تارا

آخری حصہ سفر کیلئے انہوں نے گھوڑا گاڑی لی۔ لیکن جب انہیں اس سفر میں معلوم ہوا کہ سواری آسانی سے نہیں ملتی۔ اور جو جانور ملتے ہیں۔ وہ غالبِ نیم جان سے بھی سست رفتار۔ توانہوں نے چلہ تارا سے کشتی لی۔ اور دریا کے راستے سے الہ آباد پہنچے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں جاتے وقت یا واپسی پر کوئی ناخوشگوار ہنگامہ پیش آیا۔ جس کی نسبت ایک فارسی قصیدے میں اشارہ ہے۔

نفس بلرزہ ز بادِ نہیب کلکتہ

نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہ آباد

یہاں ان کا کچھ دیر توقف کا ارادہ تھا۔ لیکن غالباً وہ نہ ہوسکا۔ اور وہ بنارس پہنچے جسوقت وہ بنارس پہنچے تو طبیعت ناساز تھی۔ چنانچہ رائے چھجمل کو ایک خط میں لکھا ہے " چہ نویسم کہ از متاع ناشتنیہا بر تہیدست افتادہ ام۔ اگر از داخلیات گفتہ آید۔ ہماں رنج معدہ دامعاست۔ وہماں برودت جگر و حرارت قلب و ضعف قوا و اگر از خارجیات سخن راندہ شود بیش ازیں نیست قطعہ۔

مغلوبِ سطوتِ دلِ غالبِ حزیں	کاندر تنش ز ضعف تو انگفت جاں نبود
گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است	مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

بنارس پہنچتے وقت انکی طبیعت علیل تھی۔ لیکن بنارس جس کے پرفضا مناظر نے حزیں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ غالب کیلئے بھی جنت نگاہ تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں طبیعت بحال ہوگئی۔ اور اب سوائے اسکے کوئی افسوس نہیں تھا۔ کہ ان کے عزیز دوستوں نے انہیں بھلا رکھا ہے۔ چنانچہ "چراغِ دہر" میں لکھتے ہیں۔

کس از اہلِ وطن غمخوارِ من نیست

مرا در دہر پنداری وطن نیست

مولوی فضل حق۔ نواب امین الدین رئیس لوہارو اور نواب حسام الدین حیدر خاں کو یاد کرکے افسوس کیا ہے۔

گر فتم گز جہاں آباد رفتم	مرا نیاں را چرا از یاد رفتم
مگو داغ فراق بوستاں سوخت	غم بیمہرئے ایں دوستاں سوخت

اسکے بعد بنارس کی بہت تعریف کی ہے۔ اور شاہجہاں آباد پر اسے ترجیح دی ہے۔

جہاں آباد گر نبود الم نیست | جہاں آباد باد اجائے کم نیست
بنا شد قحط بہر آشیانے | سر شاخ گلے در گلستانے
بخاطر وارم اینک گلزمینے | بہار آئیں سواد دلنشینے
کہ می آید بدعواگاہ لافش | جہاں آباد از بہر طوافش

تعال اللہ بنارس چشم بد دور
بہشت خرم و فردوس معمور

معلوم ہوتا ہے بنارس مرزا کو بہت پسند آیا۔ (چنانچہ چالیس برس بعد بھی ایک خط میں لکھا ہے کہ اگر میں جوانی میں وہاں جاتا تو وہیں بس جاتا) لیکن جب پسماندگان کا خیال آتا ہے تو طبیعت بیقرار ہو جاتی ہے۔

فرو ماندن بکاشی نارسائی است | خدارا ایں چہ کافرماجرائی است
بکاشی ملتفتے از کاشانہ یاد آر | دریں جنت ازاں ویرانہ یاد آر
دریغا در وطن واماندۂ چند | بخون دیدہ رونق راندۂ چند
ہوس را پائے در دامن شکستہ | بامید تو چشم از خویش بستہ
بشہر از بیکسی صحرا نشیناں | بروئے آتش دل جاگزیناں

از آنانت تغافل خوشنما نیست
بداغ شاں ہوائے گل روا نیست

بنارس سے غالب کا ارادہ تھا کہ باقی سفر کشتی سے طے کریں۔ لیکن چونکہ دریائی سفر کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ بنارس سے وہ گھوڑے پر روانہ ہوئے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں: "ناخدایان ناخداشناس بنارس درباب کشتی مضایقہ کردند۔ چہ ہرکہ برخوردم تا کلکتہ کم از صدروپیہ نہ طلبید۔ وتا پٹنہ افزوں از بست روپیہ خواست۔ ناچار ہماں اسپ سوار تا بداں بقچہ مہرا خواہم پیمود۔" غرض

اس طرح وہ پٹنہ اور مرشدآباد ہوتے ہوئے سہ شنبہ چار شعبان ۱۲۴۳ھ یعنی ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پونچے۔ یہاں انہوں نے شملہ بازار میں مرزا علی سوداگر کی حویلی میں ایک فراخ مکان دس روپیہ کرایہ پہ لیا۔ اور حصول مدعا کیلئے کوشش شروع کی۔

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ ذرمے
از سینہ داغ دوری احباب شستہ ایم

مرزا ابھی کلکتہ نہیں پہنچے تھے کہ انہیں اطلاع ملی۔ کہ نواب احمد بخش جن کی تقسیم کے خلاف وہ کوشش کرنے یہاں آئے تھے۔ وفات پاگئے۔ لیکن انہوں نے جائیداد کا وارث نواب شمس الدین کو قرار دیا تھا۔ اب مرزا کا تنازعہ ان سے تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ شروع شروع میں جب وہ کلکتہ میں حکام سے ملے۔ تو انہیں کامیابی کی بہت امید بندھ گئی تھی۔ اسوقت کلکتہ میں چیف سیکرٹری اینڈریوسٹرلنگ تھے۔ اور اسسٹنٹ سیکرٹری مسٹر سائمن فریزر۔ موخر الذکر کی ملاقات ان سے دوستانہ طریقہ سے ہوئی۔ اور "معانقہ وعطائے عطر و پان" تک کی نوبت آگئی۔ مسٹر اینڈریوسٹرلنگ نے بھی جنکی تعریف میں مرزا کا فارسی قصیدہ موجود ہے۔ نواب گورنر جنرل کے نام غالب کی عرضداشت لے کر اس کا انگریزی ترجمہ کرایا۔ اور کونسل میں پیش کیا۔ لیکن جب یہ عرضداشت گورنر جنرل کی کونسل میں پیش ہوئی۔ تو وہاں سے حکم ہوا کہ پہلے یہ فریاد ایجنٹ دہلی کے پاس ہونی چاہیئے۔ چنانچہ مرزا خود تو کلکتہ رہے۔ اور اپنے وکیل ہیرالال کو دہلی لکھا۔ کہ مناسب عرضداشت پر سرایڈورڈ کولبرگ ایجنٹ دہلی کی سفارش کراکے کلکتہ بھجوائے۔ جب کہیں مہینوں کے بعد مرزا کا خط دہلی پہنچا۔ اور وکیل کو وکالت نامہ ملا۔ تو سرایڈورڈ کولبرگ دورہ پر چلے گئے تھے۔ اور عرضی پیش نہ ہو سکی! ادھر لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل شکار پر مالدہ گئے ہوئے تھے۔ اور ان کی کونسل کے مختلف ارکان جابجا پریشان تھے۔ مرزا سے اپنے مقدمہ کے متعلق تو کچھ نہ ہوسکا۔ ہاں فارسی شعر گوئی کا جو شوق طبیعت میں راسخ ہو گیا تھا۔ اسے پورا کرنے کے موقع ملتے رہے۔ کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو مدرسہ جاری کیا تھا۔ اس سے متعلق انہی دنوں وہاں ایک بزم سخن قائم ہوئی تھی۔ جہاں ہر مہینے پہلے اتوار کو مشاعرہ ہوتا۔ اور اردو فارسی غزلیں

پڑھی جاتیں۔ مرزا نے بھی اس میں غزلیں پڑھیں۔ ان میں ایک غزل تھی جس کا مقطع مشہور ہے۔

گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب
رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

جب ذیل کا شعر پڑھا گیا۔ تو لوگ معترض ہوئے۔

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

اعتراض یہ تھا۔ کہ عالم واحد ہے۔ اور ہمہ بقول قتیل کے واحد سے پہلے نہیں آ سکتا۔ اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے شعر پر بھی اعتراض ہوا۔ کہ زدہ کا استعمال غلط ہے۔

شورِ اشکے بہ فشارِ بنِ مژگاں دارم
طعنہ بر بے سر و سامانیِ طوفاں زدہ

غالب کے معترضین میں مولوی عبد القادر رام پوری۔ مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور دوسرے فارسی کے مستند استاد تھے۔ لیکن مرزا بھی تنہا نہ تھے۔ انہی دنوں شاہزادہ کامران کی طرف سے کفایت خاں ایک ایرانی سفیر کلکتے آیا ہوا تھا۔ اس نے غالب کے اشعار کی تعریف کی اور اساتذہ کے پانچ سات اشعار ایسے پڑھے۔ جن میں ہمہ عالم' و ہمہ روز' و ہمہ جا' اس طرح کی ترکیبیں موجود تھیں۔ اسکے علاوہ نواب اکبر علی متولی امام باڑہ اور دوسرے با اثر آدمیوں نے مرزا کی حمایت کی۔ لیکن مرزا طبعاً صلح پسند تھے۔ اور اب بالخصوص اس غربت اور احتیاج کی حالت میں کلکتے کے با اثر لوگوں سے بگاڑنا دانشمندی کے خلاف تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک فارسی مثنوی بادِ مخالف" لکھی جسمیں معترضوں کے جواب استناد و دلائل کے ساتھ دیئے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اراکین انجمن اور قتیل کی تعریف کر کے صلح و آشتی کی کوشش کی ہے۔ قیام کلکتہ کے دوران میں مرزا نے زیادہ تر فارسی اشعار لکھے۔ لیکن وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی پر بخوبی قادر تھے۔ چنانچہ چکنی ڈلی کی تعریف میں ان کا مشہور اردو قطعہ کلکتہ کی ہی ایک صحبت کی یادگار ہے۔

کلکتہ میں غالب کی ملاقات لکھنؤ کے مولوی سراج الدین احمد سے ہوئی۔ جن کا اخبار "آئینہ اسکندر" سے کچھ تعلق تھا۔ اور جن کا حکام سے بھی بہت رسوخ تھا۔ انہیں مرزا کے عزیز ترین دوستوں میں سے سمجھنا چاہیئے۔ اور ان کے فارسی مکتوبات میں سب سے زیادہ خطوط انہی کے نام ہیں۔ ان کے ایما پر غالب نے قیام کلکتہ کے دوران میں اپنے اردو اور فارسی کلام کا "گل رعنا" کے نام سے انتخاب کیا۔ بدقسمتی سے اس انتخاب کا کوئی نسخہ اس وقت دستیاب نہیں ہوتا۔ ورنہ غالب کے کلام کا کچھ حصہ تیقن سے ترتیب دیا جا سکتا۔ لیکن اس انتخاب کیلئے غالب نے جو مقدمہ اور خاتمہ لکھا ہے۔ وہ کلیاتِ فارسی میں موجود ہے۔ اور مرزا کی شاعری کے طالب علم کیلئے بہت کار آمد ہے شاید کلکتہ میں ہی مرزا کی ملاقات لکھنؤ کے ایک اور قابل ذکر فرد میر حسن علی سے ہوئی۔ جو ۱۸۱۰ء میں لنڈن ہندوستانی کے پروفیسر "شیکسپیر" کے معاون ہو کر رہے تھے۔ اور ولایت سے واپسی پر ایک اعلیٰ گھرانے کی انگریز خاتون سے (بطور اہل کتاب) شادی کر کے ساتھ لائے تھے۔ مسز حسن علی قریباً ۱۱ سال ہندوستان میں رہیں۔ اور اس اثنا میں ہندوستانی مسلمانوں کی نسبت انہوں نے ایک مفصل کتاب لکھی ہے۔ جس کا نیا ایڈیشن حال میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے شایع ہوا ہے۔ اور جس سے بہتر کتاب اس زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کی نسبت کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں۔

غالب کا قیام کلکتے دو سال سے کچھ کم رہا ہو گا۔ شروع شروع میں تو نئی نئی صورتیں اور نئے انتظامات نظر کو بہت بھائے۔ گورنر جنرل کی خدمت میں باریابی حاصل ہوئی اور ان کے لئے سات پارچے اور جیغہ۔ سرپیچ۔ مالائے مروارید۔ تین رقم خلعت کا فیصلہ بھی ہوا۔ جو انہیں بعد میں ملتا رہا۔ لیکن جب دو سال گذر گئے۔ اور جس منزل کو پیش نظر رکھ کر گھر سے نکلے تھے۔ وہاں تک رسائی نہ ہوئی۔ تو مرزا کی طبیعت پہ مایوسی غالب آگئی۔ چنانچہ ان کے بعد کے خطوط اس تلخی سے پر ہیں۔ اور ایک فارسی قطعہ میں بھی کلکتہ کے متعلق انہوں نے مکالمہ کی صورت میں تلخ جذبات کا اظہار کیا ہے۔

حال کلکتہ باز جستم و گفت   بایداقلیم ششمش گفتن

گفتم اینجا چہ شغل سود دھد — گفت از ہر کہ ہست ترسیدن
گفتم اینجا چہ کار باید کرد — گفت قطع نظر زشعر وسخن
گفتم از بہر داد آمدہ ام
گفت بگریز وسر بسنگ بزن

معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سے سر ایڈورڈ کولبرگ نے مرزا کے حق میں رپورٹ کی تھی۔ اور کلکتہ سے بھی حوصلہ افزا جواب گیا تھا۔ لیکن ابھی وہ جواب نہ پونچا تھا کہ کولبرگ معزول ہوگیا۔ اور معاملے پرنئے سرے سے تفتیش شروع ہوئی۔ چونکہ کلکتہ میں مرزا کا قیام کسی طرح مفید نہیں ہو رہا تھا۔ اور دہلی میں کوشش زیادہ کارآمد ہو سکتی تھی۔ اور گورنر جنرل خود دہلی کی طرف جانیوالا تھا۔ مرزا بھی کلکتہ سے دہلی واپس گئے۔ اور ۱۱ نومبر ۱۸۲۹ء کو وہاں پونچکر نئے ایجنٹ فرانس ہاکنس سے مدد چاہی کرنیل ہری املاک نے مرزا کی سفارش نئے ایجنٹ سے کی تھی۔ اور انہیں کچھ امید بھی ہوئی۔ لیکن ایجنٹ نے رپورٹ نواب شمس الدین رئیس فیروزپور کے حق میں کی۔ مرزا کو ان کے دوستوں نے اسکی اطلاع دی لیکن وہ مطمئن تھے۔ کہ مسٹر اسٹرلنگ چیف سکریٹری معاملے کو سنبھال لیگا۔ لیکن ابھی یہ رپورٹ کلکتے نہیں پہنچی تھی۔ کہ ۲۳ مئی ۱۸۳۰ء کو سٹرلنگ مرگیا۔ اور ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کو لارڈ ولیم بنٹنگ نے فیصلہ مرزا کے خلاف کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے تقسیم جائداد کی تائید میں لارڈ لیک کا ایک فارسی حکم پیش کیا تھا۔ جسے مرزا جعلی بتاتے تھے۔ اس کے مطابق نصر اللہ خاں کے وارثوں کی جو پنشن مقرر ہوئی تھی۔ اور ڈلیک کے احکام کے مطابق دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ ہوگئی تھی جس میں سے دو ہزار خواجہ حاجی کے۔ پندرہ سو مرزا نصر اللہ خاں کی ماں اور بہنوں کے اور پندرہ سو اس کے دو بھتیجوں کے۔ مرزا اس "نامۂ فارسی بے نام ونشاں" کی صحت اور اہمیت کے قائل نہیں تھے۔ لیکن سر جان ملکم نے جس سے اس امر میں استصواب کیا گیا، اسے درست تسلیم کیا۔ اور ان کے مشورہ پر لارڈ ولیم بنٹنگ نے یہ فیصلہ کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ بظاہر مرزا کا کلکتہ کا سفر بیکار ثابت ہوا۔ اور حصول جائداد کی تمام تگ و دو رائیگاں گئی۔ لیکن مرزا کے مشاہدہ کی وسعت اور ذہنی نشو و نما کیلئے کلکتہ کا سفر بہت مفید تھا ایک تو مسافری میں طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا کر جو قسم قسم کے آدمیوں کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ ہوا دوسرے کلکتہ ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر حکومت تھا۔ مغرب کی تمام ترقیاں اور ایجادات سب سے پہلے ہندوستان میں وہاں شروع ہوتی تھیں۔ مرزا کو انہیں بچشم خود دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اور اس معاملہ میں ان کی واقفیت اپنے ہموطنوں سے زیادہ تھی۔ اسی طرح لکھنؤ میں بھی مرزا کو دیر تک قیام کرنے اور وہاں کی طرزِ شاعری اور زبان کی صفائی میں ناسخ جو کوششیں کر رہے تھے انہیں مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ یقین ہے کہ مرزا کی اثر پذیر طبیعت نے ان تمام باتوں کا فائدہ اٹھایا ہوگا۔ انہوں نے سفر کلکتہ کے بہت دیر بعد تک اردو اشعار بہت کم لکھے ہیں۔ لیکن ان کے بعد کے اور پہلے کے فارسی اشعار میں جو فرق ہے۔ وہ اُس طبیعت اور دماغ کی پختگی کو نمایاں کرتا ہے جو اس تین سال کی مسافرت سے اُنہیں حاصل ہوئی ؂

مقدمہ کے بگڑ جانے سے غالب کی جو حالت ہوئی اُس کا اظہار کئی خطوں میں ہے چنانچہ مولوی سراج الدین کو جنہوں نے اس سلسلے میں ان کیلئے بہت کچھ کیا تھا۔ لکھا ہے۔" کارِ من بداد گاہِ دہلی چنانکہ دانستہ باشد تباہی گزید۔ حالیا براں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد۔ باز بداں درہم و در دِلِ بیاں زمزمہ سر ضرور ریزم کہ مرغانِ ہوا و ماہیانِ دریا را بر خود بگریانم۔ ہیہات اگر معاشِ من ہمیں پنجہزار روپیہ سالانہ بدیں تفریق از روئے دفتر سرکار کہ سادہ دلاں آں را معدلت آثار گویند ثابت شدہ بود۔ بائستے کہ صاحبان صدر مَرا از پیش راندندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروش۔ آنچہ تو باز یافت و انمودۂ یافتنی ازاں فزونتر نیست۔ و قرار داد نیز ہمانست لاجرم دیوانہ بودمے۔ اگر بدیں کشور باز آمدے و بایک قبیلہ کہ خویشاں و برادراں من اند۔ بہ ستیزہ برخاستمے و بباطل سپری نام برآوردمے۔" ان سطور سے یہ خیال ہو سکتا ہے۔ کہ مرزا کو پھر کلکتہ جانے اور صدر میں کوشش کرنیکا خیال تھا لیکن غالباً یہ فقط انشا پردازی ہے۔ مرزا پھر کلکتہ نہیں گئے۔ اور اس خط کے آخیر میں لکھتے ہیں۔" اکنوں مصلحت دراں می بینم کہ ازیں داوری قطع نظر فرمایند و وکالت نامۂ من کہ نزد منشی نصر اللہ است۔ باز ستانند و از ہم بدرنند و بگزرند اللہ بس ماسویٰ ہوس۔" مرزا کو ایک تو

اتنی کوشش رائیگاں جانے کا افسوس تھا۔ دوسرے اہالیانِ دہلی کے طعنے۔ جن سے بچنے کیلئے معلوم ہوتا ہے انہیں شروع شروع میں کنج عزلت میں پناہ لینی پڑی۔ ابتدا میں تو مایوسی اور رنج کی شدت سے طبیعت فکر شعر کے ناقابل تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس زخم کا اندمال ہونا شروع ہوا۔ ان کے عزیز دوستوں میں۔ سے ان کے تعلقات مولوی فضل حق سے ہمیشہ برقرار رہے تھے نواب مصطفیٰ خاں سے رابطہ اسی زمانہ میں بڑھا۔ اور نواب امین الدین اور نواب ضیاء الدین سے۔ جو نواب شمس الدین سے بہت خوش نہیں تھے۔ رشتۂ اخوت اور مضبوط ہوگیا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کہ نواب شمس الدین نے پرگنہ لوہارو اپنے دونوں بھائیوں کے نام منتقل کردیا تھا۔ انتظام اس کا نواب امین الدین کے ہاتھ میں تھا۔ اور ایک شرط یہ تھی۔ کہ اس کی آمدنی میں سے ۵۰۱۰ روپیہ سالانہ سرکاری خزانہ میں نواب ضیاء الدین کے اخراجات کے لئے جمع کردیا جاوے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب امین الدین یہ رقم باقاعدہ خزانے میں جمع نہیں کرا سکے۔ اس پر نواب شمس الدین نے کوشش شروع کی۔ کہ چونکہ نواب امین الدین دستاویز کی سب شرطیں پوری نہیں کرسکے۔ اس لئے ایک سالانہ رقم کے عوض یہ پرگنہ انہیں واپس ملجائے۔ مسٹر مارٹن ریذیڈنٹ دہلی نے اسکی تائید کی۔ اور گورنمنٹ اوف انڈیا کے احکام کے مطابق لوہارو۔ نواب شمس الدین کو واپس مل گیا۔ مسٹر ولیم فریزر جو نئے ریذیڈنٹ ہو کر آئے تھے۔ وہ اس تبادلہ کے حق میں نہ تھے۔ ان کے شروع میں نواب شمس الدین سے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ لیکن بعد میں کشیدگی ہوگئی۔ انہوں نے نواب امین الدین کو مشورہ دیا۔ کہ وہ اس فیصلہ کے خلاف کلکتہ جاکر کوشش کریں مرزا بھی ان کوششوں میں شریک تھے۔ چنانچہ جب اکتوبر ۱۸۳۴ء میں نواب کلکتہ گئے۔ تو غالب نے انہیں اپنے کلکتہ کے دوستوں کے نام نہایت محبت بھرے تعارفی خطوط دیئے۔ مولوی سراج الدین کے نام ایک خط میں انہوں لکھا تھا۔

" بالجملہ بدیں نامہ نگاری مدعائے اصلی بدیں رنگ است۔ کہ برادر صاحب مشفق نواب امین الدین خان بہادر ابن فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر راہماں موج بلا کہ زورق شکستہ بود۔ خانہ بسیلاب فنا داد۔ کمر یہ غمخواری و راہبرد نوازی استوار بندید و خود را دوست دیرینۂ امین الدین خاں دانستہ آنچناں چارہ سازی

وسگالش گیری بجا آرید۔ کہ این وزدمند دوراز خانماں اسداللہ روسیاہ را فرامش کند وشمار را بجائے او واندے"

مرزا کے عزیز دوست کئی تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اُن کے باوجود مرزا کی مصائب کم نہیں ہوئیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی۔ کہ نواب شمس الدین کا دہلی میں بہت رسوخ تھا۔ دوسرے مرزا کا قرضہ جو کلکتہ جانے سے پہلے ہی انہیں گھبرا رہا تھا۔ بہت بڑھ چکا تھا۔ اور چونکہ قرضخواہوں کو بڑی جائداد کوئی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ حصولِ زر کیلئے بیتاب ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسی سال ان میں سے دو نے دیوانی عدالت میں مرزا کے خلاف دعوےٰ کر کے ڈگری حاصل کرلی۔ مرزا کے لئے یہ زمانہ سخت مصیبت کا تھا۔ زرِ ڈگری اداکرنے کی ان میں طاقت نہ تھی۔ اور قاعدے کے مطابق انہیں جیل جانا تھا۔ لیکن چونکہ بقول ان کے مشہور اشخاص کے ساتھ اتنی رعایت ہوتی تھی۔ کہ عدالت کا چپراسی انکے گھر نہ جاتا اور جب تک کہ مدیون رستے میں نہ ملے اسے قید نہ کرسکتے تھے۔ مرزا بھی گھر بیٹھ رہے چنانچہ انہوں نے ایک اہم فارسی خط میں ناسخ کو اس زمانے کے تمام حالات لکھے ہیں۔

"چار ماہ است۔ کہ نامہ نگار بہ کنجے نشستہ در آمد شد بر روئے خویش وبیگانہ بستہ اگر بزنداں اندر نیم اما خور و خفت من بزندانیاں ماند۔ آنچہ دریں چند روز از رنج وآشوب دیدہ ام۔ کافر باشم اگر ہیچ کافر بعد صد سالہ عقوبتِ جہنم یک نیم ازاں تواند دید" مرزا اس "قید خانہ نشینی" میں تھے کہ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کی شام کو ولیم فریزر ریذیڈنٹ دہلی کو کسی نے گولی سے ہلاک کر دیا۔ مرزا کے فریزر سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور انہیں امید تھی۔ کہ شائد اس کی اعانت سے جاگیر کا عقدہ حل ہو جائے چنانچہ اس کی تعریف میں ان کا ایک پر زور قصیدہ بھی ہے۔

زجیبِ افق مہر چوں سر بر آرد	مے از سبز مینا بساغر بر آرد
من و بزم ولیم فریزر بہادر	کہ از جیب ہر گوشہ گوہر بر آرد
نہے داد گستر کہ گرد رحضور ش	خسے داد از دست آذر بر آرد
کشد انتقام خس از شعلہ چنداں	کہ دود از نہاد ہر اخگر بر آرد

مرزا کو اسکی موت کا بہت رنج ہوا۔ چنانچہ وہ اسی خط میں لکھتے ہیں "یکے از ستمگراں خدا ناترس کہ بعذاب ابدی گرفتار باد۔ ولیم صاحب بہادر را کہ ریذیڈنٹ دہلی و غالب مغلوب رامربی بود۔ در شب تاریک نعرب تفنگ کشت، و مراغم مرگ پدر تازہ کرد۔" ان دنوں جو صاحب دہلی میں مجسٹریٹ تھے۔ وہ غالب کو جانتے تھے۔ انہوں نے غالب سے تفتیش جرم کے سلسلہ میں مدد لی۔ اور سرکاری تفتیشات کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواب شمس الدین اور اس کا ایک سپاہی مجرم قرار دیئے گئے نواب اور غالب کے تعلقات تو عوام کو معلوم ہی تھے۔ دہلی کے لوگ لے اڑے کہ نواب بیگناہ ہے اور غالب اور فتح الہ بیگ خاں[1] نے کینہ وری سے حکام کو اسکے خلاف بھڑکا رکھا ہے۔

نواب شمس الدین صاحب سے جنہیں مسٹر کالون کی مزید تحقیقات کے بعد سوم اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری بازار کے باہر شارع عام میں پھانسی دیگئی۔ عوام کو بہت ہمدردی تھی۔ اور غالب کے متعلق اگرچہ عوام کا خیال بے بنیاد ہی ہو یہ خیال عام ہونیکے بعد ان کا غالب سے جو برتاؤ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اور مرزا نے ناسخ کے نام اس زمانے میں جو دو خط لکھے ہیں۔ ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کیلئے یہ وقت کس ابتلا اور آزمائش کا تھا۔ اور وہ غصہ اور عداوت سے کس طرح بے بس ہو رہے تھے۔

نواب کی وفات کے بعد فیروزپور جھرکا کی ریاست تو ضبط ہو گئی۔ اور مرزا کی پنشن جو انہیں اس ریاست سے ملتی تھی۔ دہلی کلکٹری سے ماہوار ملنی شروع ہوئی۔ مرزا نے اس موقعہ پر پھر ایک مفصل عرضی گورنمنٹ اوف انڈیا کی خدمت میں نواب کی جائداد سے پورا حق پانے کیلئے پیش کی۔ لیکن چونکہ لارڈ ولیم بنٹنگ نے مرزا کے حقوق کا قطعی فیصلہ کر دیا تھا۔ وہ داخل دفتر ہوئی۔ اس پر مرزا نے کورٹ اوف ڈائرکٹرز کے سامنے گورنمنٹ کے فیصلہ کے خلاف مرافعہ کیا۔ لیکن مرزا کو اس عرضداشت کا جواب بھی نہ ملا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسکے بعد انہوں نے ایک انگریزی عرضداشت

---

[1] سوانحعمری لارڈ لارنس میں درج ہے کہ نواب کے متعلق شک ایک شخص فتح خاں (؟) کے ایک فقرے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ جسے منکاف صاحب نے ذاتی عداوت کا اظہار سمجھکر نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن لارنس صاحب نے دھیان میں رکھا اور مجرم کا سراغ کھود نکالا۔

ملکہ وکٹوریہ کی خدمتمیں بھی ارسال کی لیکن یہ سب سعی بے سود ثابت ہوئی۔ اور جہاں تک ہمارا خیال ہے مرزاکو باسٹھ روپیہ آٹھ آنے ماہوار سے زیادہ پنشن کبھی نہیں ملی۔

فریزر کے قتل سے چند مہینے پہلے مرزا نے دربار شاہی میں اپنا اثر بڑھانیکی کوشش کی تھی۔ لیکن اس زمانے میں ان کی سب نردیں اُلٹی پڑ رہی تھیں۔ یہ کوشش بھی چنداں کامیاب نہ ہوئی۔ اس زمانے میں تخت شاہی پر اکبر شاہ متمکن تھے۔ اور ظفر ولی عہد تھا لیکن چونکہ ظفر کی دماغی حالت بہت اچھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بادشاہ نے ۱۸۳۶ء میں کوشش کی کہ کسی طرح بجائے ظفر کے شاہزادہ سلیم ولی عہد تسلیم ہو جائیں۔ مرزا غالب سمجھتے تھے۔ کہ ظفر تو ذوق کے ہو رہے ہیں اگر شہزادہ سلیم آگے چلکر بادشاہ ہوئے تو میرے لئے بہتر رہیگا۔ چنانچہ اسی سال عید البقر کے موقع پر انہوں نے "شہ و شاہزادہ" کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جس میں بادشاہ اکبر کی تعریف کے ساتھ ساتھ ذیل کا مطلع ثانی لکھکر شہزادہ سلیم کی تعریف کی تھی۔

زہے مناسبت طبع شاہزادۂ سلیم
بہ فیضِ تربیت پادشاہِ ہفت اقلیم

لیکن بادشاہ کی اس تجویز کو حکام انگریزی نے نہ مانا اور ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ کی وفات پر ظفر بادشاہ ہو گیا۔ ممکن ہے اسکے دل میں اس قصیدے کا کچھ ملال رہا ہو۔ اور اس کی تعریف میں ابتدائی فارسی قصائد میں غالب کو جو بار بار معذرت کرنیکی ضرورت پیش آئی۔ اس کا اس قصیدے سے بھی کچھ تعلق ہو۔

جس سال بہادر شاہ تخت نشین ہوا۔ اسی سال نصیر الدین شاہ اودھ کا انتقال ہوا۔ اور امجد علی شاہ اس کا جانشین ہوا۔ مرزا نے اس کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ لیکن وہ غالباً پڑھا نہیں گیا اس قصیدہ میں تشبیب اور مدح کے بعد اپنی قسمت کا رونا رویا ہے۔ ؎

با من کہ تابِ نازِ نکویاں ندا شتم
بد کرد بد کہ جور وجفا کرد روزگار

ایک قطعہ بند بھی ہے جس کا مضمون اقبال کی مشہور نظم اسیری سے جو انہوں مولانا محمد علی کی رہائی پر لکھی تھی۔ بہت ملتا جلتا ہے۔

گفتم بہ عقل کل کہ ندانم برائے من — حکم دوام حبس چرا کرد روزگار

گفت اے ستارہ سوختہ نا زاغ ورغن نہ — کانرا گرفت و بازرھا کرد روزگار

تو بلبلی ہمیں کہ بدام آمدی ترا! — اندر قفس زبہر نوا کرد روزگار

بیشک غالب کیلئے یہ حصۂ زندگی مصائب و ناکامیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن ادبی نقطۂ نظر سے یہ زمانہ بنجر نہ تھا۔ قرین قیاس ہے کہ جب مرزا کے نوابی اور جاگیرداری کے خواب پریشان ہوگئے ہونگے۔ تو انہیں شعر و سخن سے جو ازلی دلچسپی تھی۔ وہ اور بھی بڑھ گئی ہوگی۔ چنانچہ فارسی غزلیات کا معتدبہ حصہ اسی زمانے میں لکھا گیا۔ اور جب ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین کی پھانسی کے کچھ دیر بعد مرزا کے نسبی بھائی مرزا علی بخش خاں[1] ان کے ہاں آکر مقیم ہوئے۔ تو ان دنوں مرزا کا دیوان فارسی مسمیٰ بہ "میخانۂ آرزو" مرتب ہو چکا تھا۔ اس دیوان کا خاتمہ ۱۸۳۷ء میں لکھا گیا۔ اور اس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ جس کا ان کی فارسی شاعری کی ترتیب میں وہی مرتبہ ہے۔ جو نسخۂ بھوپالی کا اردو شاعری میں۔ اور جس سے ان کا ابتدائی چالیس سال کا فارسی کلام ذوق سے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب ابتدا میں غالب نے دیوان فارسی مرتب کیا۔ تو اس میں اشعار کے ساتھ ساتھ فارسی خطوط دیباچے وغیرہ شامل تھے۔ مرزا علی بخش کو انہیں یکجا کرنیکا خیال پیدا ہوا۔

---

[1] ۔ مرزا علی بخش مرزا کے نسبی بھائی تھے۔ اسکے علاوہ غالب کی بھتیجی یعنی میرزا یوسف کی صاحبزادی مرزا علی بخش کی بہو اور مرزا غلام فخرالدین کی بیوی تھی۔ مرزا غالب اور مرزا علی بخش کے تعلقات شروع میں اچھے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے۔ بعد میں ان میں فرق آگیا۔ مرزا نے اپنے دو خطوں میں مرزا علی بخش کی "دروغ بافیوں" کا ذکر کیا ہے۔ اسکے علاوہ اردوئے معلیٰ سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا انکی تدفین کیوقت بھی شامل نہیں ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے مرزا علی بخش نے غدر کے وقت مرزا کی مدد نہیں کی۔ وہ ایک اردو خط میں اپنے گھر کے متعلق لکھتے ہیں: "سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور بنگہ گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز (مرزا معین الدین؟) کا بہنوئی (مرزا ضیاء الدین؟) مددگار ہے۔ اور شاعر (غالب؟) کا سالا (مرزا علی بخش؟) بھی جانبدار نہیں۔"

اور انہوں نے میخانۂ آرزو[1] میں جو منثر شامل تھی۔ اسکے علاوہ دوسرے خطوط فراہم کرکے "پنج آہنگ" مرتب کی۔ اس کتاب کے شروع میں مرزا علی بخش کا اپنا دیباچہ ہے۔ جس میں یہ تفصیلات درج ہیں۔ آہنگ اول میں فارسی خطوط نویسی کے متعلق وہ سطور ہیں۔ جو غالب نے سفر بہرتپور کے دوران میں لکھی تھیں آہنگ دوم میں فارسی مصادر و مصطلحات ہیں۔ آہنگ سوم میں مرزا نے اپنے فارسی دیوان کے کئی شعر انتخاب کئے ہیں۔ اور خطوط نویسی میں ان کا محل استعمال بتایا ہے۔ آہنگ چہارم میں تعاریظ کتب اور متفرق مضامین اور آہنگ پنجم میں مرزا کے اپنے فارسی خطوط۔ معلوم ہوتا ہے۔ خطوط کے فراہم کرنے میں کچھ دیر لگی۔ اور ۱۸۴۰ء کے قریب یہ کتاب مرتب ہوئی۔ انڈیا آفس لائبریری میں اس کا جو نسخہ ہے۔ اس کی تاریخ طباعت ۱۸۵۳ء ہے اس کے بعد آہنگ چہارم اور آہنگ پنجم میں اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن چونکہ مرزا کے کئی خطوط غدر میں نواب ضیاء الدین اور نواب حسین مرزا کے کتبخانوں کی تباہی سے ضائع ہوگئے تھے بقول غالب پنج آہنگ نامکمل ہے۔ اور اسکے مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

آہنگ اول کا تذکرہ ہم ابتدائی حالات میں کرچکے ہیں۔ آہنگ دوم میں فارسی صرف و نحو کے معمولی قواعد ہیں۔ آہنگ سوم کے اشعار اس لئے بھی کارآمد ہیں کہ ان سے کئی فارسی غزلوں کی تاریخ تصنیف تعین کی جاسکتی ہے۔ اور اسکے علاوہ مرزا کے اپنے قلم سے ان کے اشعار کا مفہوم اور محل استعمال پڑھنا بیحد دلچسپ ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کا سب سے قیمتی جزو مرزا کے وہ فارسی خطوط ہیں۔ جن کا بلبشتر حصہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۵۳ء تک لکھا گیا۔ یہ خطوط غالب کے سوانح نگار کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔ اور کسی کتاب سے مرزا کی ان ستائیس سالوں کی کوششوں مصیبتوں اور ان کے ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ جتنا ان خطوط کے مطالعہ سے۔ ہم نے اس کتاب میں دوسرے تذکروں کی نسبت زیادہ مفصل اور صحیح حالات لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ تو بلبشتر یہ اسی محنت کا صلہ ہے جو ان خطوط کے مطالعہ میں صرف کی گئی۔

---

[1] - مرزا کی تصنیفات کے نام بہت شاعرانہ ہیں۔ گل رعنا۔ میخانۂ آرزو۔ پنج آہنگ۔ مہر نیمروز۔ اردوئے معلی عود ہندی سبد چین

مرزا کے اردو خطوط کی سوانحی اہمیت کو سب مانتے ہیں۔ لیکن سوائے ان خطوط کے جن میں مرزا نے اپنے واقعات زندگی مختصراً دہرائے ہیں۔ ان میں نو دس سال سے زیادہ کے واقعات نہیں۔ اور چونکہ اس زمانے میں نواب مصطفیٰ خاں کے تعلقات کی وجہ سے حالی یہ کو بھی جو نواب کے لڑکوں کے اتالیق تھے۔ مرزا سے ملنے کے زیادہ موقع ملتے رہتے تھے۔ اس زمانے کے حالات اور قصے یادگار میں بالتفصیل مندرج ہیں۔ لیکن انکے ابتدائی حالات میں ابھی بہت کرید اور تلاش کی گنجائش ہے۔ اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ اسکے لئے مرزا کے فارسی خطوط بہت مفید ہیں۔ جو ان کے عمر کے بڑے حصہ کی ایک کم وبیش مکمل تاریخ ہیں۔ اور جو اسوقت لکھے گئے۔ جب مرزا کو یہ حالات درپیش تھے۔
اس شخصی اہمیت کے علاوہ مرزا کے فارسی خطوط اسلئے بھی دلچسپ ہیں۔ کہ ان کے مطالعہ سے اس زمانے کی بہت ممتاز ہستیوں سے شناسائی ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کے نام مرزا نے خطوط یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کی فہرست بہت پرشکوہ ہیں۔ اور اس میں اس زمانے کے اکثر ممتاز آدمیوں کے نام آجاتے ہیں۔ چنانچہ شعرا میں سے ناسخ۔ مومن۔ شیفتہ۔ نیر درخشاں اور علما میں سے مولینا فضل حق۔ مولانا صدرالدین صدر الصدور و قاضی القضاۃ مولینا ولایت حسین اور اکابریں سے شہزادہ بشیر الدین میسوری۔ شہزادہ سلیمان شکوہ۔ مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں۔ سر جیمس ٹامسن۔ مہاراجہ الور نواب سعد الدین خاں شفق۔ مجتہد العصر مولوی سید محمد و حکیم احسن اللہ خاں۔ ان سب کے نام مرزا کے دوستانہ خطوط موجود ہیں۔ جن سے نہ صرف مرزا کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ انیسویں صدی کے آغاز میں شمالی ہندوستان میں جو بڑی بڑی ہستیاں تھیں۔ ان سے بھی تعارف ہو جاتا ہے۔ خطوط میں بیشتر ذاتی حالات کا تذکرہ ہے۔ لیکن ان سے اس زمانے کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے مثلاً انہوں نے اپنے سفر بنگالہ کی جو صعوبتیں بیان کی ہیں ان سے اس زمانے کے وسایل آمد و رفت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یا جو خط انہوں نے لکھنؤ سے روانگی کے وقت لکھا ہے۔ اس میں لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کی ان مصیبتوں کی تفصیل ہے۔ جو انہیں معتمد الدولہ کی وزارت میں برداشت کرنی پڑیں۔ اسکے علاوہ کئی خطوط میں مولوی سراج الدین کو دہلی کی دلچسپ خبریں لکھی ہیں مثلاً ۱۳ جنوری

سے ایک خط میں مولوی فضل حق کے سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے اور دہلی سے روانہ ہونے کی تفصیلات درج کی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ جونہی انہوں نے استعفیٰ دیا۔ نواب فیض محمد خاں نے فوراً ۵۰۰ ماہوار انکے اخراجات کیلئے مقرر کر دیا۔ اور جس روز وہ دہلی سے روانہ ہوئے اہالیان دہلی کی بری حالت تھی۔ ولیعہد شاہ دہلی مرزا ابوظفر نے انہیں اپنے پاس بلایا۔ اور ایک دوشالہ ملبوس خاص نذر کر کے آنکھوں میں آنسو لا کے نہایت رنج و درد سے الوداع کیا۔ ایک اور خط میں لارڈ النبرا کے اس فیصلہ کی نسبت اشارہ ہے جس کی رو سے تاج محل اور قلعہ آگرہ کی عمارتوں کا سنگ مرمر اتار کر بیچ ڈالنے کا ارادہ تھا۔ اور جو بقول لارڈ کرزن آرٹ کی خوش قسمتی سے عمل میں نہ لایا جا سکا۔

حالی نے یادگار غالب میں مرزا کی فارسی نثر کا انتخاب کر کے اس کا فارسی کے دوسرے مشہور نثر نویسوں کی تحریروں سے مقابلہ کیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ خواہ مرزا خود کیا کہیں۔ انہوں نے نثر میں اکثر ان فارسی نثر نویسوں کا اتباع کیا۔ جن کی تصنیفات بیشتر ہندوستان میں لکھی گئیں اور اس امر پر قریباً قریباً سبھی فارسی اہل زبان متفق ہیں کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ترکی یا مغل بادشاہوں کی سرپرستی میں جو فارسی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کا طرز تحریر کسی طرح بھی قابل تقلید نہیں۔ وہ بالعموم موٹے موٹے عربی الفاظ۔ پیچیدہ ترکیبوں اور شاعرانہ رنگ آمیزی کے طوفان میں اصل مطلب خبط کر دیتے ہیں۔ مرزا بھی اس اصول سے مستثنےٰ نہیں۔ اور ظہوری۔ ابو الفضل اور بیدل کی طرح ان کی نثر میں بھی غیر مانوس الفاظ اور پیچیدہ تراکیب بہت ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ان کی آخر عمر کی تصانیف دستنبو اور قاطع برہان کی زبان کسی قدر صاف ہے۔ اور اکثر فارسی خطوط میں بھی وہ اشکال نہیں۔ جو تقاریظ اور دوسری سنجیدہ اور رسمی تحریروں میں ہے۔ اکثر خطوط کی عبارت صاف، اور موثر ہے۔ شاعرانہ نازک بیانی سے بھی لطف پیدا کیا ہے۔ لیکن ان کے فارسی خطوط ان کے اردو خطوط کے مرتبے کو نہیں پہنچتے۔ ان میں وہ شگفتگی اور بے تکلفی نہیں۔ جو اردو خطوط میں ہے اور جو شوخی اور ظرافت بعد کے خطوط کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان خطوط میں سراسر مفقود ہے بالعموم یہ کہنا صحیح ہے کہ مرزا کی دلچسپ شخصیت جو اردو خطوط میں عریاں اور بے نقاب جلوہ نما ہے

اس پر فارسی خطوط میں تکلفات اور رسمی انشاپردازی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور اسکے دلچسپ اور ہردلعزیز پہلو مشکل سے ہی نظر کے سامنے آتے ہیں۔ لیکن آخر فارسی اور اردو ہر دو تصانیف ایک ہی ذہن رسا کے نتائج تھیں۔ اور جسطرح ایک ہی مضمون کو مرزانے فارسی اور اردو اشعار میں ادنیٰ اختلاف کیساتھ نظم کیاہے۔ فارسی خطوط میں کئی خیالات اور جذبات ایسے ہیں۔ جنہیں ترقی دیکر انہوں نے بعد میں نہایت موثر طریقے سے ادا کیا۔ مثلاً انہوں نے عارف کی موت پر جو غزل لکھی ہے۔ اردو کے موثر ترین مرثیوں میں سے ہے۔ لیکن اس کا چربہ اس سے پندرہ سال پہلے کے ایک فارسی خط میں موجود ہے۔ جو انہوں نے مولوی سراج الدین کو مرزا احمد بیگ کی وفات پر لکھا۔ "میگفت کہ بدہلی می آیم۔ وعدہ فراموش بیمروت راہ گرواند و ناقہ سرمنزل دیگر راند۔ گرفتم کہ خاطر دوستاں عزیز نداشت۔ چرا بحال خرد سالاں نہ پرداخت" یہی آخری خیال ہے جس کو انہوں نے اردو غزل میں نظم کیاہے ؎

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

غالب کو مقدمے کا فیصلہ اگست ۱۸۳۱ئہ میں معلوم ہوا۔ اس دس سال کے عرصے میں زمانے نے کئی رنگ بدلے تھے۔ جائداد کا قضیہ غالب کیلئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن اب جن سے تنازعہ تھا۔ وُہ ہی نہ رہے تھے۔ اور ان کی لاکھوں کی جائدادیں نذرِ فنا ہوگئی تھیں۔ مرزا بھی اپنی قسمت پر قانع ہو چلے تھے۔ یہ درست ہے کہ جب ان کے تعلقات کسی انگریز افسر سے بڑھتے۔ اور منزل گم گشتہ کی ایک جھلک نظر آتی۔ تو وہ ایک نئی عرضداشت گورنمنٹ اوف انڈیا کے پاس بھیج دیتے۔ اور پنجاب گورنمنٹ کے ریکارڈز میں ایسی کئی عرضیاں محفوظ ہیں لیکن ان کوششوں اور انکی جسم وجان کی بازیوں میں بہت فرق تھا۔ اور اب اگر عرضیاں داخلِ دفتر ہوتیں تو مرزا بہت مایوس نہ ہوتے۔ مرزا اب اپنے ماہوار مشاہرے سے مطمئن ہو چلے تھے۔ اور غالباً چند احباب و عزیز کی اولاد کو درس دینا بھی شروع کر دیا تھا۔ ان کی تصانیف ملک میں عام ہو چکی تھیں۔ اور ان کی قبولیت سے ان زخموں کا اندمال ہوتا تھا۔ جو تلاشِ روزگار میں کھائے تھے۔

مالی حالت ان کی بہت اچھی نہ تھی۔ لیکن سرکاری طور پر جو رقم ملتی۔ اور جو کچھ احباب کی عنایت سے حاصل ہو جاتا۔ مرزا اس سے مطمئن تھے۔ اور اپنے ذرایع آمدنی بڑھانے کیلئے بہت بیقرار نہیں تھے۔

چنانچہ جب ۱۸۴۲ء میں طامسن کالج میں فارسی کی پروفیسری کیلئے انہیں بلایا گیا۔ تو وہ چونکہ اپنے تئیں جاگیردار سمجھتے تھے۔ ملازمانہ طریقے سے حکام گورنمنٹ سے ملنا انہوں نے قبول نہ کیا۔ اور یہ ملازمت نہ لی۔ بعض لوگ حیران ہیں کہ مرزا جو عام مجسٹریٹوں اور متصدیوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے اور خوشامد و تملق کا کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ وہ چیف سکرٹر کے استقبال نہ کرنے سے کیوں اسقدر چراغ پا ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا مداحیہ قصائد میں جو ایک طرح کا مبالغہ روا رکھتے۔ اسے وہ ایک شاعرانہ رسم سمجھتے تھے۔ جسکے شروع سے سب شاعر پابند چلے آئے ہیں۔ وہ طبعاً خوددار اور حساس تھے۔ اور وضعداری کے تمام اصولوں کا دھیان رکھتے تھے۔

ان دنوں انکے تعلقات سر سید احمد خاں اور انکے بھائی سید محمد خاں سے بڑھے۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء میں ان کا منتخب دیوان ریختہ جیسا کہ مولوی کریم الدین کے تذکرۃ الشعراء سے پتہ چلتا ہے۔ ان بھائیوں کے پریس سید المطابع سے چھپ کر شایع ہوا۔ فارسی دیوان بھی اس سے تین چار سال بعد شایع ہوا۔ چنانچہ سپرنگر نے بادشاہ اودھ کے کتب خانے کی جو فہرست مرتب کی تھی۔ اس میں دیوان غالب کا جو نسخہ ہے۔ اس کی تاریخ طباعت ۱۸۴۶ء ہے ظاہر ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت سے مرزا کی شہرت جہاں پہلے نہیں پہنچی تھی۔ پہنچ گئی ہوگی۔ اوران کا بلند مرتبہ سب تسلیم کرنے لگے ہونگے۔

علاوہ ازیں ان دنوں دہلی میں جا بجا مشاعرے ہو رہے تھے۔ جن میں فارسی اور اردو غزلیں پڑھی جاتیں۔ مرزا سب میں تو نہ جاتے تھے۔ لیکن جن مشاعروں کا انتظام نواب ضیاء الدین کرتے ان میں نواب زین العابدین عارف آکر کھینچ لے جاتے۔ مرزا نے ان مشاعروں میں چند ایک غزلیں پڑھیں۔ جن میں چند ایک کے اشعار ہم انتخاب کرتے ہیں:۔

ہر چہ فلک نخواستست ہیچکس از فلک نخواست	ظرف فقیہ می نجست بادہ بانگ نخواست
غرقہ بموجہ تاب خورد تشنہ ز دجلہ آب خورد	زحمت ہیچ یک ندا و راحت ہیچ یک نخواست
جاہ ز علم بیخبر علم ز جاہ بے نیاز	ہم محک تو زر ندید ہم زر تو محک نخواست

شحنۂ دہر بر ملا ہر چہ گرفت پس ندارد　　کاتب بخت در خفا ہر چہ نوشت حک نخواست
بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں　　کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست
گشتہ درانتظار پدر دیدۂ پیرہ سفید　　در رہ شوق ہمرہی دیدۂ مردمک نخواست

سہل شمرد و سرسری تا تو زعجز نشمرے
غالب اگر برادری داو خود از فلک نخواست

اس مشاعرہ میں جو طرحی غزل انہوں نے پڑھی اس کے دو شعر بہت پُرلطف ہیں :-

چہ عیش از وعدہ چوں باور ز خوانم نمی آید　　بہ نوعے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

و بیرم شاعرم رندم ندیم شیوہ ہا دارم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید

انہوں نے عرفی کے مصرعہ پر جو قصیدہ "گریستن" کی ردیف میں لکھا ہے وہ بھی نواب ضیاء الدین کے دیئے ہوئے مصرعۂ طرح پر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس مشاعرہ میں یہ پڑھا گیا۔ اس میں میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی علالت کی وجہ سے نہیں آئے تھے۔ اور چونکہ فارسی کے قدرداں تھوڑے ہی لوگ تھے۔ مرزا شش و پنج میں تھے۔ کہ پڑھیں یا نہ کہ مولینا صدر الدین آزردہ جو ابھی نہیں آئے تھے۔ آپہنچے چنانچہ مرزا ایک خط میں نواب مصطفیٰ خاں کو جنہیں وہ مشاعروں کے حالات میرٹھ بھیجا کرتے تھے۔ لکھتے ہیں۔" بندہ را در زمین گریستن نگارش قصیدہ اتفاق افتادہ بود۔ آں مے سنجیدم کہ ایں ورق را چوں برات نامقبول بازبرم و ریختہ گویاں را دردِ سر ندہم۔ کہ آمدن حضرت آزردہ دل بجود بالید و زمزمۂ دستوری یافت"۔ چنانچہ وہ قصیدہ مشاعرے میں پڑھا گیا۔ اور جیسا کہ یادگارِ غالب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ بہت پسند ہوا۔

مرزا نے عرصے سے اردو شاعری ترک کر رکھی تھی۔ اور ۱۸۴۳ء کے ان مشاعروں میں جنہیں دوسرے شعرا تو اردو غزلیں پڑھتے مرزا نے فارسی اشعار ہی پڑھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۹ء میں گاہے گاہے انہوں نے اردو غزلیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ جب نواب جعفر علی خاں نسیم

نے اس سال مشاعرہ منعقد کیا۔ اور ذوقؔ۔ مومنؔ اور غالبؔ کو دعوت دی۔ تو انہوں نے ساری غزل ہی پڑھی تھی۔

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

اسی زمانے میں انہیں نواب تجمل حسین خاں رئیس فرخ آباد سے دعوت آئی ہوئی تھی۔ مرزا نے لگے ہاتھوں غزل میں ان کی بھی تعریف کر دی ہے

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے !
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

اس کے علاوہ مرزا نے مختلف موقعوں پر فارسی قصائد اور قطعات بھی بکثرت لکھے ہیں۔ جب مسٹر جیمس طامسن جنہوں نے مرزا کی جاگیر کا سوال نئے سرے سے ہلانا چاہا تھا آگرے کے گورنر ہوئے۔ تو مرزا نے اس موقعہ پر دس شعر کا ایک نفیس قطعہ لکھا تھا جس کا پہلا شعر ہے۔

ہوا عبیر فشاں است و ابر گوہر بار
جلوس گل بسریر چمن مبارک باد

عموماً یہ قطعات مدحیہ ہوتے تھے۔ اور اکثر کسی مقصد کو پیش نظر رکھکر لکھے جاتے۔ لیکن ۱۸۴۶ء میں جب انگریزوں نے سکھوں کو شکست دیکر پنجاب فتح کیا۔ تو مرزا نے اکیس شعر کا ایک فارسی قطعہ لکھا ہے جو نہ کسی کی تعریف میں ہے اور غالباً نہ ہی کسی کو بھیجا گیا۔ اس میں سکھ فوج کے خلاف زہر اگلا ہے۔ سرسید کی کتاب "آثار الصنادید" سے پتہ چلتا ہے کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چند احکام کے خلاف مولانا سید احمد بریلوی نے جہاد کا اعلان کیا۔ تو دہلی میں بہت سے لوگ انکے ہمخیال تھے۔ مہاراجہ کے فرانسیسی جرنیلوں کے خلاف تو مولانا اپنے ساتھیوں کے نفاق کیوجہ سے کامیاب نہوئے۔ لیکن جب ۱۸۴۶ء میں خالصہ افواج کو انگریزوں نے شکست دی۔ تو دہلی کے مسلمان بہت خوش تھے۔ چنانچہ قرینِ قیاس ہے کہ مرزا نے بھی یہ قطعہ اسی وقت لکھکر دل کا غبار نکالا۔

انہوں نے اس موقعہ پر جو پر کیف قصیدہ لارڈ ہارڈنگ کی تعریف میں لکھا ہے۔ وہ بھی بہت پرلطف ہے۔ اس میں لکھتے ہیں۔ کہ اگر میں جوان ہوتا تو "حصولِ ثواب" کی نیت سے سکھوں کے خلاف لڑائی میں شریک ہوتا۔ لیکن پنجاب کا امن و اماں انہیں جس چیز کیلئے عزیز ہے۔ وہ کشمیر کی شراب ہے! ۵

گزاف شیوۂ من نیست راست میگویم	دریں زمانہ مرا بودی ارزمانِ شباب
پئے شکستن کفار بستمے بہ نبرد	کمر بہ سرخوشئ نیتِ حصولِ ثواب
کنوں کہ ملک مطیعست وراہ بجیس وخار	ز من بگو بطرو تشندگان بادۂ ناب
شراب قندئ ہندوستان مانم سوخت	زشیرہ خانۂ کشمیرم آورند شراب

ادبی نقطۂ نظر سے اس زمانے کی اہم ترین تصنیف ان کی فارسی مثنوی "ابر گوہر بار" ہے۔ حالی کے خیال میں یہ ان کی آخری عمر کی تصنیف ہے۔ لیکن جب ۱۸۴۵ء میں سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید لکھی۔ تو اس وقت یہ مثنوی ۱۵۔۱۶ جزو کے قریب ہوچکی تھی۔ اور اس سے زیادہ اب بھی نہیں ملتی۔

حقیقت میں مرزا کا ارادہ شاہنامہ کا جواب لکھنے کا تھا۔ اور ان کا خیال تھا کہ جس طرح فردوسی نے رستم کی لڑائیوں کی داستان لکھی ہے۔ وہ ابتدائے اسلام کے جنگوں کو مثنوی کی صورت میں بیان کریں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

زفردوسیم نکتہ انگیز تر	زمرغ سحر خواں سحر خیز تر
خرد بردل شمع ساسانیاں	بود صبح اقبال ایمانیاں
رقم سنج منشور یزدانیم	زایمانیاں گویم ایمانیم
کسے راکہ نازد بہ بیگانگاں!	خرد در شمار د ز دیوانگاں
باقبال ایماں و نیروئے دیں	سخن رانم از سید المرسلین

لیکن انہیں یہ ارادہ پورا کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ اور وہ حمد و نعت و منقبت اور ابتدائی ساقی نامہ سے زیادہ نہیں لکھ سکے۔ ان کا نعت کا حصہ صاف اور موثر زبان میں ہے۔ اور اسمیں

چند نئے مضامین بھی پیدا کئے ہیں مثلاً

از خونیکہ در کربلا شد سبیل
ادا کرد دام زمان خلیل

یا معراج کے متعلق لکھا ہے۔

بدور تو شد لن ترانی کہن — فصاحت مکرر نگنجد سخن
ترا خواستگار است یزدان پاک — ہر آئینہ از لن ترانی چہ باک

ساقی نامہ میں انہوں نے بچارے نظامی کا مذاق اڑایا ہے۔ چنانچہ ساقی سے خطاب کیا ہے

بیا ساقی آئین جم تازہ کن — طراز بساط کرم تازہ کن
مبادا نظامی ندامت برد — بدستاں سوئے خانقاہت برد
فریبش مخور رحیوں مے آشام نیست — ستمدیدۂ گردش جام نیست
ورع پیشہ مسکین چہ داند ترا — بہ آرائش نامہ خواند ترا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ساقی نامہ بہت پھیکا ہے۔ اور عام مثنوی میں بھی مناجات اور معراج کے آخری حصہ میں جو شاعری کا بلند معیار انہوں نے قائم کیا ہے۔ اسے وہ بالعموم نباہ نہیں سکے اسکی وجہ ایک یہ ہے کہ مضمون میں چند ایسی اصولی مشکلات تھیں، جن کی وجہ سے شاعرانہ شوخی اور مبالغہ کی اس میں گنجائش نہ تھی۔ اور یہ تمام نظم انہوں نے رک رک کر لکھی ہے۔ چنانچہ وہ خود اس مثنوی کے آخری حصہ میں لکھتے ہیں۔

دریں رہ بسیچ سفرہا بسیست — بود راست لیکن خطرہا بسیست
ببزمے کہ در وے بود اجتناب — ز رود و سرود و شراب و کباب
سخنور چہ گفتار بیش آورد — کزاں رنگ بر روئے خویش آورد
دریں بزم بو باش را بار نیست — مے و ساغر و زخمہ و تار نیست

بہت ممکن ہے کہ مثنوی کی نامکمل رہنے کی ایک وجہ مضمون کی مشکلات ہوں۔ ویسے اس زمانے

میں چوسر کے ساتھ کچھ بد کر کھیلنے کی بدولت اُن پر ایک حادثہ بھی ایسا گذرا تھا جس کی وجہ سے ممکن ہے کہ ان کے کئی ارادے نامکمل رہ گئے ہوں۔ ۱۸۴۷ء میں چوسر کی وجہ سے مسٹر ڈرا یونس مجسٹریٹ دہلی کی عدالت میں ان پر جو فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ اسکی تفصیلات بمبئی کے احسن الاخبار مورخہ ۲۵ جون ۱۸۴۷ء میں شایع ہوئی تھیں۔ اور چونکہ اس سے زیادہ مکمل اس واقعہ کی تفصیلات اور کہیں نہیں ملتیں۔ ہم متعلقہ اندراج تمام کا تمام درج ذیل کرتے ہیں۔

"دہلی ۱۵ جمادی الثانی۔ مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار کر لیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی۔ کہ ان کو رہا کر دیا جاوے۔ یہ معززین شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب جیکلا بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش کی اجازت نہیں دیتا۔" معلوم ہوتا ہے بادشاہ کی سفارش کارگر نہ ہوئی۔ اور مرزا کو جرمانہ اور قید کی سزا ہو گئی۔ چنانچہ اسی اخبار کی اشاعت مورخہ دوم جولائی ۱۸۴۷ء میں لکھا ہے " مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ جاری تھا۔ اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ نہ ادا کریں۔ تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپیہ زیادہ ادا کئے جائیں۔ تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے۔ تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مصیبت اور مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سشن جج صاحب بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو۔ تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے۔ بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جسکی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ معمولی سے جرم میں ایسی سخت سزا دیجائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔

غالب ایک تو اس زمانے میں بیمار اور کمزور تھے۔ دوسرے ایک معززادہ خاندانی آدمی کیلئے اس طرح جیل میں جانا انتہائی توہین اور بے آبروئی تھی۔ ان پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ مولوی کریم الدین تذکرۃ الشعرا میں لکھتے ہیں: "ان دنوں سرکار کی طرف سے ان پر ایک بڑا حادثہ گذرا ہے جن کے سبب سے انہیں رنج لاحق ہے۔" اور تفتہ کے نام بھی انہوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ یہ بہت بڑا دھبہ رہگیا۔ قید کے زمانے میں انہوں نے ایک مشہور حبسیہ ترکیب بند لکھا تھا۔ جسے ہم نے تمام کا تمام حصۂ انتخاب میں نقل کیا ہے۔ اس ترکیب بند سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس مصیبت کے وقت نواب مصطفیٰ خاں نے انکی بڑی مدد کی۔ اور مرزا نے نواب مصطفیٰ کی تعریف میں جو زبردست فارسی قصیدہ لکھا ہے۔ اسمیں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

بشنود بے آنکہ باد آں را برد
نالہ گر در کنج زنداں می زنم

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کو قید کی پوری میعاد بھگتنی نہیں پڑی۔ اور قریباً تین مہینے کے بعد ہی رہا ہوگئے۔ رہائی کے بعد وہ بہادر شاہ کے مرشد کالے خاں صاحب کے مکان پر مقیم تھے۔ اور انہیں کی وجہ سے دربار میں باریاب ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ باریابی سے پہلے وہ بہت سے قصیدے کسی کی معرفت دربار میں پیش کر چکے تھے۔ اور وہاں سے انہیں تحفے تحائف بھی جاتے تھے۔ لیکن ابھی باریابی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ چنانچہ ایک فارسی قصیدہ میں لکھتے ہیں۔

شہنشاز غم دوریٔ درت کارم	بداں رسیدہ کہ بیمرگ جاں دہم ناگاہ
بیاد گہ نرسم خانۂ سپہر خراب	ندیم شاہ نشوم روئے روزگار سیاہ
چہ سرکنم روشِ مدح گستری چوں مرا	بزم خسروِ گیتی ستاں نباشد راہ

ایک اور فارسی قصیدہ میں دربار سے دور رہنیکی نسبت لطیف اشارہ ہے۔

خواہیم قرب شاہ ولیکن دریں مراد
عبرت زنا مرادیٔ سنجر گرفتہ ایم

معلوم ہوتا ہے۔ کہ ذوق اور اس کے معاونین (مثلاً نواب حامد علیخاں) مرزا کی کوششوں میں روڑے اٹکاتے تھے۔ چنانچہ مرزا کا وہ فارسی قطعہ جس کا ذیل کا شعر بہت مشہور رہے۔ اور جس میں سوائے ذوق کے کوئی اور مخاطب معلوم نہیں ہوتا۔ اسی زمانے کی یادگار ہے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است

اسی زمانے میں انہوں نے بہادر شاہ کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھا تھا۔ جس میں کئی شعر اپنی حالت کا بیاں معلوم ہوتے ہیں۔

گفتم حدیث دوست بقرآں برابرست	نازم بہ کفر خود کہ بایماں برابرست
گو چرخ دشمنی مکن و بخت سرکشے	خود خواہش محال بہ حرماں برابرست
با چارہ گر بگوئے کہ تیمار بیش کش	در دیست در دلم کہ بدرماں برابرست
زیں موج خوں کہ می گزرد دمبدم زسر	دستار من بہ لالۂ نعماں برابرست
کینہائے آشکار کہ سر جوش نازاوست	در ذوق با نوازش پنہاں برابرست
نے وعدۂ نہ پرسش رازے نہ شکوۂ	داغم زنامہ کہ بہ عنواں برابرست
نے کف گرفتہ ساعد نی لب بودہ بوس	در ناخوشی وصال بہ ہجراں برابرست

پیوستہ پرفشاں و نہ جستہ ز آشیاں

پرواز من بہ جنبش مژگاں برابرست

اس قصیدہ میں غالبا ذوق کی طرف اشارہ ہے۔

بالدبخویش خواجہ چو گوئی سخنورش	غافل کہ ایں ترانہ بہ بہتاں برابرست
نے ہر ترانہ سنج نکیسا نوا بود	نے ہر سخن سرائے بہ سحباں برابرست
نے ہر شتر سوار بہ صالح بود ہمسال	نے ہر شباں بموسیٰ عمراں برابرست
نے ہر کہ گنج یافت ز فرو ز گولی برد	نے ہر کہ باغ ساخت رضواں برابرست

اخیر میں اپنی محرومئ قسمت کی طرف اشارہ ہے۔ اور بادشاہ سے عفو تقصیر کی درخواست کی ہے۔

با آنکہ بر سریر شہ افشاندہ ام ز کلک — ایں نکتہ ہا کہ بادُر و مرجاں برابرست

اینک مرا ز خجلت گفتار نارسا — جوش عرق بموجۂ طوفاں برابرست

پوزش پذیر و مکرمت انکار کن توام — خود یک نگہ بہ لطف نمایاں برابرست

آرے قبول عذر گنہ از گنہگار — با صد ہزار بخشش و احساں برابرست

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ان قطعات و قصائد میں کونسے قید سے پہلے لکھے گئے تھے۔ اور کونسے بعد میں۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ دربار میں باریابی بہادر شاہ کے مرشد شاہ نصیرالدین عرف کالے شاہ صاحب کی وساطت سے ہوئی۔ چنانچہ مرزا مہر نیمروز کے آغاز میں لکھتے ہیں:-

"پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزیٔ رفتار من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت۔ و خانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد۔ بفروغ ازاں فرۂ ایزدی کہ فریدوں را بفرتاب داوری دل افروخت و مرا فرہنگ سخن گستری آموخت۔ بداں درفرودم آورند کہ تو نیز چوں حلقہ چشمے بداں در داری و نتوانی کہ دیدہ برداری۔ دیوار کاخ والا پایۂ ہما۔ ایہ بیدار دل دیدہ ورقدسی سرشت گہر جادہ شناس راہ سیر و سلوک و راہ نمائے جادۂ فقر و فنا مشاہد شہود شاہد یقین مولانا محمد نصیرالدین را نازم کہ ہر کہ بسایۂ آں دیوار ہمایوں آثار گام زند۔ نشگفت کہ سایۂ خویش در فرودسر افگند۔ نخستہ آیۂ رحمت کہ برمن از بالا فرود آمد رود اوں انجستگی زمیں بوس گیہاں خدیو خدا داں بود۔ دولت روئے آور بخت از خواب جست"

حضرت کالے شاہ کی کوشش سے یہ تو ہوا۔ کہ مرزا دربار میں باریاب اور بہادر شاہ کے مرید ہو گئے۔ وہ دربار میں حاضر ہوتے۔ قصائد اور نظمیں پڑھتے۔ اور انعام اور خلعت پاتے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود انہیں دربار شاہی سے کوئی مستقل تعلق نہیں تھا۔ اور پیٹ کا دھندا ابھی باقی تھا۔ یہ تعلق بادشاہ کے مدارالمہام احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کی مہربانی سے پیدا ہو گیا۔ احترام الدولہ مرزا کی فارسی نثر کے بڑے مداح تھے۔ چنانچہ جب بہادر شاہ کو شاہان تیموری کی تاریخ

لکھوانے کا خیال پیدا ہوا۔ تو انہوں نے غالب کو بلا کر یہ کام اسکے سپرد کر دیا۔ مرزا مہر نیمروز میں لکھتے ہیں:۔ "اگر در شرع روا بودے گفتمے۔ کہ شاہ سکندر است و حکیم ارسطو ہمانا بلند نامی سلطان و بہرور آفاق چشم داشت۔ کہ چوں منے را کہ بہ جادو بیانی شہرہ آفاقم بکردار گذاری گماشت من خود ازاں رو کہ دل و زباں ایں بیدار مغز آئینہ دار دل و زبان شاہ است دانم کہ آنچہ عمدۃ الحکما دریں باب بمن فرمودہ فرمان شاہ است۔" چنانچہ بادشاہ نے حکیم صاحب کی تجویز پر صاد کیا۔ اور ۴ر جون ۱۸۵۰ء کو مرزا نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب اور خلعت سے سرفراز ہوئے اور چھ سو روپیہ سالیانہ پر شاہان تیموریہ کی تاریخ نویسی پر مامور ہوئے۔

لال قلعہ

۱۸۵۰ء کا سال مرزا کے لئے بہت مبارک سال معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی سال وہ ولی عہد شاہ شہزادہ فتح الملک کے استاد مقرر ہوئے۔ اور چار سو روپیہ سالانہ ان کا مشاہرہ مقرر ہوا۔ ولی عہد نے داغ کی والدہ یعنی نواب شمس الدین کی بیوہ سے شادی کی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ مرزا کی ادبی شہرت بہت مستحکم ہوگئی ہوگی۔ جو ولی عہد نے تمام پچھلے واقعات سے چشم پوشی کرکے مرزا کو استاد چنا۔ ولی عہد کی تعریف میں مرزا نے چند قطعات اور تین بلند پایہ فارسی قصائد لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک کی تشبیب تو ہم "روزِ ازل" کے عنوان سے دوسرے حصہ میں دینگے۔ دوسرا قصیدہ رودکی کے قصیدے کی بحر میں ہے۔

داورِ سلطاں نشاں آید ہمی	سرورِ گیتی ستاں آید ہمی
شہریاراں نکتہ داناں بودہ اند	شہریارِ نکتہ داں آید ہمی
شہریاری باجوانی خوشتر است	شہریارِ نوجواں آید ہمی

تیسرے قصیدے کے کئی شعر تغزل کے نقطۂ نظر سے بہت پُرلطف ہیں۔

فریبِ پرسشِ پنہاں نگر کہ من ہمہ عمر | بذوقِ وصل زبد ساختم بہجرانش
کسم بہ خود نہ پذیرفت و دہر بازم بُرد | چوں نامہ کہ بود نانوشتہ عنوانش
ازاں بہ گلشنِ گیتی نشاط میورزی | کہ بوئے زہر ہمی نشنوی زریحانش

ویسے مرزا کی یہ خوش قسمتی عارضی تھی۔ کیونکہ ولیعہد دو سال بعد چل بسے۔ اور اگرچہ ادبی نقطۂ نظر سے درباری تعلقات نیک پھل لائے۔ کیونکہ ایک تو مرزا کے اردو خطوط کا آغاز اسی زمانے سے ہوا[1] اور وہ مرزا کے ایوان شہرت میں مضبوط ترین ستون ہیں۔ دوسرے ان تعلقات کی وجہ سے مرزا کو فارسی چھوڑ کر اردو غزلیں لکھنی پڑیں لیکن ذوق سے معاصرانہ کشمکش باقی تھی۔ اور دسمبر ۱۸۵۱ء میں ہی سہرے کا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ آبِ حیات میں اس قضیے کی تمام تفصیلات درج ہیں۔ اور غالب نے انور الدولہ نواب سعد الدین خاں شفق کے نام ایک خط میں بھی اسکے متعلق ذکر کیا ہے۔" از دیرباز سرودستانسرائی اردو ندارم۔ ہمانا از رضاجوئی شہریار سلیماں پیشکار است گاہ گاہ ناگاہ رنگ ریختہ ریختن و یژہ بفرمان بانوی بلقیس پرستار است وریختہ بدیں ردیف نارواول آویختن مگر در مقطع غزل سرمستانہ ہوئے زدہ باشم آں یکے کہ گمانِ کمالے کہ نداشت داشت پنداشت کہ روئے سخن سوئے اوست۔ در مقطع غزلیکہ سرود بہنجار ستیزہ گام زدو دانست کہ گفتار مرا پاسخ سازد من لبستیِ ایں نہ جرعہ کہ فرد ریختہ خامۂ من است ع

---

[1] ۔ حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے۔ کہ مرزا کو اردو خط و کتابت ۱۸۵۰ء میں شروع کرنی پڑی جب وہ ہمہ تن "مہر نیمروز" کے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ ہم بتا چکے ہیں (اور مرزا کے اپنے فارسی خطوط ہی اس امر کا بیّن ثبوت ہیں) کہ مرزا نے آسان اور سادہ خطوط نویسی کے جو اصول اپنے رسالۂ خطوط نویسی میں بتائے تھے۔ ان پر خود جہاں تک فارسی خطوط کا تعلق ہے۔ کبھی عمل نہیں کیا۔ لیکن اردو میں انہوں نے جو خطوط لکھے ہیں وہ بے تکلف اور "سخن آرائی" سے پاک ہیں۔ وہ خود منشی نولکشور کو لکھتے ہیں " در پارسی زبان بسا سخن گفتہ ام و سر نامہ ہا نگاشتہ۔ اکنوں کہ دل از ناتوانی سگالش بر نمی تابد۔ کار بر خود آساں کردہ ام و ہر چہ می باید منبشت۔ در اردوی نوسیم گوئی گفتار در نامہ فرو می پیچیم و بہ دوست میفرستم۔ حاشا کہ در اردو زبان نیز سخن آرائی و خود نمائی آئین باشد۔ آنچہ بازدیکاں تواں گفت۔ بہ دوراں نوشتہ میشود"

ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است
سر بسخن فرو دنیا وردم و قطع نظر از دلیل قطعی امتیاز شمردم"۔

اسکے بعد نہایت متاسفانہ انداز سے اپنی ناکامیوں پر آنسو بہائے ہیں "آہ از من کہ مرا زیاں زدہ و سوختہ خرمن آفریدند نہ بآئین نیاکان خویش سلطان سنجر دارائے کلاہ و کمرے دنہ بفرہنگ فرزانگان پیش بوعلی آسا علم و ہنرے گفتم درویش باشم و آزادانہ رہ سپرم۔ ذوق سخن کہ ازل آوردہ بود۔ رہزنی کرد و مرا بدان فریفت۔ کہ آئینہ زدودن و صورت معنی نمودن نیز کارِ نمایاں است سرِ لشکری و دانشوری خود نیست۔ صوفیگری بگزار و بسخن گستری روے آر۔ ناگزیر ہمچناں کردم و سفینہ در بحر شعر کہ سراب است رواں کردم۔ قلم علم شد و تیرہائے شکستہ آبا قلم۔ یا خود بروزگار دیدہ ورے نبود یا بود و بمن نپرداخت ہمانا در تیرگیے روزگار من اندازہ شگرفیے کار من کس نشناخت فرجام کار اکنوں کہ دنداں فرو ریخت و گوش گراں گشت موی سپید است و روئے پُر از زنگ دست بلرزہ اندر ست و پائے در رکاب از اں ہمہ سودا کہ در سر بودن جاں کندنی و ناں خوردنی بمن ماند و بس۔ تا از آنچہ امروز کاشتہ ام فردا چہ دروم"۔

بہادر شاہ کے آخری سال بھی بہت اطمینان کے نہ تھے۔ نواب زینت محل شہزادہ جواں بخت کی ولیعہدی کیلئے کوشاں تھیں۔ لیکن اس میں کامیابی کی کوئی امید نہ تھی۔ اسکے علاوہ اسکی صحت بھی خراب تھی۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۵۱ء کو ریذیڈنٹ دہلی نے رپورٹ بھیجی کہ بادشاہ بیمار اور زندگی سے بیزار ہے۔ اور حج کے لئے مکہ معظمہ جانیکا ارادہ رکھتا ہے۔

مہر نیمروز یعنی تاریخ شاہان تیموری کا پہلا حصہ مارچ ۱۸۵۲ء سے کچھ پہلے مکمل ہوگیا اور ۱۸۵۵ء میں بادشاہ کے ایما سے فخر المطابع میں چھپ کر شائع ہوا۔ لیکن دوسرا حصہ لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اسکی وجہ معلوم نہیں۔ کیونکہ بادشاہی سلسلہ اس تصنیف کے پانچ چھ سال بعد تک قائم رہا۔ ممکن ہے کہ بہادر شاہ جو سادہ اور موثر طرز تحریر پسند کرتا تھا۔ اُسے مرزا کی ٹیڑھی ترکیبیں اور استعاروں اور تشبیہوں کے انبار میں اصل مطلب خبط کر دینا ناپسند ہوا ہو۔ اور اسنے

اس کی تکمیل غیر ضروری سمجھی ہو یہ صحیح ہے کہ مرزا کی فارسی نثر غلط ہندوستانی محاوروں سے پاک ہے۔ لیکن جہاں تک معنی کا تعلق ہے۔ اس پر انکی پیاز کی مثال صادق آتی ہے۔ کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں مغز کا نام نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ مہر نیمروز جو مغلیہ بادشاہوں کی تاریخ ہے اور جسکی تاریخی اہمیت اسوجہ سے کہ آخری مغلیہ بادشاہ کے زیر فرمان درباری مورخ نے لکھی۔ بہت ہونی چاہیئے کچھ بھی نہیں۔

۱۸۵۲ء میں یعنی جس سال مہر نیمروز مکمل ہوئی۔ مومن کا انتقال ہوگیا۔ مومن خود ایک بہت بلند مرتبہ شاعر تھا۔ اور مرزا کی طرح فارسی کا شائق۔ مرزا کو اس کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ جس کا اظہار انہوں نے فارسی رباعی میں بھی کیا ہے۔

شرطست کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر — خوں نابہ برخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگِ مومن — چوں کعبہ سیاہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

لیکن جس موت کا انہیں "مرگِ مومن" سے بھی زیادہ رنج ہوا۔ وہ نواب زین العابدین عارف کی وفات تھی۔ عارف غالب کی بیوی کے بھانجے تھے۔ اور چھوٹی عمر میں ہی خوب شعر کہتے تھے۔ مرزا کو وہ بہت عزیز تھے۔ اور ان کی نسبت انہوں نے ایک فارسی قطعہ بھی لکھا ہے۔

آں پسندیدہ خوی عارف نام — کہ رخش شمع دودمان منست
از نشاط نگارشِ نامش — خامہ رقاص در بنان منست
آنکہ در بزم قرب خلوت انس — غمگسار مزاج دان منست
زور بازوئے کامرانی من — راحت روح ناتوان منست

ان کے مرنے کا مرزا کو بہت افسوس ہوا۔ جس کا اظہار انہوں نے ایک نہایت دردناک مرثیے میں کیا ہے۔ مرحوم کے دو بیٹے تھے۔ حسین علیخاں اور باقر علیخاں۔ مرزا پہلے حسین علیخاں اور پھر باقر علیخاں ہر دو کو اپنے پاس لے آئے۔ اور انہیں بچوں کی طرح بڑے پیار سے پالا جس کا ثبوت انکے اردو خطوط سے بخوبی ملتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مرزا نے اودھ کے تین یا چار بادشاہوں کی تعریف میں قصیدے لکھے انہیں اس مدح کا صلہ پہلی مرتبہ ۱۸۵۲ء میں واجد علیشاہ کی طرف سے ملا۔ چنانچہ وہ مجتہد العصر کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔ " سہ شنبہ یازدھم ماہ صفر توقیع خدا ئگانی و پنجشنبہ سیزدھم ماہ عطیہ سلطانی تشریف ورود ارزانی داشت ...... چنیں ناخوش ہنگام کہ دیدہ بماتم مردم دیدہ سیاہ پوش وشہر از آشوب ستیز کفر و اسلام پرُخروش باشد۔ بندہ پروردن و بدیں خوبی کہ در حوصلہ امکان نگنجد کار را سرہ کردن اگر معجزۂ امامت و نیرد ئے ولایت نیست دگر چیست ناس خط پر تاریخ تحریر تو درج نہیں۔ لیکن اس میں ہنومان گڑھی کے واقعہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ جو ۱۸۵۲ء میں رونما ہوا۔ مجتہد العصر جن کے ایما پر غالب نے اردو مرثیہ کے تین بند بھی لکھے تھے۔ غالب کے قصائد دربار میں پڑھتے۔ غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ اودھ سے پانچسو سالیانہ مقرر بھی ہوا تھا۔ لیکن یہ بہت دیر تک ملنے نہیں پایا کہ اودھ کی سلطنت جاتی رہی۔ اور ۱۸۵۴ء میں اودھ کے آخری تاجدار واجد علیشاہ کلکتے بطور اسیر سلطانی کے بھیجدئیے گئے۔

ویسے مرزا کی زندگی اب نسبتاً آرام سے گزرتی تھی۔ مالی حالت بہتر تھی۔ قلعہ سے تعلق بھی پیدا ہو گیا تھا۔ شاہزادوں میں کوئی نہ کوئی ہر ہفتے مشاعرہ منعقد کراتا۔ وہ ان میں اردو غزلیں پڑھتے اور چونکہ ان کا موجودہ رنگ مقبول عام تھا۔ تعریفیں ہوتیں۔ ذوق سے بھی اب انکے تعلقات نسبتاً خوشگوار تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ مجلس برہم ہونی شروع ہوئی۔ مومن کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا اور اسکے تین سال بعد ذوق بھی چل بسے۔ مشہور شعرا میں اسوقت غالب کے سوا کوئی نہ تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۵ء میں بادشاہ کے اشعار کی اصلاح انکے سپرد ہوئی۔ لیکن اس اعزاز سے اور بھی اہم واقعہ دربار رام پور سے تعلق تھا۔ جس کا آغاز اسی سال ہوا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تعلق مولوی فضل حق صاحب کی وجہ سے پیدا ہوا۔ جنہیں نواب یوسف علیخاں کی علم پروری رام پور کھینچ لے گئی تھی۔ ان کے ایما پر مرزا نے اپنا دیوان اور ایک فارسی قصیدہ جس کا مطلع ہے۔

ہمانا اگر گوہر جاں فرستم ٭ بہ نواب یوسف علیخاں فرستم

نواب کی خدمت میں بھیجے۔ چنانچہ نواب انکے شاگرد ہوئے۔ اور گاہے گاہے انکی مالی امداد کرتے رہے۔ اس مالی مدد کے علاوہ اردوئے معلےٰ کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اگر غدر کے بعد نواب مرزا کی دستگیری نہ کرتے تو جہاں اتنے اور خاندانی لوگوں کی دریوزہ گری اور فاقہ کشی تک نوبت آئی تھی۔ وہاں مرزا کا بھی شاید یہی حال ہوتا اور اگر وہ غدر سے پہلے اپنا اردو دیوان رام پور نہ بھیج دیتے۔ تو چونکہ ان کا اپنا مجموعہ نواب ضیا ءالدین اور نواب حسین مرزا کے کتبخانوں کی تباہی کی وجہ سے تلف ہو گیا تھا۔ ناممکن نہ تھا کہ جس طرح ذوق اور آزاد کا بہت سا کلام اس ہنگامے میں جاتا رہا۔ دیوان غالب بھی اسی آگ کی نذر ہو جاتا۔

بادشاہ کے اشعار کی اصلاح مرزا نے دو تین سال کی ہوگی۔ اس سلسلہ میں انہیں بادشاہ کی طرف سے ملک الشعرا یا اس طرح کا کوئی اور خطاب نہیں ملا۔ اور ممکن ہے کہ بادشاہ ان کی طرز شاعری کا بہت مداح نہ ہو۔ حالی نے بھی ناظر حسین مرزا کی شہادت سے آزاد کے اس نظریے کی تائید کی ہے کہ بادشاہ کے استادوں کو ایک پھول اور ایک کلی سے گلدستہ بنا کر دینا ہوتا تھا۔ ظفر کی نسبت یہ بات بہت مشہور ہے۔ لیکن ظفر اور غالب کا کلام آج بھی موجود ہے۔ کلیات ظفر میں غالب کے صحیح رنگ کی ایک غزل نہیں۔ اور جب ہم کلیات ظفر کا عام معیار دیکھتے ہیں۔ تو یہ اظہار کہ اس میں مرزا کے نتائج فکر بھی شامل ہیں۔ مرزا کی شاعرانہ شہرت کے لئے بہت مفید معلوم نہیں ہوتا۔

غالب بادشاہ کے استاد تو ہو گئے تھے۔ لیکن اب سلطنت کا شیرازہ ہی بکھر رہا تھا۔ جب بہادر شاہ ۱۸۳۷ء میں بادشاہ ہوا تو اس سے کہا گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی پر بادشاہ کے جو حقوق ہیں ان سے وہ دستبردار ہو جائے۔ لیکن بہادر شاہ اپنی بیدست وپائی اور ضعیف العمری کے باوجود اپنے حقوق پر اڑا رہنے کا عادی تھا۔ وہ نہ مانا۔ لیکن اب اس کا انجام قریب نظر آرہا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۵ء میں فیصلہ ہوا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی خاندان کو قطب جانا ہوگا۔ نواب زینت محل کی اس فیصلہ پر ریذیڈنٹ سے بڑی جھڑپ ہوئی تھی۔ لیکن یہ فیصلہ برقرار رہا۔ اور اس کے دو سال بعد جب نئے ولیعہد کا تقرر ہوا۔ تو طے پایا۔ کہ ایک تو بہادر شاہ کے جانشین کو

بہادر شاہ سے پنشن کم ملیگی۔ دوسرے اس کا خطاب شاہ نہیں بلکہ شاہزادہ ہوگا۔ یعنی شاہی سلسلہ بہادر شاہ کی ذات کے ساتھ ختم ہو جائیگا۔[1]

مرزا حکام رس تھے اور ان باتوں سے بیخبر یا غافل نہیں تھے۔ ۱۸۵۲ء میں ہی جب بادشاہ بیمار تھے۔ تو وہ اپنے مستقبل کی نسبت متردد تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں ایک خط میں منشی ہیرا سنگھ کو لکھا ہے " از شب عید خاقان رنجور است۔ حالا دیگر چہ رُو نماید و بمن کہ در سایۂ دیوارش غنودہ ام چہ رود"۔ اب انہوں نے سوچا۔ کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ تو ختم ہو جائے گا۔ اپنا مستقبل انگریزی حکام سے وابستہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے فرمانروائے انگلستان ملکہ وکٹوریا کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھکر لارڈ کیننگ کی معرفت ولایت بھجوایا۔ اسکے ساتھ ایک عرضداشت تھی۔ کہ روم و ایران کے بادشاہ شعراء پر بڑی بڑی عنایتیں کرتے ہیں اگر شہنشاہ انگلستان مجھے خطاب اور خلعت اور پنشن سے سرفراز کرے تو عجیب نہ ہو۔ یہ تفصیلات مرزا کی اپنی زبان سے سنیئے۔ " درآں پوزشنامہ از آرزو آرزو بدیں انداز نشاں دادہ آمد کہ خسروان روم و ایران و دیگر کشور گیراں را با سخن گستران و ستائشگراں در بخشائش و بخشش رنگا رنگ شمار رفتہ و دہن بہ گہر انباشتن و پیکر بزر سنجتن و دہ دادن و گنج فشاندن بکار رفتہ ایں سخن گستر ستائش گر مہر خوانی از زبان شہنشاہ و سراپائے بفرمان شہنشاہ و نان ریزہ از خوانِ شہنشاہ میخواہد۔ ہمانا پایخواں مہر خواں و سراپا در تازی گفتار خطاب و خلعت و چم نان ریزہ در انگریزی زباں پنشن تواند بود"۔ غالب کو لندن سے اس خط کا جواب اخیر جنوری ۱۸۵۷ء میں مسٹر رسل برک کی طرف سے ملا۔ کہ درخواست پر تحقیق کے بعد خطاب اور خلعت وغیرہ کے متعلق حکم صادر ہوگا مرزا کیلئے یہ جواب بہت حوصلہ افزا تھا۔ اور وہ پتہ نہیں امیدوں کے کیسے کیسے قلعے باندھ رہے تھے۔ کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو غدر ہو گیا!

---

[1] غالباً اسی موقع پر ظفر نے لکھا تھا " اے ظفر باقی ہے تجھسے انتظام سلطنت بعد تیرے نے ولیعہدی نہ نام سلطنت

غدر کے دوران میں غالب کے حالات زندگی تلاش کرنے کیلئے ہمیں انکے خطوط اور قصائد میں
کسی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ اس زمانے کے مفصل حالات اُن کی کتاب دستنبو میں درج ہیں۔ سوانحی
دلچسپی کے علاوہ کتاب کی تاریخی اہمیت بھی بہت ہے۔ کیونکہ یہ کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ جو
شروع سے اخیر تک ان حالات میں شریک رہا۔ اور جس کی راست گوئی کے دوست دشمن سب
معترف ہیں۔ لیکن یہ خیال کہ اس کتاب میں تمام حالات صاف صاف اور آزادی سے لکھدیئے
گئے ہونگے۔ صحیح نہیں۔ مرزا خود ایک اردو خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو جو کتاب کی اشاعت کے
متعلق متامل تھے۔ لکھتے ہیں "ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجونگا۔ اور ایک بذریعہ انکے
جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کرونگا۔ اب سمجھ لو کہ طرزِ تحریر کیا ہوگی۔ اور صاحبانِ مطبع کو اسکا
انطباع کیوں نا مطبوع ہوگا" اس کتاب کی زبان مہر نیمروز سے نسبتاً صاف ہے۔ اور اگرچہ عربی
الفاظ ترک کرنیسے جابجا غیر متعارف الفاظ استعمال کرنے پڑے ہیں۔ شاعرانہ رنگ آرائیوں سے مطلب
خبط نہیں ہوتا۔ اس میں بیشتر تو ان حادثات کی تفصیل ہے۔ جو مرزا پر گزرے۔ لیکن اسکے علاوہ عام

حالات کا تذکرہ بھی مفصل ہے۔ شروع میں ابتدائی عبارت اور اپنے تذکرہ کے بعد اامئی ۱۸۵۷ء کے واقعات لکھے ہیں۔ جب میرٹھ سے باغی فوج دہلی آئی اور یہاں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اس میں موثر ترین حصہ بچوں اور عورتوں کے قتل کے متعلق ہے۔ جس کا مرزا کو بیحد قلق تھا۔ "ہیچ مشت خاکے نماند کہ از خون گل اندامان ارغوان زار نشد و ہیچ کنج باغے نبود کہ از بے برگی مانا بزخمۂ نو بہار نشد۔ ہائے آں جہانداراں داد آموز دانش اندوز نکو خوے نکو نام و آہ ازاں خاتوناں پری چہرۂ نازک اندام بارمے چوں ماہ و تنے چوں سیم خام و دریغ آں کودکانِ جہاں نادیدہ کہ در شگفتہ روئی بہ لالہ و گل میخندیدند و در خوشخرامی بر کبک و تدرو آہو میگرفتند کہ ہمہ یکبار بہ گرداب خوں فرو رفتند۔"

مرزا کو انگریز بیگناہوں کے قتل کا ہمیشہ افسوس رہا۔ چنانچہ غدر سے کئی سال بعد ایک اردو خط میں لکھا ہے: "انگریز قوم میں سے جوان رُوسیاہ کالوں کے ہاتھ قتل ہوئے۔ ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا۔ اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔"

اس قتل عام کے بعد جو لوٹ مار روا ہوئی۔ اس کی تفصیل دی ہے۔ "خسانیکہ بروز از بہر فرو رفتن خاک زمین می کافتند در خاک خردہ زر یافتند و کسانیکہ بشب در بزمے از آتش گل چراغ می افروختند در کلبۂ تار بداغ ناکامی سوختند زیور و پیرایۂ لولیاں شہر جز آنما یا کہ در گردن و گوش زن و دختر شبگرد ست ہمہ در کیسہ شبروانِ سیہ کار ناجوانمردست۔" اس قتل و غارت کے بعد باغیوں نے قلعہ کا رُخ کیا اور مرزا نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے بہادر شاہ کے اُس دعوٰی کی تائید ہوتی ہے۔ کہ وہ غدر کے دوران میں مجبور تھا۔ اور سیاہ کا حاکم نہیں بلکہ محکوم تھا۔ مرزا لکھتے ہیں "چوں شاہ سپاہ را نتوانست راند۔ سپاہ فرود آمد و شاہ فرو ماند۔

شاہ را درمیاں گرفت سپاہ — ویں گرفتن بود گرفتنِ ماہ

شاہ ماہِ گرفتہ را ماند — نہ کہ ماہِ دو ہفتہ را ماند

دہلی سے انگریزوں کا انتظام اٹھنے اور دوبارہ دہلی فتح ہونے تک جو حالات رُو پذیر ہوئے ان کی تفصیل نہایت مختصر ہے۔ اور فقط پانچ چھ صفحوں میں اس چار مہینے چار دن کی سرگذشت

ختم کردی ہے۔ کتاب کا زیادہ حصہ ان تکالیف کا بیان ہے جو فتح دہلی کے بعد انہیں اور ان کے عزیزوں کو پیش آئیں۔ اور جنہیں انہوں نے نہایت دلآویز طریقے سے قلمبند کیا ہے۔

۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ مرزا اس دن کی سرگذشت لکھتے ہیں۔

"کشور گیران شہر وارک سرتاسر گرفتند غوغائے زدوکشت وگیرودار تا بدیں کوچہ نیز رسید۔ وہمہ را از بیم دل دونیم شد باید دانست کہ ایں کوچہ جز یک راہ و بیش از دہ دوازدہ خانہ ندارد۔ از دو چاہ دریں کوئے نیست بیشتر از زن و مرد بدیں نورد کہ زن را بچہ در آغوش است و مرد را پشتوارہ بر دوش بدر زدند تنی چند کہ بجا ماندہ بہمہ شانئے من کہ از سخن پذیری گزیر نداشتم در از درون ببستند و پیرامن آں سنگ بسنگ بہم پیوستند تا کوچہ چنانکہ سربستہ بود دربستہ نیز شد۔"

اس قید خانے سے باہر شہر کی جو حالت تھی اسکی نسبت لکھتے ہیں۔ "درہمہ شہر از پانزدہم ستمبر ہر خانہ وہر کلبہ را در فرازست۔ وفروشندگاں وخرندگاں ناپیدا گندم فروش کجا۔ کہ دانہ خرندگانہ کو کہ جامہ بہ شستن بوے سپرند۔ گرا را کجا جویند کہ موئے سر سترد۔ پاکار را کجا یابند کہ پلیدی ببرد۔"

غالب اور انکے ساتھیوں کا باہر سے تعلق منقطع ہوا تو پانی وغیرہ کا سلسلہ بھی بالکل بند ہو گیا۔ "خورش و ناخورش از خورش ہر چہ حتے بود۔ خوردہ شد۔ وآب بداں کوشش کہ پنداری چاہ بناخن کندہ اند آشامیدہ آمد۔ دیگر در کوزہ وسبو آب ودر مرد وزن تاب نماند...... ودو شبانہ روز در تشنگی وگرسنگی گزشت۔"

جب دو دن اس طرح بے آب و نان گزر گئے۔ تو تیسرے روز خوش قسمتی سے مہاراجہ پٹیالہ نے حکیم محمود خاں اور ان کے عزیزوں کے مکانوں کی حفاظت کیلئے جو سپاہی بھیجے تھے۔ وہ آپہنچے۔ لوگوں کو جان کا ڈر تھا۔ وہ کچھ کم ہوا۔ تو انہوں نے سپاہیوں سے پانی کیلئے استمداد کیا۔ چنانچہ انہیں بازار کے سرے تک جانیکی اجازت ملی۔ اور ہر گھر سے ایک ایک دو دو آدمی خم وسبو اٹھائے پانی کی تلاش میں نکلے۔ لیکن میٹھے پانی کے کوئیں دُور تھے۔ اور وہاں تک جانا موت کو دعوت دینا تھا۔ ناچار ایک نمکین کوئیں سے ہی پانی بھر لائے۔ اور اس سے پیاس کی آگ بجھائی۔ لیکن نمکین پانی سے کہاں تسکین ہوتی ہے۔ لوگ نڈھال ہو رہے تھے۔ اور مرزا تسکین دیتے تھے۔ کہ جو ہمارا روزی رساں

ہے۔ وہ ہمیں بھلا ئیگا نہیں۔ چنانچہ مرزا لکھتے ہیں کہ ان کی دُعائیں قبول ہوئیں۔ ایک روز بادل آئے اور خوب مینہ برسا۔ لوگوں نے چادر باندھی۔ اور اس کے نیچے گھڑا رکھکر پانی جمع کیا۔ اور اپنی پیاس بجھائی۔ مرزا لکھتے ہیں۔" گویند ابر آب از دریا بر دارد۔ و بر روئے زمین فرو بارد۔ ایں بار ابر گراں مایہ ہماسایہ آب از چشمۂ زندگی آورد۔ ہر آنچہ سکندر دریا وشاہی جست۔ ایں تلخ کام شوراب آشام در تباہی یافت۔"

معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں کی وجہ سے مرزا کا گھر لوٹ سے تو محفوظ رہا۔ لیکن جو زیورات اور قیمتی چیزیں مرزا کے گھر سے کالے شاہ صاحب کے تہ خانے میں بھجوادی گئیں تھیں۔ وہ فتحمند فوج نے کھود نکالیں۔ علاوہ ازیں دستنبو سے پتہ چلتا ہے۔ کہ سپاہیوں کی روک ٹوک کے باوجود چند گورے ۵ اکتوبر کو دیوار پھاند کر اس محلے میں آداخل ہوئے۔ اور انہوں نے دوسرے چھوٹے چھوٹے گھروں کو چھوڑ کر مرزا کے گھر کا رخ کیا۔ مرزا کا بیان ہے۔ کہ انہوں نے مال اسباب کو نہیں اُٹھایا۔ البتہ مرزا عارف کے دو بچوں اور چند ہمسایوں کو قطب الدین سوداگر کی حویلی میں کرنیل براؤن کے سامنے لیگئے۔ جہاں چند سوال وجواب ہوئے۔ اور مرزا کو اسی روز گھر جانیکی اجازت مل گئی۔ اس واقعہ کی نسبت مرزا نے تو بہت کچھ سراحتاً نہیں لکھا۔ لیکن نواب غلام حسین خاں نے غدر کے متعلق جو حالات لکھے ہیں۔ اس میں مرزا کے متعلق ذیل کا اندراج ہے۔" مرزا اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ صاحب کے گھر میں چند گورے گھس کر ان کو گرفتار کرکے لے گئے اور کرنیل براؤن صاحب کے سامنے لیجاکر انکو پیش کیا۔ مرزا صاحب کی کچھ زندگی ابھی باقی تھی۔ اُنکے ایک دوست اتفاق سے اسوقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کی سفارش کرکے رہائی دلوائی [1]"

---

[1] غدر کا نتیجہ صفحہ ۶۵۔ اس کتاب کے مصنف کی نسبت ہمیں بہت واقفیت حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن کتاب کے شروع میں خواجہ حسن نظامی نے جو چند سطور لکھی ہیں۔ اُن سے خیال ہوتا ہے کہ مرزا غلام فخرالدین یعنی مرزا علی بخش کے صاحبزادہ سے مصنف کے" خاندان کے چند افراد" میں سے تھے۔ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کہ مرزا علی بخش کی ایک بہن یعنی عارف کی والدہ نواب غلام حسین سے بیاہی ہوئی تھی۔ شاید یہ وہی نواب غلام حسین ہوں۔

مرزا تو سخت جان تھے۔ ساٹھ برس کی عمر میں یہ مصیبتیں دیکھیں۔ اور بچ نکلے۔ لیکن ان کے بھائی مرزا یوسف اسقدر خوش قسمت نہ تھے۔ ان کا عرصے سے دماغ خراب ہو گیا تھا۔ اور غالب کے مکان سے دُور وہ علیحدہ مکان میں رہتے تھے۔ جتنا وظیفہ غالب کو سرکار سے ملتا تھا۔ اُتنا ہی انہیں ملتا تھا۔ ان کی بیوی اور بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ جب دہلی فتح ہوئی۔ تو قیامت کی طرح نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ان کی بیوی اور بچے انہیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ گھر پر ان کے ہاں ایک بوڑھی نوکرانی اور ایک بوڑھا دربان رہ گئے۔ مرزا کو بھی یہ اطلاع ملی۔ لیکن بے بس تھے۔ ایسی حالت میں کچھ نہ کر سکتے تھے۔ "کس فرستادن وآں سہ تن دکالارا بدینجا آوردن اگرچا دو دانستمے توانستمے" اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ بھائی کا فکر ان کے دل پر بھاری بوجھ تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں: "من ہمہ دربند آنم کہ برادرِ شب چوں خفت و بروز چہ خورد۔ دنا آگہی بداں پایہ کہ نمیتوانم گفت کہ زندہ است یا بسختی مرد۔" ۲۰ ستمبر کو جب انہیں اپنا دروازہ بند کئے ہوئے پندرہ سولہ دن ہو رہے تھے انہیں اطلاع ملی۔ کہ فوجی مرزا یوسف کے گھر آئے۔ اور سب کچھ لے گئے۔ لیکن اُنہیں اور بوڑھے نوکروں کو زندہ چھوڑ گئے۔

نواب معین الدین۔ جو مرزا کے دور رشتوں سے قریبی تھے۔ غدر کے حالات میں لکھتے ہیں۔ کہ مرزا اسداللہ خاں کا بھائی مرزا یوسف خاں جو عرصے سے مخبوط الحواس تھا۔ گولی کی آواز سن کر یہ دیکھنے کہ کیا ہو رہا ہے۔ گھر سے باہر آیا اور مارا گیا۔ لیکن مرزا کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ ۱۹۔ اکتوبر کو صبح کے وقت مرزا یوسف کا بوڑھا دربان آیا اور خبر لایا کہ مرزا یوسف پانچ دن کے مسلسل بخار کے بعد رات کو گزر گئے۔ مرزا کی حالت اسوقت بہت خراب تھی۔ ایک تو بھائی کی موت کا صدمہ۔ پھر میت کا انتظام بہت مشکل تھا۔ نہ کفن کیلئے کپڑا۔ نہ مردہ نہلانے کیلئے مُردہ شو۔ اور نہ قبر کھودنے کیلئے گورکن۔ اسکے علاوہ اگرچہ فتح دہلی کو ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا۔ شہر میں دو تین آدمیوں کا دوش بدوش چلنا ہی ناممکن تھا۔ شہر سے باہر میت لیجانے کی ہمت کسے پڑتی۔ لیکن مرزا کے ہمسایوں نے مرزا کی بیکسی پہ رحم کیا۔ اور تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ

ہوئے۔ چنانچہ پٹیالے کے سپاہیوں میں سے ایک آدمی آگے آگے چلا۔ اور مرزا کے دو نوکروں کو ساتھ لیکر میّت کو نہلایا۔ اور گھر سے جو دو تین چادریں لے گئے تھے۔ ان میں لپیٹ کر قریب کی ایک مسجد میں مرزا یوسف کو دفن کیا۔ دستنبو سے یہ امر واضح نہیں ہوتا۔ کہ آیا بھائی کی تدفین کے وقت مرزا موجود تھے۔ لیکن اگر وہ تھے بھی اور نمازِ جنازہ کا بھی کسی طرح انتظام ہو گیا۔ تب بھی مرزا یوسف کا انجام ان کی زندگی سے کم حسرتناک نہیں معلوم ہوتا۔

دریغ آنکہ اندر درنگِ سہ بیست[۶۰] | سہ دہ[۳۰] شادوسی سال ناشاد زیست
تہِ خاک بالیں زخشتش نبود | بجز خاک در سر نوشتش نبود
خدایا بریں مردہ بخشائشے | کہ نادیدہ در زیست آسائشے

معلوم ہوتا ہے۔ فتح دہلی کے بعد جو افراتفری مچی۔ وہ ایک دو مہینے میں ختم نہیں ہو گئی۔ جنوری ۱۸۵۸ء میں ہندوؤں کی آبادی کا حکم ہو گیا تھا۔ لیکن مرزا فروری ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں۔ کہ ابھی تک وہی حالت ہے۔ دن کو بیقرار رہنا اور رات کو اطمینان سے نہ سونا باقی ہے۔ اور اطمینان بھی کیسے ہوتا جبکہ مخبریوں اور گرفتاریوں کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ چنانچہ دوم فروری کو حاکم شہر چند سپاہیوں کے ساتھ غالب کے محلہ میں آیا اور حکیم محمود خاں کو جن کی موجودگی سے غالب اور دوسرے لوگوں کو بڑا سہارا تھا۔ دوسرے ساٹھ آدمیوں سمیت اپنے ساتھ لیگیا۔ وہاں وہ غالباً زیرِ حراست رہے۔ لیکن آبرو والوں کی آبرو کا بھی خیال رکھا گیا۔ حکیم محمود خاں اور چند دوسرے معززین کو تو تین روز کے بعد واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ اور چند آدمی ایک ہفتہ کے بعد رہا ہوئے۔ لیکن نصف سے زیادہ لوگ وہیں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس زمانے میں غالب کی جائے پناہ حکیم محمود خاں کا دروازہ تھا۔ شہر کے اور کئی معززین نے بھی حکیم صاحب کے ہاں پناہ لی تھی۔ اور حاکم شہر کے پاس کسی نے ان لوگوں کے خلاف مخبری کی تھی۔ لیکن حکیم صاحب ان لوگوں کی بیگناہی کے قائل تھے اور مہاراجہ پٹیالہ سے تعلقات کی وجہ سے جو کچھ ان کا اثر تھا۔ وہ انہوں نے بیگناہوں کو بچانے کے لئے صرف کیا۔ چنانچہ اپریل ۱۸۵۸ء میں باقی لوگ بھی رہا ہو گئے۔ حکیم محمود خاں کی یہی عالی ہمتی

تھی۔ جسکے متعلق حالی نے اپنے شاہکار مرثیہ محمود خاں میں لکھا ہے:۔

وہ زمانہ جبکہ تھا دلی میں اک محشر بپا — نفسی نفسی کا تھا جب چار و نطرف غل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا — باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا

موجزن تھا جبکہ دریائے عتابِ ذوالجلال
باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھکر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار — ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دوچار
یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار — شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار

آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اسکے شعلے سے کہیں سب خشک و تر

مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ — عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عذر خواہ
مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ — پر نہ تھا کوئی شفیع اُن کا کہ جو تھے بیگناہ

ایسے نازک وقت میں مردانگی اُسنے جو کی
اہل انصاف اُس کو بھولے ہیں نہ بھولینگے کبھی

بالیقیں جن ملزموں کو اُسنے سمجھا بےخطا — مارشل لا میں ثبوت اُن کی صفائی کا دیا
چین سے بیٹھا نہ جبتک ہو گیا اک اک رہا — جو کہ تھے نادار کی اُن کی اعانت برملا

زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانے، بےگھروں کو گھر دیا

مرزا نے دستنبو میں اپنے دوسرے دوستوں کی سرگزشت لکھی ہے۔ نواب ضیاالدین اور نواب امین الدین جس ہفتے شہر فتح ہوا تھا۔ اسی ہفتے اہل وعیال اور چند آدمیوں کیساتھ اپنی جاگیر لوہارو جانے کیلئے روانہ ہوئے۔ لیکن ابھی مہرولی ہی تھے۔ کہ لٹیرے سپاہیوں نے آگھیرا۔ اور بدن پر جو کپڑے تھے اُنکے سوا سب کچھ لیگئے۔ دہلی میں جو اُنکے گھر پر گذری۔ وہ اس سے بڑھکر تھی۔

"اینجا درخانہ وکاشانہ وکاخ وکلوخ ہرچہ بود بتاراج رفت۔ نہ از سیمینہ وزرینہ نام ونشاں ماند ونہ از گسترِدنی وپوشیدنی باندازۂ تارِ موئے درمیاں ماند۔" مظفرالدین حیدرخاں اور ذوالفقارالدین حیدرخاں (حسین مرزا) پر جو گزری وُہ اس سے بھی دردناک تھی۔ وہ شہر کے باقی معزز لوگوں کی طرح اپنے شاندار اور پُرشکوہ مکان چھوڑ کر جان بچا کر بھاگ نکلے تھے۔ جس طرح شہر میں اور گھر لُوٹے گئے۔ ان کے گھر میں بھی جھاڑو دی گئی۔ لیکن اوروں کے ہاں مکان تو سلامت رہے یہاں کسی نے مکان کے پردوں اور سائبانوں میں آگ لگا دی۔ چنانچہ لکڑی اور پتھر اور در و دیوار سب جلکر راکھ ہوگئے۔ نواب ضیاء الدین اور حسین مرزا کو جو مصیبتیں پیش آئیں۔ بہت دردناک تھیں لیکن ایک قابلِ افسوس بات یہ ہے۔ کہ اُن کی تباہی کی وجہ سے مرزا کا کلام ضائع ہوگیا۔ جوان کے ہاں جمع ہوتا تھا۔ چنانچہ مرزا غدر کے بعد ایک اردو خط میں لکھتے ہیں "بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی فارسی نظم ونثر کے مسودات مجھ سے لیکر اپنے پاس جمع کرلیا کرتے تھے۔ سو ان دونو گھروں پہ جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔" ہم لکھ چکے ہیں کہ ۱۸۵۵ئہ میں مرزا نے اپنے اردو کلام کا ایک نسخہ رام پور بھیجا تھا۔ وہ تو سلامت رہا۔ اور اسکی نقلوں سے ۱۸۶۱ئہ میں موجودہ اردو دیوان تیار ہوا۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ اگر مرزا نے اس کی نقل بھیجنے کے دو تین سال بعد تک کوئی اردو اشعار لکھے تو وہ اس میں موجود نہ ہونگے۔ اسی طرح کئی فارسی خطوط اور شاید اشعار بھی ضایع ہوئے ہونگے۔ مرزا ایک اردو خط میں لکھتے ہیں "پنج آہنگ" نامکمل ہے۔ اور اُس کے مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔"

مندرجہ بالا واقعات تو تمامتر "دستنبو" سے ماخوذ ہیں۔ لیکن مرزا نے اُردو واقعات میں اپنے باقی دوستوں پر اس پُرآشوب زمانے میں جو کچھ گزری اُسکی داستان قدرے تفصیل سے لکھی ہے۔ اور چونکہ مرزا کے بعض دوست ایوانِ ادب کے شاندار ستون تھے۔ ہم اُنکے حالات مرزا کے خطوط سے انتخاب کرکے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو غدر کے بعد سات سال قید کا حکم ہوا تھا۔ وہ ایک معزز جاگیردار

اور ارد و فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ اور اردو شعرا کا جو تذکرہ فارسی زبان میں انہوں نے "گلشن بیخار" کے نام سے لکھا تھا۔ اسکے صفحے صفحے سے اُن کا پاکیزہ ادبی مذاق ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے آزاد کی طرح واقعات کو نمک مرچ لگا کے پیش نہیں کیا تھا۔ اس لئے ان کا تذکرہ خواص کی آنکھ کی عینک ہے۔ آبِ حیات کی شہرتِ عامہ اسے حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن اُن کے مختصر فقرے بلاغت کی جان ہیں۔ اور جب اس تذکرہ میں اُن کی میانہ روی اور انصاف پسندی۔ جس کا گارسن دتاسی بہت مداح تھا۔ دیکھتے ہیں۔ تو یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کہ حالی کیوں کہتا تھا۔ کہ میں نے غالب سے بہت کم سیکھا ہے۔ اور میری تحریر کی سادگی اور سچائی اور صحیح ادبی مذاق کچھ تو طبعی تھا اور بیشتر شیفتہ کے فیضِ صحبت کا نتیجہ۔ مرزا نواب کی نثر اور شاعری اور مذاقِ شعر کے مداح تھے۔ اسکے علاوہ جو مہربانیاں ان پر قید کے دوران میں نواب نے کی تھیں۔ وہ بھی بھولی نہ ہونگیں۔ چنانچہ ان کی مصیبت دل پر ایک گہرا زخم تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "مصطفےٰ خاں کا حال سُنا ہو گا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے۔ ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس نازپروردہ میں کہاں؟" چنانچہ جب نواب کی اپیل کامیاب ہوئی۔ اور وہ رہا ہو گئے تو مرزا اس بے دست و پائی کے باوجود "بجز استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر" میرٹھ گئے۔ انہیں ملے۔ اور چار دن قیام کے بعد واپس آئے۔

مولانا مفتی صدرالدین آزردہ جو فارسی کے بلند پایہ شاعر اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ غدر سے پہلے دہلی میں صدر الصدور تھے۔ لیکن اسکے باوجود محفوظ نہیں رہے۔ مرزا ۱۸۶۲ئ کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "حضرت جناب مولوی صدرالدین صاحب بہت دیر حوالات میں رہے کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازرہِ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں"

افسوس ترین انجام مولوی فضل حق خیر آبادی کا ہوا۔ جو علاوہ اپنی علمی اور دینی قابلیت

کے اس لئے بھی یاد کے مستحق ہیں۔ کہ انہوں نے غالب کو بیدل کی تقلید سے روکا۔ اور اسکی شاعری کیلئے ایک "استادِ کامل" ثابت ہوئے۔ جو بقول میر تقی میر۔ مرزا کی شاعری کی نشوونما کیلئے ضروری تھا۔ غالباً انہیں کی نسبت یوسف مرزا کے نام ایک اُردو خط میں لکھا ہے "مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا۔ کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم ودام حبس بحال رہا بلکہ تاکید ہوئی۔ کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو..... ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہونا ہے۔ جو ہونا تھا۔ سو ہولیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔" مولینا دہلی سے رنگون جلا وطن ہوئے۔ لیکن مرزا کے دل سے فراموش نہیں ہوئے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں منشی داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں۔ "ہاں خانصاحب۔ آپ جو کلکتے پہنچے اور سب صاحبوں سے ملے ہو۔ تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کرکے مجھ کو لکھو۔ کہ اُسنے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے۔ کس طرح گذارہ ہوتا ہے۔"

مرزا خود تو ان مصائب سے محفوظ رہے۔ لیکن اُن کے لئے بھی یہ وقت قیامت کی گھڑی سے کم نہ تھا۔ ایک تو اپنا مستقبل تیرہ و تاریک پھر اتنے دوستوں کا غم۔ بھائی کی موت کا صدمہ۔ اس کے علاوہ اگرچہ وہ لکھتے ہیں۔ کہ انکے گھر سے کوئی چیز چھوئی نہ گئی۔ لیکن ان کی تمام قیمتی چیزیں جو ان کی بیوی نے حفاظت کے لئے کالے شاہ صاحب کے تہ خانے میں بھجوادی تھیں۔ وہاں سے نکال لی گئیں۔ مرزا لکھتے ہیں۔ کہ قسمیہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ پہننے اور بچھونے کے علاوہ اور کوئی چیز گھر میں نہ رہی چنانچہ وہ یہی اوڑھنے پہننے کے کپڑے بیچ بیچ کر پیٹ بھرتے رہے۔ "بفروختن آں گستردنی و پوشیدنی جان وتن ہمی پرورم گوئی کہ دیگراں نان می خورند۔ دمن جامہ ہمی خورم۔" لیکن یکم جنوری ۱۸۵۸ء سے شہر میں ہندوؤں کی آبادی کا حکم ہو چکا تھا۔ اور مرزا کے ہندو شاگردوں اور دوستوں نے ان کی اس مصیبت کے وقت میں اُن کی بڑی مدد کی۔ منشی ہرگوپال تفتہ آگرے سے روپے اور کپڑے بھیجتے رہے۔ شراب جو انکے لئے نانِ خوردنی سے بھی زیادہ ضروری تھی۔ مہیش داس مہیا کرتے رہے۔ اور ان کی تنہائی میں ہیرا سنگھ، شوجی رام اور بالمکند غمگساری اور خدمتگاری کے لئے حاضر

رہتے تھے۔ لیکن مرزا کا ہاتھ خرچ کے معاملے میں ہمیشہ آزاد رہا تھا۔ مالی حالت اُن کی تسلی بخش نہ تھی اور چونکہ مستقبل کی نسبت ابھی کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ دستنبو کا جسے انہوں نے یکم اگست سن اٹھاون کو ختم کیا، آخری حصہ نہایت مایوسانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ سابق پنشن اگر مل گئی تب بھی کچھ نہیں بنیگا اور نہ ملی تو قصہ ہی پاک ہے۔" کہن پنشن اگر بدست آید۔ تیز زنگ از آئینہ نمی زداید و اگر فراچنگ ینامد بہ آبگینہ جز سنگ نیامد"

دستنبو میں اخیر جولائی ۱۸۵۸ء تک کے حالات ملتے ہیں۔ لیکن چونکہ ڈاک کا سلسلہ اس سے بہت پہلے شروع ہوگیا تھا۔ اور مرزا کے غدر کے بعد کے اردو خطوط قریباً قریباً سبھی محفوظ ہیں۔ غالب کے حالات فراہم کرنے میں بہت دقت نہیں ہوتی۔ سوانحی نقطہ نظر سے یہ خطوط بہت کار آمد ہیں۔ لیکن مرزا کے خطوط کے متعلق یہ خیال غلط ہے کہ وہ بے تکلف دوستانہ خطوط ہیں۔ اور انہیں لکھتے وقت مرزا کو ان کی اشاعت کا خیال نہیں تھا۔ نومبر ۱۸۵۸ء سے پہلے جو خطوط مرزا نے لکھے ان کی نسبت تو یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن بعد کے خطوط کے متعلق نہیں۔ چنانچہ جب منشی شیونرائن نے انہیں اردو رقعات چھپوانے کیلئے کہا۔ تو انہوں نے ۱۶ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں اس کی مخالفت کی۔ وہ لکھتے ہیں: "اردو کے رقعات بھی جو آپ چھاپا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے کوئی رقعہ ایسا ہوگا۔ جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ ان کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔" اسی سلسلے میں انہوں نے منشی ہرگوپال تفتہ کو بھی لکھا: "رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری

اس میں خوشی ہے۔ تو مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد جو رقعات انہوں نے لکھے ہونگے وہ ان کی اشاعت سے غافل نہیں ہونگے۔ اور اسوقت سے پہلے اور بعد کے خطوط میں جو واضح فرق ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ بعد کے رقعات انہوں نے قلم سنبھالکر اور دل لگا کر لکھے۔

غالب کے رقعات خواہ کن حالات کے ماتحت لکھے گئے ہوں۔ اُنکی اہمیت بہت ہے تاریخی نقطہ نظر سے غدر کے بعد دہلی میں جو سناٹا ہوا تھا۔ اُسکی صحیح اور موثر داستاں انہی خطوط میں ملتی ہے مکتوب نویسی میں بھی ان خطوط نے ایک نیا معیار قایم کر دیا۔ ورنہ ممکن تھا۔ کہ اگر اسطرح کے خطوط لوگوں کی نظر کے سامنے نہ آتے تو اردو نظم نے جہاں فارسی نظم کی پیروی کی ہے وہاں اُردو خطوط بھی رقعات بیدل اور انشائے مادھورام کی طرز پر لکھے جاتے۔ علاوہ ازیں اُردو نثر کی تاریخ میں ان رقعات کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ بیشک اس سے پہلے کلکتہ کالج میں کئی ایک کتب مقفیٰ اور مسجع عبارت سے عاری شایع ہو چکی تھیں۔ لیکن اُردو نثر کا مستقبل فورٹ ولیم سے نہیں بلکہ قلعہ دہلی سے وابستہ تھا۔ یہاں بھی دہلی کالج کے سلسلے میں صاف اردو میں چند کتب شایع ہوئی تھیں۔ لیکن وہ محض ترجمے تھے۔ اور ادبی نقطہ نظر سے بے وقعت یہاں جو رنگ مقبول تھا۔ اس کا نمونہ مولوی غلام امام شہید کے مضامین میں یا آثار الصنا دید کے باب چہارم میں ملتا ہے۔ بیشک اس طرز تحریر کو اختیار کرتے وقت عبارت آرائی اور قوافی اور تشبیہوں کی تلاش میں انشا پرداز کو بہت محنت کرنی پڑتی۔ لیکن نتیجہ فقط یہی کہ اصل مطلب توبرتو پردے پڑ جاتے۔ غالب نے دہلی کی زبان کو تحریر کا جامہ پہنایا۔ اور اس میں اپنی ظرافت اور موثر طرزِ بیان سے وُہ گلکاریاں کیں۔ کہ اردوئے معلےٰ خواص و عوام کو پسند آئی۔ اور اردو نثر کیلئے ایک ایسی طرزِ تحریر قایم ہو گئی جس کی پیروی باقیوں کے لئے لازم تھی۔

حالی نے یادگار غالب میں مرزا کے رقعات کا نہایت نفیس انتخاب کر کے ان پر دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ اسکے علاوہ دو مستقل کتابیں غالب کے خطوط کے متعلق شایع ہو چکی ہیں۔ اسلئے اسجگہ

اُن پر کوئی تبصرہ کرنا تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں ہوگا۔ البتہ اُنکے اس زمانے کے حالات سمجھنے کے لئے جسقدر انتخاب ضروری ہے۔ ہم درج ذیل کرتے ہیں۔

غالب کو جب جان کی سلامتی کا یقین ہوا تو اُنہیں پنشن کی فکر ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے ملکہ وکٹوریہ اور حکام عالیشان کی تعریف میں قصائد لکھکر حکام دہلی کی معرفت ارسال کئے۔ لیکن ۷ا مارچ ۱۸۵۸ء کو کمشنر دہلی نے یہ لکھکر انہیں واپس بھیج دیا کہ ان میں سوائے ستائش و مدح کے کچھ نہیں۔ جب اس سے کچھ مہینے بعد اکتوبر میں دستنبو چھپی۔ تو مرزا نے چند جلدیں نہایت محنت سے مجلد کرا کے دو ولایت اور چار ہندوستانی حکام اعلیٰ کی نذر کیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب حکام کی نظر میں مقبول ہوئی۔ چنانچہ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم یو پی نے بہت تعریف لکھی۔ اور مسٹر میکلوڈ فنانشل کمشنر نے خود لکھکر کمشنر دہلی کی معرفت یہ کتاب اُن سے منگائی۔ لیکن اس قدردانی کے باوجود حکام کا دل مرزا سے صاف نہیں ہوا۔ اور جب جنوری ۱۸۶۰ء میں میرٹھ میں بڑا دربار ہوا۔ اور سب درباری وہاں بلائے گئے تو مرزا کو وہاں جانے کی اجازت نہ ملی۔ جب گورنر جنرل کا کمپ میرٹھ سے دہلی آیا۔ اور مرزا نے چیف سکرٹری کے خیمہ میں ملاقات کیلئے اپنا ٹکٹ بھجوایا۔ تو وہاں سے جواب ملا۔ کہ ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے[1] اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔ چنانچہ مرزا نے لارڈ کیننگ کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا تھا ؎

زسال نو دگر آبے بروئے کار آمد
ہزار و ہشتصد و شست در شمار آمد

وہ بھی معہ اس حکم کے واپس آیا۔ کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔

مرزا کی پنشن کے متعلق شروع ۱۸۵۹ء میں حوصلہ افزا تحقیقات ہوئی تھی۔ اور انہیں ایکسٹرا پیہ

---

[1] ۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا کے متعلق خیال تھا۔ کہ غدر میں انہوں نے بہادر شاہ کی تخت نشینی پر سکہ لکھا تھا۔ یہ خیال غالباً غلط تھا۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ غدر کے دوران میں غالب کے تعلقات بہادر شاہ سے منقطع نہیں ہوگئے تھے۔ اور آگرہ کے اخبار آفتاب عالمتاب میں بھی لکھا ہے۔ کہ مرزا نوشہ اور مکرم علیخاں نے ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے۔

بطریق امداد بھی ملا تھا۔ لیکن اب جو انہیں دربار کے متعلق یہ جواب ملا۔ وہ پنشن سے بھی مایوس ہو گئے۔ اس زمانے میں انہوں نے مہاراجگان الور و پٹیالہ کی تعریف میں قصائد لکھے اور مدد چاہی۔ لیکن جب ادھر سے کچھ نہ حاصل ہوا۔ تو انہوں نے رام پور کا رُخ کیا۔ نواب ۱۸۵۵ء سے اُن کے شاگرد تھے اور گاہے گاہے کچھ بھیجا کرتے تھے۔ غدر کے بعد مرزا کی حالت بہت خراب ہوئی۔ تو انہوں نے نواب کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ ؎

چوں نیست مرا شربتِ آبے ز تو حاصل
دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل

اس پر نواب کی طرف سے ایک سو روپیہ ماہانہ اُن کی مدد کیلئے جولائی ۱۸۵۹ء کے وسط سے مقرر ہو گیا تھا۔ اب جنوری ۱۸۶۰ء میں مرزا کو حکامِ انگریزی کی طرف سے مندرجہ بالا جواب ملا۔ تو وہ رام پور گئے۔ وہاں نواب نے ان کی بہت توقیر کی۔ "ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے۔ وہ صورتِ ملاقات۔" علاوہ ازیں نواب نے وعدہ کیا۔ کہ اگر مرزا رام پور رہیں۔ تو دو سو روپے پائیں اور اگر دہلی رہیں تو سو۔ لیکن مرزا عارف کے دو بچوں کو ساتھ لیگئے تھے۔ وہاں وہ گھبرا گئے۔ اس لئے مرزا ڈیڑھ دو مہینہ رام پور رہنے کے بعد آخیر مارچ کو دہلی واپس لوٹے۔

مرزا کو خیال تھا۔ کہ نواب کی وساطت سے حکام سے صفائی ہو جائیگی۔[1] لیکن اگرچہ اسمیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ نواب کا مرزا سے جو نیم مربیانہ تعلق تھا۔ وہ اور مستحکم ہو گیا۔ اس کے علاوہ اگرچہ مرزا کا دربار و خلعت موقوف ہو گیا تھا۔ اور پنشن کے بارے میں بھی حاکم دہلی نے ان کے خلاف رپورٹ کی تھی۔ حکام بالا کیطرف سے اُنکی پنشن کے اجرا کا حکم ہو گیا۔ اور مرزا جب دہلی واپس پہنچے۔ تو انہیں پنشن کی جو پائی پائی باقی تھی۔ سب ملی۔ چنانچہ ۶ مئی ۱۸۶۰ء کو جو خط انہوں نے

---

[1] پتہ نہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے کس شہادت کی بنا پر لکھا ہے کہ سر سید نے پنشن کی بحالی کے لئے بہت کوشش کی۔ (الہلال جلد ۴۔ نمبر ۴۴ صفحہ ۸)

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا ہے۔ اس میں تین برس کا زرِ مجتمعہ دوہزار دوسو پچاس روپیہ پانے اور اسکے ادا نگئے قرضہ میں خرچ ہو جانیکی تفصیل درج ہے۔ مرزا کی پنشن موروثی تھی۔ اسلئے وہ اب باقاعدہ ملنی شروع ہوگئی تھی۔ لیکن چونکہ ان کی وفاداری کی نسبت حکام کے دل میں شبہات تھے۔ اُن کے دربار اور خلعت جو گورنر جنرل کا عطیہ تھے۔ بحال نہ ہوئے۔ مرزا کو اس کا بہت رنج تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے مارچ ۱۸۶۳ء میں حکام نے یہ شکایت خود بخود ہی رفع کردی۔ چنانچہ مرزا خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔" دو شنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر مخیمِ خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیقِ قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا۔ کہ تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار رہے۔ متحیرانہ میں نے پوچھا۔ کہ حضرت کیونکر۔ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے واپس آکر تمہارے علاقہ کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے ہیں۔ اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا۔ کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے۔" چنانچہ رابرٹ منٹگمری لفٹنٹ گورنر پنجاب نے، جن کی تعریف میں مرزا نے فارسی قصیدہ بھی لکھا تھا۔ ۲۳۔ مارچ ۱۸۶۳ء کو مرزا کو بُلا کر اُنہیں خلعت عطا کیا۔

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکۂ معظمہ کا اعلانِ معافی ہوچکا تھا۔ اور ہندوستان کی عنانِ حکومت کمپنی کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا کا مشہور قصیدہ ؎

در روزگارِ ما نتواند شمار یافت
خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

جس کی نسبت حالی کا خیال ہے کہ اعلانِ معافی کی تقریب پر لکھا گیا۔ اس سے پہلے کا ہے۔ اعلانِ معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہوا۔ اور یہ قصیدہ اس سے پہلے ستمبر ۱۸۵۸ء میں دستنبو کے ساتھ چھپ بھی چکا تھا۔ جب مرزا اس اعلان سے قطعاً بیخبر تھے۔ اس قصیدہ کے کئی اشعار پیچیدہ اور ذومعنی ہیں۔ لیکن غالباً یہ فتح دہلی کی مبارکباد ہے۔ نہ کہ اعلانِ معافی کا شکریہ۔

اعلانِ معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہوا۔ اور اس سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب

کا آغاز ہوا لیکن اگرچہ سوائے ان لوگوں کے، جن کے خلاف خاص ثبوت تھے۔ عوام کی جاں بخشی کا حکم ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ دہلی کا شیرازہ جو بکھرا ہوا تھا۔ اُسے بندھتے بہت دیر لگی۔ ہندوؤں کی آبادی کا حکم جنوری ۱۸۵۸ء میں ہی ہوگیا تھا۔ بعد میں کچھ مسلمانوں کو شہر میں آنے جانے کیلئے ٹکٹ ملنے شروع ہوئے۔ اور پھر بعض کو شہر میں چند شرطوں کے ماتحت رہنے کی اجازت ملی۔ تعزیری ٹیکس نومبر ۱۸۵۹ء میں عائد ہوا۔ چنانچہ مرزا ۹۔ نومبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں "ٹون ڈُوٹی (TOWN DUTY) کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں ۷ نومبر سے جاری ہوگئی۔ سالگ رام خزانچی، چھنامل، مہیش داس ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطور امانی سپرد ہوا ہے۔ غلہ اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں ہے۔ کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے۔ خلق کا اژدھام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان رہیں۔ کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہوگیا ہے۔ کہ کرایہ دار بھی رہیں کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم باہم کوئی اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرلے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہ رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ سے کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ وہ بھی آرہیں۔ مگر کرایہ سرکار کو دیں"۔ لیکن اسی سال دسمبر میں جب گورنر جنرل نے میرٹھ میں دربار کیا۔ تو مسلمانوں کی املاک کے واگزشت کا حکم عام ہوگیا۔ جن کو کرایہ پر ملی تھیں۔ ان کو کرایہ معاف ہوگیا"۔ علاوہ ازیں مرزا ۳۱، دسمبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "اتنا مسموع ہوا ہے۔ کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ اور حکم یہ ہے۔ کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے۔ البتہ اُسکا معاوضہ دہ یک سرکار سے ہوگا"۔ دہلی کو چونکہ پنجاب کے حکام نے فتح کیا تھا۔ اس کا نظم و نسق بھی اب انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ ویسے انتظامات نئے سے ماتحت دہلی صوبۂ پنجاب کا حصہ تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ اکثر اہالیانِ دہلی اس انتظام سے خوش نہیں تھے۔ مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجئے گا۔ کہ دہلی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلاد شرقیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں آئے وہ ویسا ہی کرے"۔ یوسف مرزا کو ایک لطیفہ لکھا ہے:۔ "سنو حافظ مموّ بے گناہ ثابت ہوچکے۔ رہائی پاچکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہوچکا

ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے۔ مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون، عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممّوں کون۔ عرض کیا کہ میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے ممّو ممّو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ حافظ ممّو بھی تم۔ سارا جہاں بھی تم۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں۔ مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممّو اپنے گھر چلے آئے ا

میر مہدی جو دہلی کے حالات بار بار پوچھتے تھے۔ انہیں غدر کے بعد دہلی کا جو نقشہ بدلا تھا۔ اسکی تفصیل ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں۔ وہ اگر اٹھ جائیں۔ تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچہ کے اُس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہانتک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب اہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ۔ دھوبی واڑہ۔ رامجی گنج۔ سعادت خاں کا کٹرہ۔ جرنیل کی بی بی کی حویلی رامجیداس گودام والے کے مکانات صاحب رام کا باغ حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔

قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا۔ اور اب جو کوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا۔ تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائیگا۔ اللہ اللہ دِلّی والے ابتک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد بندۂ خدا۔ اُردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں دِلّی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کمپ ہے چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔" ایک اور خط میں لکھا ہے۔ "بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں۔ دِلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ چاندنی چوک ہر روز مجمع جامع مسجد کا۔ ہر ہفتہ سیر جمنا کے پُل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلّی کہاں"۔ یہ خط اخیر ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا۔ جامع مسجد جسے گرا دینے کے مشورے دیئے جا رہے تھے۔ ابھی تک واگزاشت نہیں ہوئی۔ چنانچہ فتح دہلی کے پانچ سال بعد ۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء کو مرزا ایک خط

میں لکھتے ہیں: "جویائے حالِ دہلی و اہلِ اسلام کو مسجد جامع واگزاشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش۔ مولوی صدر الدین۔ تفضل حسین خان۔ تین یہ سات اور۔ ۷ نومبر ۱۴ جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے رہا ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون"۔

غدر کا ہنگامہ اب فرد ہوئے کئی سال ہو چکے تھے۔ دہلی جہاں تک تبدیل حالات کے ساتھ ممکن تھا۔ اپنی پرانی حالت پر آرہی تھی۔ بظاہر تو غالب کو اس وقت ہر طرح مطمئن ہونا چاہیئے تھا۔ رام پور سے باقاعدہ سو روپیہ ماہوار آتے تھے۔ پنشن جاری تھی۔ دربار اور خلعت بھی بحال ہو چکے تھے۔ لیکن "قاطع برہان" کی اشاعت سے انہوں نے جو مخالفتِ عامہ مول لی۔ اُس نے یہ زمانہ اُن کے لئے بہت تلخ کر دیا۔ قاطع برہان اوائل ۱۸۵۹ء میں لکھی گئی۔ اور اکتوبر ۱۸۶۱ء کے بعد شایع ہوئی۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کو دستنبو کا ثمر ثانی سمجھنا چاہیئے۔ دستنبو کی تحریر میں مرزا نے عربی الفاظ استعمال نہ کرنے کا التزام کیا تھا۔ اب انہیں الفاظ کی اصل اور معانی پر زیادہ غور کرنیکی ضرورت پڑی۔ جس کیلئے انہوں نے مشہور فارسی لغت برہانِ قاطع[1] کا غائر مطالعہ کیا۔ علاوہ ازیں اسوقت انکے پاس پارسیوں کی کتاب دساتیر بھی تھی۔ اور چونکہ عربی الفاظ ترک کرنے کی وجہ سے قدیم فارسی کے کئی الفاظ انہیں استعمال کرنے پڑے۔ انہوں نے دیکھا ہوگا کہ برہان قاطع میں جو معنی دیئے ہیں وہ دساتیر کی عبارت پر نہیں پھبتے۔ چنانچہ جب دستنبو ختم ہوگئی

---

[1] ۔ جو "برہان" مرزا کے زیر مطالعہ تھی اور جسکے حاشیہ پر انہوں نے جابجا مصنف اور کتاب کے خلاف فقرے لکھے ہیں اب سر امیر الدین کے پاس ہے

اور انہیں برہان کو بغور پڑھنے کی فرصت ملی۔ تو انہیں کئی بے قاعدگیاں نظر پڑیں۔ انہیں اکٹھا کر کے اُنہوں نے دس جزو کا ایک رسالہ قاطع برہان کے نام سے شائع کیا۔ یہ رسالہ تو اب عام نہیں ملتا۔ لیکن اس کی اشاعت کے تین چار سال بعد مرزا نے دوسرا ایڈیشن "درفش کاویانی" کے نام سے شایع کرایا تھا جس کی ایک جلد برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت جو ایک سرسری مطالعہ سے بھی واضح ہوتی ہے۔ مرزا کی آزاد قوتِ فیصلہ ہے۔ ہم نے اس کتاب کے شروع میں اشارہ کیا ہے۔ کہ جس طرح مولانا اسمعیل نے کورانہ تقلید کے خلاف لوگوں کو اُبھارا تھا۔ مرزا بھی رائے عامہ کے پابند نہیں تھے۔ اور ہر ایک مسئلہ پہ آزادانہ تنقید جائز بلکہ ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ درفش کاویانی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "مرا نیز خردے ورد انے دادہ اند۔ فراز آوردہ (یعنی نتایج) اندیشہ بیگانگان راچوں پذیرم دانہ نیروئے خرد خداداد کارچہ انگیزم" وہ نہ صرف اپنے معاصرین کی رائے کو بہ نظرِ تنقید دیکھتے تھے بلکہ مولٰینا اسمٰعیل کی طرح اگلوں کے فیصلہ کے سامنے اندھا دھند سر نہیں جھکاتے تھے۔ چنانچہ وہ تفتہ کو اسی زمانے میں ایک خط میں لکھتے ہیں" یہ نہ سمجھا کرو۔ کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں۔ وہ حق ہے کیا آگے احمق نہیں پیدا ہوتے تھے"۔

لیکن ظاہر ہے کہ جس طرح یہ نقطۂ نظر کہ جو اگلے کہتے تھے سب درست ہے۔ صحیح نہیں۔ اسی طرح کورانہ تقلید کو چھوڑ کر اندھا دھند مخالفت اختیار کرنے میں بھی کوئی مصلحت نہیں۔ ہر ایک مسئلہ کا فیصلہ اسکے اپنے حسن و قبح سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بارے میں بھی ہم دیکھتے ہیں۔ کہ عام اغلاط اور الفاظ کے معانی سے قطع نظر فن لغت میں مرزا نے جو اصول وضع کئے ہیں۔ اور ان کے لحاظ سے برہان قاطع پر نکتہ چینی کی ہے۔ وہ بیشتر صحیح ہیں۔ مثلاً مرزا کا یہ خیال کہ اگر لغت میں مصدر کے معنی دیئے جائیں۔ تو مشتق کے معنی دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ درست ہے۔ اور اس اصول کو نظر انداز کر کے مصنف برہان نے الفاظ کا ذخیرہ بہت بڑھا دیا تھا۔ اسی طرح شعرا نے الفاظ سے جو معانی استعارے کے طور پر کسی خاص نظم میں مراد لئے تھے۔ انہیں بھی مصنف نے علیحدہ لغت کے طور پر درج

کیا تھا۔ چنانچہ مرزا لکھتے ہیں" افزودن شمارۂ لغات بہر صورت پیش نہاد ..... چنانکہ کمال اسمٰعیل را خلاق المعانی لقب است۔ اگر ایں بزرگوار را خلاق الالفاظ خوانند چہ عجب است"

ان اصولی اعتراضوں کے علاوہ مرزا کو بعض الفاظ کے معانی سے بھی اختلاف تھا۔ اور یہ اختلاف انہیں اکثر فرہنگ نویسوں سے تھا۔ وہ وجہ اسکی یہ دیتے تھے "جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں مشہور و غیر مشہور۔ کچھ کم سو رسالے ہونگے۔ ان سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں۔ کوئی اہل زبان نہیں ہے۔ اشعار اساتذہ ایران کو ماخذ ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے۔ بمناسبت مقام ان لغات کے معنی لکھدیئے۔ استنباط معنی کا مدار قیاس پر" مرزا کہتے تھے۔ کہ ایسی فرہنگیں بے وقعت ہیں۔ جو اہلِ زبان کہیں۔ صحیح ہے۔ حقیقتاً یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ جس پر آج بھی اہل الرائے متفق نہیں۔ اور اگرچہ مرزا کی رائے بہت حد تک صحیح ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے۔ کہ آخر اساتذہ شعرا بھی تو بیشتر اہل زبان ہیں۔ اور اہلِ زبان اپنے الفاظ کے جو معنی بتائینگے۔ انہیں اساتذہ کے کلام پڑھ کر سیکھنا بھی ضروری ہوگا۔ اور اس طرح ان کے معانی اور فرہنگ نویسوں کے دیئے ہوئے معانی میں بہت فرق نہیں ہوگا۔

اگرچہ جیسا کہ اس تفصیل سے ظاہر ہوگیا ہوگا۔ اس مسئلہ میں بحث کی بہت گنجائش ہے۔ بدقسمتی سے بحث نے نہایت تلخ پہلو اختیار کر لیا تھا۔ اور اسکی وجہ مرزا کی طرزِ تحریر تھی۔ ان کی یہ کتاب صاف اور موثر زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ لیکن طرزِ تحریر بہت شوخ ہے۔ ہندوستانی فرہنگ نویسوں کی نسبت انہوں نے مرزا تفتہ کے نام اردو خطوط میں جو فقرات لکھے ہیں۔ وہ تو اس قابل نہیں کہ انہیں کہیں دُہرایا جائے۔ قاطع برہان میں بھی انہوں نے صاحب برہان کی نسبت بہت نا ملائم الفاظ استعمال کیئے تھے۔ مرزا نے ایک فارسی قطعے میں ان الفاظ کی درستی کو تسلیم کیا ہے لیکن حالی نے مرزا کی مخالفت کی عجیب توجیہ کی ہے۔" اگر مرزا صاحب برہان کی نسبت ایسا نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی۔ کیونکہ ہندوستانی کے پُرانے تعلیم یافتہ جو آجکل ایک نہایت کس مپرسی حالت میں ہیں۔ انکے لئے کنج خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اسکے سوا باقی نہیں رہا۔ کہ کسی سربرآوردہ

اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں۔ اور لوگوں پر ظاہر کریں۔ کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں"۔ حالی نے سرسید کی مخالفت کی بھی یہی وجہ دی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرزِ استدلال کسی اعتراض کا جواب نہیں آخر اگر سرسید رسول کریمؐ کے متعلق الفنسٹن کے ناشائستہ الفاظ اپنی کتاب میں نہ درج کرتے یا اپنے عجیب و غریب مذہبی عقائد کا، جن کا آج بھی کوئی قائل نہیں، پرچار نہ کرتے۔ تو انکی کیوں اتنی مخالفت ہوتی۔ اسی طرح اگر مرزا اس علمی بحث میں ذاتیات کو نہ لے آتے تو مخالفین بھی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیتے۔ علاوہ ازیں اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ پرانے تعلیم یافتہ اپنی شہرت کیلئے مشہور آدمیوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ تب بھی نا ملائم الفاظ کے استعمال میں جو عیب ہے۔ وہ کم نہیں ہو جاتا حقیقت یہ ہے اور مرزا کے سوانح نگار کو اس امر کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ مباحثہ کرتے وقت وہ اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کرتے تھے اس سے پہلے جب ان کے کلام پر قتیل کے اصولوں کی وجہ سے اعتراض ہوئے تھے۔ تو وہ اُس کا سارا شجرہ نسب ڈھونڈ لائے تھے۔ اور اب جو انہوں نے برہان قاطع کے مصنف سے اختلاف کیا۔ تو دلائل و براہین پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اپنے قلم سے تیر اور نشتر کا کام بھی لیا۔

برہان قاطع غالباً ۱۸۶۱ء میں شایع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۵ء میں رئیس سورت نواب میر غلام بابا خاں کی مالی امداد سے شایع ہوا۔ اس امر سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ مرزا کے مداح اسوقت سارے ہندوستان میں موجود تھے۔ بنگال میں میسور کے شاہی خاندان کے رکن شاہزادہ بشیر الدین۔ اور خان بہادر عبدالغفور نساخ۔ سورت میں نواب میر غلام بابا خاں لوہارو میں نواب لوہارو کے صاحبزادے مرزا علاء الدین اور بھائی نواب ضیاء الدین غالب کے شاگرد تھے۔ بڑودہ کے رئیس نواب میر ابراہیم علیخاں غزلیں اصلاح کیلئے بھیجتے تھے۔ اور الور کے مہاراجہ غالب کے مداح تھے۔ الہ آباد میں خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر اگرچہ قاطع برہان کی بحث میں مرزا سے متفق نہیں تھے۔ لیکن اُن کے کمال شاعری کے معترف تھے۔ اسی طرح پنجاب میں ان کی دستنبو بہت مقبول ہوئی۔ اور وہاں انکے اردو رقعات کی بہت مانگ تھی۔ یہ صحیح ہے۔ کہ حیدر آباد میں

ان کی کوئی قدر نہ ہوئی۔ اور انہوں نے سر سالار جنگ کی تعریف میں جو نفیس قصیدہ ۱۸۶۱ء میں لکھکر بھیجا تھا۔ اس کا انہیں جواب بھی نہ ملا۔ لیکن اسکے علاوہ تمام ہندوستان میں اُن کے قدردان اور مداح موجود تھے۔ مرزا کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے تھے۔ لیکن بڑھاپے میں انہیں فکرِ معشیت سے آزاد رکھنے کی سعادت دربار رامپور کے حصے میں آئی۔ نواب یوسف علیخاں ناظم سو روپیہ ماہوار بھیجتے تھے۔ خاص ضرورت کے وقت (مثلاً قاطع برہان کی اشاعت کے لئے) جو کچھ ملتا وُہ اسپر مستزاد۔ ان کی وفات اپریل ۱۸۶۵ء میں ہوئی۔ اور نواب کلب علیخاں جانشین ہوئے مرزا نے تہنیت جلوس کا قصیدہ لکھکر بھیجا تھا۔ اور جب نواب نے مسند نشینی کا جشن کیا تو مرزا بھی رام پور بلائے گئے۔ چنانچہ بارہ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو وہ مرزا باقر علیخاں اور مرزا حسین علیخاں کے ساتھ وہاں پہنچے۔ اور جشن میں شریک ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے جشن بڑا شاندار تھا۔ مرزا نے بھی ایک خط میں ذکر کیا ہے۔ " روشنی آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے۔ طوائف کا وہ ہجوم۔ حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہنا چاہئے۔" مرزا قریباً تین مہینے رام پور رہے۔ واپسی پر مراد آباد راہ میں تھا۔ وہاں پہنچکر بیمار ہوگئے۔ اتفاق سے سر سید احمدؒ خاں وہاں صدر الصدور تھے۔ انہوں نے پوری طرح تیمار داری اور غمخواری کی پانچ سات دن کے بعد صحت ہوئی۔ تو وہ دہلی پہنچے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ انہیں عارضی طور پر آرام آگیا۔ طبیعت اسکے بعد اکثر خراب ہی رہی۔ وہ ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ " آگے ناتوان تھا۔ اب نیمجان ہوں۔ آگے بہرا تھا۔ اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد ہے۔" اس سے تین چار سال پہلے بھی وہ فسادِ خون کی وجہ سے قریباً ایک سال بیمار رہے تھے۔ اب ان کی عمر بھی ستر برس کے لگ بھگ ہو رہی تھی۔ اور ضعفِ پیری دن بدن غالب آرہا تھا۔ "جلوۂ خضرؑ" کے مؤلف سید فرزند احمد صفیر بلگرامی اسی زمانے میں اُن سے ملنے دہلی آئے تھے۔ اور ان سے ملاقات کا حال اپنی کتاب میں یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں" حضرت کا لباس اُسوقت یہ تھا۔ پاجامہ سیاہ بوٹے دار دیس کا۔ کلی دار۔ نیفہ سُرخ ٹول کا۔ بدن میں مرزائی۔ سر کھلا ہوا۔ رنگ سُرخ سفید۔ منہ پر ڈاڑھی دو انگل کی۔

آنکھیں بڑی۔ کان بڑے۔ قد لمبا۔ ولایتی صورت۔ پاؤں کی انگلیاں بسبب کثرت شراب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں۔ اور یہی سبب تھا۔ کہ اٹھنے میں دقت ہوتی تھی۔ آنکھوں میں نور موجود تھا۔ کان کے سماعت میں کچھ ثقل آ چلا تھا۔" سید فرزند احمدؔ دہلی کئی روز مقیم رہے۔ اس دوران میں مرزا اور انکے درمیان جو ادبی گفتگو ہوئی۔ اُسے بھی انہوں نے درجِ کتاب کیا ہے۔ اور مرزا کے کھانے کی تفصیل لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ اچھی غذا کھاتے تھے۔

مولف جلوۂ خضر کی مرزا سے ملاقات ۱۲۸۲ھ میں ہوئی۔ شعر و شاعری اسوقت ترک ہو چکی تھی۔ انہوں نے آخری فارسی غزل ۱۸۶۵ء میں نواب امین الدین کے ایما پر اور آخری اردو غزل نواب کے صاحبزادے مرزا علاء الدین کے اصرار پر ۱۸۶۶ء میں لکھی۔ دونو غزلوں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ مرزا کے قلم میں ابھی بہت جان باقی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے غدر کے بعد ان کا بہت سا وقت برہان قاطع کے متعلق مباحثہ میں تلف ہوا۔ ہاں اردو خطوط کا بیشتر حصہ اس زمانے کی یادگار ہے۔ اور وہ مرزا کے تاج شہرت کے آبدار موتی ہیں۔ مرزا بھی اب ان کی قدر جانتے تھے چنانچہ منشی غلام غوث بیخبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں" یہ منشی ممتاز علی کیا کر رہے ہیں رقعے جمع کئے۔ اور چھپوائے نہیں۔ پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی مانگ ہے۔" عودِ ہندی بقول منشی مہیش پرشاد مرزا کی وفات سے چار مہینے پہلے ۱۵۔ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو شایع ہوئی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ اردوئے معلیٰ مکمل دیکھنا غالب کو نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ ۶۔ مارچ ۱۸۶۹ء کو رقعات کا یہ مجموعہ مرزا کے دوست حکیم غلام رضا خاں کے مطبع اکمل المطابع میں چھپ کر شایع ہوا۔ اور پندرہ فروری کو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس مجموعہ کی تیاری میں مرزا نے بھی مدد دی۔ اور اپنے دوستوں سے خطوط اور ان کی نقلیں منگائیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ بیماری کی وجہ سے مرزا اس پر نگہ تنقید نہیں ڈال سکے کیونکہ اسمیں کئی ایسے خطوط جن کا نظر انداز ہونا ہی بہتر تھا۔ شائع ہو گئے ہیں۔ کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مجموعہ منشی جواہر سنگھ کی تحریک سے شروع ہوا۔ اور میر فخرالدین مہتمم مطبع اور منشی بہاری لال مشتاق نے خطوط جمع کیے۔ دیباچہ میر مہدی اور خاتمہ مرزا قربان علی بیگ سالک نے لکھا۔ دوسرا مجموعہ

جو عودِ ہندی کے نام سے شایع ہوا۔ اردوئے معلیٰ سے مختصر ہے۔ اسکے جمع کرنیکا خیال منشی ممتاز علیخاں رئیس میرٹھ کو ہوا۔ اور انہوں نے خواجہ غلام غوث بیخبر اور چوہدری عبد الغفور سرور کی مدد سے غالب کے اردو خطوط جمع کیے۔ اور قریباً سات آٹھ سال کی محنت کے بعد اسے ۱۸۶۹ء میں شایع کروایا۔ اس کے ابتک بارہ ہزار نسخے چھپے ہیں۔ غالب کے خطوط کے اب تک کئی ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ جو نسخہ لاہور میں شیخ مبارک علی نے طبع کرایا ہے۔ وہ بہترین ہے۔ لیکن اب بھی کئی اصحاب کے پاس غالب کے غیر مطبوعہ خطوط بتائے جاتے ہیں۔ اور کوئی ایڈیشن بھی مکمل نہیں کہلا سکتا۔

جب سید فرزند احمد سے مرزا کی ملاقات ہوئی۔ اسوقت مرزا کی عمر قریباً ستر سال کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ اسکے بعد صحت تیزی سے بگڑنی شروع ہو گئی۔ کیونکہ مرزا کی وفات تہتر برس کی عمر میں ہوئی۔ اور حالی لکھتے ہیں "مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی"۔ ان کی اس حالت کا ذکر کئی خطوں میں ہے۔ لیکن اس کی موثر ترین تصویر خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی نے کھینچی ہے۔ جو لکھنؤ سے کشمیر جاتے وقت راستے میں غالب سے ملے تھے۔ وہ لکھتے ہیں " مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا۔ ایک بڑا پھاٹک تھا۔ جس کی بغل میں ایک کمرہ اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسی بیاسی سال کا ضعیف العمر لیٹا ہوا، ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے، آنکھیں گڑوئیے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ یہ مرزا غالب دہلوی ہیں۔ جو بگمان غالب دیوانِ قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

ہم نے سلام کیا۔ لیکن بہرے اسقدر تھے۔ کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی۔ آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا۔ کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے سے کروٹ بدلی۔ اور ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے سلام کیا۔ بمشکل چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے ہم کو اپنے پاس بٹھایا۔ قلمدان اور کاغذ سامنے رکھ دیا۔ اور کہا " آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے۔ لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا۔ جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھکر دو"۔ نام و نشان پوچھا۔ ہمارے ساتھ جو صاحب

گئے تھے۔ ہرچند انہوں نے تعارف کرانیکے کوشش کی۔ مگر بے سود ہوئی۔ جب ہم نے نام و پتہ لکھا۔ تو کہا "مجھ سے ملنے کیلئے آئے ہو۔ تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہونگے۔ کچھ اپنا کلام بھی سناؤ" ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبانِ مبارک سے سننے کی غرض سے آئے تھے۔ بہت دیر تک اپنا کلام سنایا کئے۔ پھر اصرار کیا۔ کہ تم بھی کچھ سناؤ۔ ہم نے یہ مطلع سنایا ؎

مہ مصراست داغ از رشکِ مہتابے کہ من دارم
زلیخا کور شد از حسرتِ خوابے کہ من دارم

عجیب لطف اور مزے سے اس مطلع کو دہرایا۔ اور حد سے زیادہ تعریف کی۔ پھر آدمی سے کہا "کھانا لاؤ"۔ ہم سمجھے بہ خیال مہمان نوازی تکلیف کر رہے ہیں۔ لکھدیا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کیلئے دہلی اُتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت بالکل قریب ہے۔ اور بگھی سرائے میں کھڑی ہے۔ اسباب بندھا ہوا رکھا ہے۔ یا برکاب آپ سے ملنے آئے تھے۔ اب اجازت چاہتے ہیں۔ کہنے لگے۔ "آپ کی عنایت اس تکلیف سے یہ تھی۔ کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی۔ کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھے خبر نہیں ہوتی۔ غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا۔ کلام سنا۔ اب ایک بات باقی رہ گئی ہے۔ کہ میں کیا کھاتا ہوں۔ اور کتنا کھاتا ہوں۔ اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے"۔ اتنے میں کھانا آیا۔ دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا۔ پھلکے کا باریک ورق لیکر وہ چار نوالے بمشکل کھائے۔ اور کھانا بڑھا دیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدار خوراک پر کیونکر بسر کرتے ہیں"۔

مرزا کی اخیر عمر میں کمزوری اور ضعفِ قوائ کی وجہ سے یہ حالت ہوگئی تھی۔ تو جائے حیرت نہیں کہ وہ موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔ اور ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے۔ لیکن اس بے بسی کی حالت میں بھی شعر و ادب سے دلچسپی باقی تھی۔ اور خطوط لکھنے یا لکھوانے کا سلسلہ موت سے ایک روز پہلے تک جاری رہا۔ حالی لکھتے ہیں "مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہوگئی تھی

پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کیلئے افاقہ ہو جاتا تھا۔ پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہوا۔ اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اسوقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا۔ اور نواب علاؤالدین احمدؔ خاں کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انہوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اسکے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا۔ لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا۔ "کہ میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔" اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا۔ دوسرا مصرع یہ تھا۔ " نکرد ہجر مدارا من سر تو سلامت ۔" مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا۔

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے

عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے"

آخر مرزا کی مصیبتوں کے خاتمہ کا وقت آگیا۔ اور ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کی دوسری (یا فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں) کو تہتر ۷۳ برس اور چار مہینے کی عمر میں رہگرائے عالم جاودانی ہوئے تجہیز و تکفین نواب ضیاء الدین احمدؔ خاں کی طرف سے ہوئی۔ اور حضرت سلطان نظام الدینؒ کی درگاہ میں جہاں مشہور شاعر امیر خسرو کا مزار بھی ہے۔ اپنے خسر نواب احمدؔ بخش معروف کے پائین مزار دفن ہوئے +

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

تبصرہ

اگرچہ شاعراں نغز گفتار زیک جام اند در بزمِ سخن مست

ولے با بادۂ بعضے حریفاں خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست

مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم

ورائے شاعری چیزے دگر ہست

غالب کے تذکرہ نویس

ہم یہ تو ذکر کر چکے ہیں کہ شعرا کے تذکروں میں غالب کو اسوقت سے جگہ ملنی شروع ہو گئی تھی۔ جب ابھی وہ آگرہ چھوڑ کر دہلی نہیں آئے تھے۔ لیکن ان تذکروں میں کئی خامیاں تھیں۔ ایک تو ان میں اتنے شعرا کا تذکرہ ہوتا تھا۔ کہ کسی ایک کے متعلق تفصیلی حالات کی گنجائش نہ رہتی۔ دوسرے ترتیب ابجدوار ہوتی تھی۔ اس لئے بیان میں تاریخی تسلسل نہ رہتا۔ جب آزاد نے ان نقائص کو محسوس کرکے اردو شاعری کی نئی طرز سے تاریخ لکھی۔ تو اس نے غالب کو بھی اپنی کتاب میں باعزت جگہ دی۔ اور یادگارِ غالب سے پہلے غالب کا مفصل ترین تذکرہ آب حیات میں ہی تھا۔ لیکن آزاد ذوق کے شاگرد تھے۔ اور اردو کے بہترین انشا پرداز۔ جہاں کہیں انہیں اپنے استاد کا پلہ ہلکا نظر آتا۔ وہ دلائل کی کمی اپنی انشا پردازی سے پوری کردیتے۔ چنانچہ غالب کے حالات سے غالب کے مداح مطمئن نہ ہوئے۔ اور ۱۹۰۸ء میں حالی نے اپنی مشہور کتاب یادگارِ غالب لکھی۔

حالی۔ بجنوری۔ لطیف

اُسوقت سے غالب کے متعلق مضامین اور کتب کا سلسلہ ابتک برابر جاری ہے۔ بیشتر کتابیں اردو دیوان کی شرحیں ہیں جنمیں ضمناً مرزا کے حالات درج ہیں۔ اور ان کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ حقیقتاً غالب کے متعلق مستقل کتابیں تین ہیں۔ یادگارِ غالب۔ محاسنِ کلام غالب۔ اور ڈاکٹر لطیف کی کتاب جہاں تک سوانحی حالات کا تعلق ہے۔ ابھی تک حالی سے آگے کوئی نہیں بڑھا۔ اور اگرچہ ڈاکٹر لطیف کی کتاب میں اخذ حالات کے بہت سے قیمتی اصول درج ہیں۔ ان اصولوں پر عمل کرنیکی زحمت ابھی تک کسی نے گوارہ نہیں کی۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی غالب کی اردو نثر اور فارسی نظم و نثر پر کوئی تبصرہ یادگار سے بہتر آجتک شایع نہیں ہوا۔ البتہ انکے اُردو کلام کے بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ یادگار کے بعد دوسری کتاب ڈاکٹر بجنوری کا مقدمہ تھا۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس میں کئی فقرے ایسے لکھ گئے ہیں۔ جو حقیقت سے زیادہ عقیدت پر مبنی معلوم ہوتے ہیں اور انہوں نے کئی اشعار کو بھی ایسے معنی پہنائے ہیں۔ جو شاعر کے خیال میں نہیں ہوسکتے۔ لیکن ان کا مقدمہ اردو ادب کی ایک بیش بہا تصنیف ہے۔ ایک تو طرزِ تحریر اور زورِ عبارت کے نقطۂ نظر سے۔ اور دوسرے کلام غالب کے کئی پہلوؤں پر جو تبصرہ انہوں نے کیا ہے۔ وہ وسیع مطالعہ اور گہرے غور و خوض پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر لطیف کی تصنیف کو محاسن کلام غالب کا جواب سمجھنا چاہیئے۔ ان کی کتاب میں جنوبی ہندوستان کی باقاعدگی اور منطق ہے۔ اور کلامِ غالب کا مطالب جن کڑے اصولوں سے انہوں نے کیا ہے۔ وہ شائد شاعری کی نسبت ریاضی کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ لیکن اسمیں کوئی شک نہیں۔ کہ انہوں نے یہ کتاب لکھکر اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ ایک تو غالب کے متعلق جوشِ اعتقادی کا جو سیلاب بہا آتا تھا۔ اُسے انہوں نے روکا دوسرے غالب اور کلام غالب کے متعلق کئی اہم باتیں تھیں۔ جن کی طرف سب سے پہلے انہوں نے توجہ دلائی۔ لیکن شاید انگریزی تعلیم اور مغربی طرزِ تنقید کے پرستار بھی اس امر سے متفق ہونگے۔ کہ (تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی) غالب کے متعلق بہترین کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو انگریزی سے

قریباً قریباً نابلد تھا۔ یعنی حالی۔ یہ صحیح ہے۔ کہ یادگارِ غالب پرانے اصولوں پر لکھی گئی ہے۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر لطیف نے بتایا ہے۔ اس میں کئی خامیاں ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی اور تبصرہ ایسا نہیں شایع ہوا۔ جس میں اس سے کم خامیاں ہوں۔ اور پھر یادگار کے مطالعہ سے اس یکطرفہ رائے قایم ہونیکا کوئی احتمال نہیں۔ جو اور کتابوں کے مطالعہ سے قایم کی جاسکتی ہے۔

کلامِ غالب کی خصوصیات

حالی نے مرزا کے اردو کلام کی چار خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ ایک تو جدتِ مضامین اور طرفگئی خیالات کے علاوہ ایسی تشبیہوں کا استعمال جو نہ صرف نئی تھیں۔ بلکہ اظہار مطالب کیلئے بھی بہت موزوں تھیں۔ دوسرے استعارہ و کنایہ کا استعمال۔ تیسرے شوخی اور ظرافت۔ چوتھے ایسے اشعار کی بہتات جن کے ایک سے زیادہ معنی لئے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے چوتھی خصوصیت جسے ڈاکٹر بجنوری نے بہت سراہا ہے۔ بعض لوگوں کو بہت پسند ہے۔ اور ہندوستان میں اکثر ایسے اشعار پسند کئے جاتے ہیں۔ جن کے لکھنے اور سمجھنے کیلئے ذہن پر زور دینا پڑے۔ چنانچہ سنسکرت میں کئی ایسی نظمیں مشہور ہیں جنہیں دائیں سے بائیں پڑھا جائے تو رام کی تعریف ہوتی ہے۔ اور اوپر سے نیچے تو لکشمن کی۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ ایسے اشعار کا تعلق دل سے نہیں دماغ سے ہوتا ہے۔ اور اگر انہیں کو کمال شعر گوئی سمجھا جائے تو شاعری جسے دلی جذبات کا اظہار ہونا چاہئے۔ معموں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔

باقی تین خصوصیتیں ایسی ہیں۔ جو بادی النظر میں بھی دیوان غالب کے متعلق صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ اور حالی نے مناسب مثالوں سے انہیں بہت واضح کر دیا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے ان مثالوں میں اضافہ کیا ہے۔ اور اپنی کتاب کے باب نہم میں ان تشبیہوں کی مثالیں دی ہیں۔ جو غائر مشاہدہ فطرت پر مبنی ہیں۔ لیکن جن ترکیبوں کو انہوں نے مرزا کی الفاظ سازی اور خوش نگاری کا نمونہ بتایا ہے۔ (صفحہ ۴۳) ان کا جزو غالب بھی استعارے ہی ہیں۔ جن سے دو لفظوں میں غالب نے ایک مکمل تصویر کھینچ دی ہے۔ مثلاً موجِ نگاہ، وادیٔ خیال، فردوسِ گوش، دامِ تمنا وغیرہ وغیرہ

حقیقتاً مرزا تشبیہہ اور استعارہ کے بادشاہ تھے۔ اور دنیا کے شاید ہی کسی شاعر میں نئی اور موزوں تشبیہوں اور استعاروں کی وہ افراط ہو۔ جو انکے کلام میں ہے۔

ان کا بہت سا ابتدائی اردو کلام صائب کے رنگ میں تھا۔ اور اکثر غزلوں میں مصرعِ ثانی تمثیلاً ہوتا تھا۔ جو تشبیہوں کی افراط اس زمانے کے اشعار میں تھی۔ وہ بعد کے اشعار میں نہیں یہ صحیح ہے کہ وہ تشبیہیں نئی تھیں۔ لیکن اُن سے کئی ایک انگریزی شاعر "جان ڈن" کی تشبیہوں کیطرح غرابت سے خالی نہیں تھیں۔ مثلاً جہاں انہوں نے اپنے "تئیں" "طائر رنگ پریدہ" کا گھونسلا بتایا ہے۔ "یا گلِ دستارِ یار" کو "سوا نیزے پر آئے ہوئے" "آفتابِ صبح محشر" سے مانا قرار دیا ہے لیکن بعد کی تشبیہیں اسطرح شاعرانہ حسن یا موزونیت سے عاری نہیں۔ وہ نئی ہیں۔ لیکن اس لئے کہ جن مضامین کی توضیح کے لیے انہیں استعمال کیا ہے۔ وہ بھی نئے تھے۔ مثلاً

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

یا

بشرع آویزہ وحق میچو مجنوں کم نہ آرے
کہ دل با محمل است اما زباں باسارباں دارد

یا

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں

یا

غم چو ہم ورا فگند رو کہ مراد میدہد
دانہ ذخیرہ می کند کاہ بباد میدہد

تشبیہہ اور استعارہ کا استعمال فقط مضمون کی وضاحت کیلئے ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک کامیاب شاعر کے استعارے اسکے مضامین سے بھی زیادہ دلآویز ہوتے ہیں۔ حافظ کا ایک مشہور شعر ہے :-

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

اور ایڈورڈ فٹز جیرالڈ نے بھی عمر خیام کی ایک رباعی کا ترجمہ کیا ہے :-

Ah, Love! could you and I with Fate conspire
To grasp this sorry Scheme of Things entire,
Would not we shatter it to bits—and then
Remould it nearer to the Heart's Desire!

غالب اس انتہائی شاعرانہ بلندی پر تو کبھی نہیں پہنچے۔ لیکن تخیل کی بیباکی جوان اشعار کو ممتاز کرتی ہے۔ ان میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اور تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ مثلاً حمد میں کہا ہے ع اے فلکہا حبابِ قلزمِ تو

یا ایک فارسی مصرع ہے:۔ خوشا کہ گنبدِ چرخِ کہن فرو ریزد

یا ؎ از مہرِ جہانتاب اُمیدِ نظرم نیست ایں تشت پُر از آتشِ سوزاں بسرم ریز

قدیم یونانی ڈرامہ میں ٹریجیڈی کا ہیرو ایک غیر معمولی اوصاف کا آدمی ہوتا تھا۔ جن مشکلوں سے اُسے واسطہ پڑتا۔ وہ انسانی بس کی نہ ہوتیں۔ مگر وہ پھر بھی ہمت نہ ہارتا۔ غالب نے اپنی زندگی کے متعلق بھی یہی خیال تشبیہوں کی مدد سے ظاہر کیا۔ اور ان میں سے ایک دو تو اسقدر موزوں ہیں کہ ان سے بہتر خیال میں نہیں آ سکتیں۔ مثلاً:۔

بوادیٔ کہ دراں خضر را عصا خُفتست
بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خُفتست

یعنی زندگی کی ایسی دشوار گزار وادی میں جہاں خضر کی راہنمائی بھی کام نہیں اور جہاں میرے پاؤں چلنے سے عاجز ہیں وہاں میں سینہ کے بل چل رہا ہوں۔

غالب نے ایک اور جگہ اپنی اس جسارت (اور انسانی بےبسی) کی تصویر نہایت واضح اور موثر تشبیہوں کی مدد سے پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

می ستیزم با قضا از دیر باز خویش را بر تیغ عریاں میزنم
لعب با شمشیر و خنجر میکنم بوسہ بر ساطور و پیکاں میزنم

اشعار کی شرح

غالب نے اپنی اس خصوصیت شاعری کی نسبت ایک اردو غزل میں اشارہ کیا ہے:۔

مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام چلتا نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

مطلب یہ ہے کہ ایک شاعر جو الفاظ اور استعارے اپنے اشعار میں استعمال کرتا ہے۔ اُن کا شاعرانہ مفہوم اُنکے لفظی معنوں سے مختلف اور کہیں وسیع ہوتا ہے۔ اور ان الفاظ اور استعاروں کی قیمت کاغذی نوٹوں کی طرح ان کی ظاہری حیثیت پر موقوف نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی قیمت وہی ہے۔ جو قلمرو شعر و تخیل میں ان کے لئے قرار دیگئی ہو۔ یہ مرزا کے کلام کی خصوصیت ہی نہیں۔ بلکہ یہ ایک عام حقیقت ہے۔ کہ شعر کا صحیح حظ انہیں لوگوں کا حصہ ہے۔ جو خود بھی قوتِ متخیّلہ سے بہرہ ور ہیں۔ اور جو شعر کے لغوی معنوں میں پھنسکر نہیں رہجاتے۔ بلکہ اپنی قوت متخیلہ کی مدد سے اس وجدانی کیفیت کو محسوس کرسکتے ہیں۔ جسے شاعر نے محسوس کیا۔ اور جسکے اظہار کیلئے الفاظ آخر ایک ناتمام ذریعہ ہیں۔ دیوان غالب کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں لیکن بالعموم وہ ان عالم فاضل لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ جو لسانیات کے بڑے ماہر ہیں۔ اور جنہوں نے الفاظ کی خاطر کئی جگہ شعریت کو قربان کردیا ہے۔ اور یہ امر واقعی ہے کہ اگر ایک شاعر کی ترجمانی کیلئے بہترین طریقہ وہی ہے۔ جو شاعر اپنے اشعار کی وضاحت کیلئے خود استعمال کرے۔ تو دیوان غالب کی اکثر شرحیں اس نقطۂ نظر سے غیر تسلی بخش ہیں۔

ہم بتا چکے ہیں۔ کہ پنج آہنگ کے تیسرے حصے میں غالب نے اپنے فارسی اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ اور ان کا محل استعمال بھی بتایا ہے۔ ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ بادی النظر میں جو معانی انکے اشعار سے لئے جاسکتے ہیں۔ انکے علاوہ بھی کئی مطالب انکے خیال میں ہوتے تھے۔ مثلاً ان کا ایک مشہور شعر ہے:۔

خوش است کوثر و پاکست بادہ کہ در دست
ازاں رحیق مقدس دریں خمار چہ حظ

حالی نے تو اسے فقط "رندانہ" بتایا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا مفہوم عام اور وسیع تھا۔ انہوں نے اسکا محل استعمال لکھا ہے۔ "گزارش اینمعنی کہ وعدۂ لطف در مستقبل چارۂ ناکامیٔ حال نمی تواند بود۔"

اسی طرح ایک فارسی شعر کا دوسرا مصرعہ ہے :-

آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

اسکی نسبت وہ لکھتے ہیں " بشرح ماجرائے خوئے دوست عتاب آمیختہ بناز " یعنی گلاب اور شراب سے ناز اور عتاب مراد لیئے ہیں ۔ حالی نے بھی کلام غالب کی دوسری خصوصیت کے ضمن میں کئی ایسے اشعار لکھے ہیں ۔ جن میں مرزا نے استعارے اور تمثیلیں استعمال کی ہیں ۔ اور اگر ان کے لفظی معنی لئے جائیں تو مطلب خبط ہوجاتا ہے ۔ یا شعر کا مرتبہ بہت پست ۔ مثلاً :-

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

یعنی اس شعر میں قطرے کو گہر ہونے تک جن حالتوں سے گزرنا پڑتا ہے ۔ ان کی بحث نہیں ۔ بلکہ " جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے ۔ وہ صرف اسقدر ہے ۔ کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے "

لیکن غالب اور حالی کی اس ترجمانی کے باوجود عام شارحوں نے اپنی شرحوں میں فقط مشکل الفاظ کی وضاحت کر دی ہے اور شاعر کا اصل مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کی نتیجہ یہ ہے کہ اکثر حالتوں میں اگرچہ لفظی مشکلات دور ہوگئی ہیں ۔ شعر کے معنی صاف نہیں ہوئے مثلاً غالب کا مشہور مطلع ہے :-

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا　　زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

اگر اس شعر کی شرح فقط یہی کر دی جائے ۔ کہ " ..... جب تک یہ زخم بھرے گا ۔ میرے ناخن بھی بڑھ جائینگے ۔ اور میں پھر اس زخم کو نوچ ڈالونگا " اور یہ کہدیا جائے کہ " ایسے شعر اردو کیلئے مایہ ناز ہیں اور غالب کو غالب انہیں اشعار نے بنا دیا ہے " تو ظاہر ہے کہ اگرچہ شارح نے شعر کا مضمون سادہ نثر میں لکھدیا ہے ۔ شعر کے معنی واضح نہیں ہوئے ۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسی صورتوں میں الفاظ سے گزر کر شاعر کے اصل مطلب کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے ۔ تو زیادہ آسانی

ہو۔ مثلاً تشبیہ اور استعارہ سے قطع نظر صاف لفظوں میں اس شعر کا مطلب فقط یہی ہے کہ دوست احباب کی غمخواری سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ جتنی دیر میں یہ غم غلط ہوگا" طبع الم خیز" کی "دردآفرینی" ایک نیا غم پیدا کردیگی۔

غالب کا ایک اور شعر ہے :-

ڈرے کیا میرا قاتل کیا رہیگا اُس کی گردن پر
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

جہانتک مغرب زدہ حضرات کا تعلق ہے۔ وہ تو شعر میں لفظ "قاتل" دیکھکر ہی منہ پھیر لینگے اور ہمیں اُنسے بحث نہیں۔ لیکن دقت یہ ہے کہ غالب کے مداح بھی جو الفاظ سے اس طرح بدک نہیں جاتے اور جانتے ہیں کہ شاعری کی ایک اصطلاح استعمال کرنے سے کلام کی اصل شعریت تباہ نہیں ہوجاتی۔ وہ بھی جب شرحیں لکھتے ہیں تو "دشنہ و خنجر" سے عام ہتھیار اور "بادہ و ساغر" سے پینے کی چیزیں مراد لیتے ہیں۔ مثلاً دیوان غالب کی سب سے مکمل شرح میں مندرجہ بالا شعر کے معنی یہ دیئے ہیں۔ " میرا قاتل اس سے ڈرتا ہے کہ میرا خون اُس کی گردن پر رہیگا۔ مگر اس کا ڈر یہ فضول خضول اور عبث ہے۔ کیونکہ میرا خون ایک جگہ رہتا ہی نہیں۔ تو اس کی گردن پر کیا ٹھہریگا۔ غالباً یہ مضمون مصنف نے نیا کہا ہے۔ اب ممکن ہے شارح نے شعر کی آسان عبارت میں نثر کردی ہو۔ لیکن اسکے باوجود شاعر کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ شاعر کا مطلب ہے کہ معشوق کی وجہ سے مجھ پر جو مصیبتیں آئی ہیں۔ انکے مواخذہ کے خیال سے اُسے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ مصیبتیں تو مجھ پر ویسے ہی آتیں۔ یعنی ع

غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

یا ع تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ایک فارسی شعر میں بھی بالکل یہی مضمون نظم کیا ہے۔

زوارثانِ شہیداں ہراس یعنی چہ

تو یست دستِ قضا کشتۂ ادائے تو کیست

اسی طرح غالب کا ایک اُردو شعر ہے :-

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاشکے مکاں اپنا

اس شعر میں ایک لطیف کنائے سے بتایا ہے کہ ہمارا مکان تو عرش پر ہے - اور خواہش ظاہر کی ہے کہ اگر اپنا مکان عرش سے بھی اوپر ہوتا - تو ہم اپنے موجودہ منظر سے بھی ایک اور بلند منظر بنا سکتے - یہ شعر غالب کے بہتر نشتروں میں سے نہیں - اور نہ ہی اس میں کوئی عمیق فلسفہ ہے - لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ ذیل کی تنقید کا بھی مستحق نہیں -

" اگر حیدرآباد سے کسی شخص کو لندن جانیکے وسائل حاصل ہو جائیں - اور وہاں پہنچ کر سب سے اونچی چوٹی (؟) پر جا بیٹھے - تو وہ یقیناً قدیم لندن کی سرزمین پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکے گا لیکن اصل مرحلہ تو یہ ہے - کہ پہلے وہ لندن جائے اور پھر اسکو وہاں کے مشہور و معروف گرجا پر چڑھنے کا موقع حاصل ہو ؟ کیا غالب کو اپنی اس زندگی میں کبھی عرش کے آستانہ تک بھی رسائی ہوئی ؟"

اس شعر میں کوئی دور از کار استعارہ تو نہیں - لیکن ہمارا خیال ہے کہ اگر فاضل نقاد شاعر کے الفاظ سے گزر کر جس جذبے سے متاثر ہو کر (خواہ وہ شاعرانہ تعلّی ہی کیوں نہ ہو) شاعر نے یہ مضمون نظم کیا ہے - خیال میں لاتے - تو وہ شعر کو اس انوکھی تنقید کا مستحق نہ سمجھتے - اور شاعر سے ثبوت نہ مانگتے کہ اُسے عرش پر کب رسائی ہوئی !

یہ صحیح ہے کہ استعارۃً معنی مراد لینے میں اختلاف کا بہت موقع ہے - اور جب ہم دیکھتے ہیں - کہ دیوان حافظ کی خوش اعتقادوں نے کیا گت بنائی ہے - تو دیوان غالب کی نسبت اس رائے میں کہ ظاہر معنوں کے علاوہ بھی کوئی معنی ڈھونڈے جائیں ، بحث کی بڑی گنجائش معلوم ہوتی ہے - لیکن آخر جو حضرات دیوان حافظ کی شرح لکھتے وقت آنکھیں بند کر کے " ساقی کی بجائے " مرشد " اور اور شراب کی بجائے " علم معرفت " لکھ دیتے ہیں - اُن کی شعر فہمی بھی تو انہیں حضرات کی سی ہے -

جو شعر سمجھتے وقت اپنی قوتِ متخیلہ کو بالکل کام میں نہیں لاتے۔ اور شعر کے لفظی معنوں سے آگے نہیں بڑھتے۔ ہمارا اس بحث سے مدعا فقط یہ اظہار ہے کہ جب غالب نے اپنے اشعار کو ظاہری مفہوم سے زیادہ وسیع معنی پہنائے ہیں۔ اور جب حالی نے بھی کلام غالب کی دوسری خصوصیت کے ذیل میں واضح کیا ہے۔ کہ غالب نے استعارہ کنایہ اور تمثیل کا استعمال زیادہ کیا ہے۔ اور کئی اشعار کے کنائتاً معنی لینے سے اُن کا لطف زیادہ ہو جاتا ہے۔ تو دیوان غالب کے فاضل شارحین کو بھی چاہیئے۔ کہ وہ اشعار کے لفظی معنی سمجھتے وقت اپنی قوتِ متخیلہ سے بھی کام لیں۔ اور شاعر کا اصل مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں۔ ورنہ آج کل مشکل الفاظ کی بجائے سہل الفاظ تو لکھدیئے جاتے ہیں۔ لیکن شعر کا مطلب خبط ہو جاتا ہے۔

غالب کی شاعری کے چار دَور

ہم نے کلام غالب کو ردیف وار نہیں۔ بلکہ سنِ تصنیف کی ترتیب سے شایع کیا ہے۔ ہمارے خیال میں ان کی شاعری کے چار دَور قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ پہلے دور میں وہ اشعار ہیں جو پچیس برس کی عمر سے پہلے لکھے گئے۔ اور جو قلمی نسخہ بھوپالی کے متن میں درج ہیں۔ (۲) دوسرے دَور کے اشعار منتخب دیوانِ غالب کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۴۲) میں شایع ہوئے ہیں۔ لیکن قلمی نسخہ بھوپال کے متن میں موجود نہیں۔ جیسا کہ ہم آئندہ سطور میں بتائینگے۔ ان میں سے اکثر اشعار ۱۸۳۲ء یا اس سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ اور ان کا معتدبہ حصہ گلشن بیخار میں انتخاب ہو چکا ہے۔ جو ۱۸۳۲ء میں لکھی گئی۔ (۳) تیسرا دَور مرزا کی فارسی شاعری کا دور ہے۔ مرزا کی تحریروں اور دوسرے قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ غالباً انہوں نے ۲۹-۳۰ سال کی عمر میں اردو شاعری ترک کر کے فارسی شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ اور اسکے بعد اگرچہ وہ کبھی کبھار اردو شعر کہہ لیتے تھے۔ اسوقت سے لیکر اس زمانے تک جب قید کے بعد ان کا دربار سے تعلق استوار ہوا۔ انہوں نے بیشتر فارسی اشعار ہی لکھے۔ (۴) چوتھا دَور ان کا درباری دَور سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اگرچہ ذوق زندہ تھا۔ اور مرزا ظفر کے استاد نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اس زمانے کی بیشتر غزلیں یا تو بادشاہ کے پاس بطور سوغات

پہچانے کیلئے لکھی گئیں۔ یا قلعہ شاہی کے مشاعروں میں پڑھنے کیلئے۔

کلام غالب کی اس تدوین سے ہم نے مرزا کی شاعرانہ شخصیت کو نئے طریقے سے پیش کرنیکی کوشش کی ہے۔ اور جب اس نقطۂ نظر سے ان کے کلام کا غائر مطالعہ ہوگا تو یقین ہے کہ مرزا کی شاعری کا ارتقا زیادہ وضاحت سے لوگوں کی نظر کے سامنے آ جائیگا۔ ہمیں کچھ باتیں اس تدوین کے دوران میں قابل ذکر معلوم ہوئی ہیں۔ ان کا ملخص نذر ناظرین ہے۔

ابتدائی دور ابتدائی دور کی نسبت عام طور پر معلوم ہے۔ کہ فارسی الفاظ اور تراکیب کی کثرت سے زبان بہت ثقیل ہوگئی تھی۔ اور چونکہ مضامین بھی عجیب و غریب اور عام مشاہدہ یا دنیائے شاعری سے بہت دور تھے اس لئے ان اشعار کا سمجھنا آسان کام نہیں۔ اسکے علاوہ یہ اشعار شاعرانہ حسن سے بھی عاری ہیں۔ ان میں آمد کم ہے۔ آورد اور تصنع بہت۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا کی تمام محنت عجیب و غریب خیالات اور دور از کار تشبیہیں ڈھونڈنے میں صرف ہوتی [illegible] کی طرف وہ توجہ نہ کر سکتے تھے۔ مرزا کی اہم ترین خصوصیت انسانی فطرت سے واقفیت ہے۔ جو انکے بعد کے کلام کے ہر صفحے سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ابتدائی دور میں اس کا وجود قریباً عنقا ہے۔ اس زمانے میں نہ صرف اشعار بعید از فہم تھے۔ بلکہ جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے۔ "مضامین بیشتر خیالی" تھے۔ یہ اشعار کسی طبعی یا نفسیاتی حقیقت کا بیان نہیں تھے۔ بلکہ ان کا وجود فقط شاعر کے بے پروا دماغ میں تھا۔ کئی جگہ ان کی بنیاد محض رعایت لفظی پر ہے اور وہ معنوی حسن سے بالکل عاری ہیں مثلاً:۔

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں　　میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں

یا　اسد قربانِ لطف جور بیدل　　خبر لیتے ہیں لیکن بیدلی سے

یا　شاید کہ مر گیا ترا رخسار دیکھکر　　پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا

کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن میں کتابی اور مروجہ تشبیہوں پر زور دماغ صرف کرکے انہیں سے ایک نیا خیال پیدا کرنیکی کوشش کی ہے۔ لیکن اس لئے یہ اشعار حقیقت سے بہت دور رہ گئے ہیں مثلاً

شعرا شانہ کو ہاتھ سے اکثر تشبیہہ دیتے ہیں۔ مرزا نے اس تشبیہہ کو کسی نفسیاتی حقیقت کی وضاحت یا طرزِ ادا کی دلکشی کیلئے تو غالباً کہیں استعمال نہیں کیا۔ لیکن تشبیہہ کے مختلف پہلوؤں پر نظر کر کے اور نئے پہلو سوچ کر انہی پہلوؤں کو مضمونِ شعر قرار دیا ہے۔ مثلاً

کس کا دل زلف سے بھاگا کہ اسدؔ   دستِ شانہ بہ تمنا باندھتے ہیں

ایک شعر میں اس تشبیہہ کو بہ طور تشبیہہ کے استعمال کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی اس کے اتنے دور از کار اور غیر طبعی پہلو پر توجہ کی ہے۔ کہ اس سے نفسِ مضمون میں اور پیچیدگیاں پڑتی ہیں۔ اور کوئی شاعرانہ خوبی بھی پیدا نہیں ہوتی ؎

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں   جوں شانہ پشتِ دست بہ دنداں گزیدہ ہوں

ناصر علی سرہندی اور غنی کے زمانہ میں تو ان اشعار کو "ندرتِ خیال" اور "مضمون آفرینی" کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا لیکن مرزا متاخرین فارسی شعرا سے بہتر مذاقِ شعر رکھتے تھے۔ اور وہ آہستہ آہستہ سمجھ گئے۔ کہ یہ "خیالی قلا بازیاں" کمالِ شاعری نہیں۔

ان خصوصیات کے علاوہ ظرافت جو مرزا کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کا بھی اس زمانے میں نشان نہیں ملتا تصوف کے اشعار بھی ایک دو ہیں اور وہ بھی محض رسمی۔ چنانچہ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ان کا مشہور اردو قصیدۂ منقبت تو ۲۵ سال کی عمر سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ لیکن اس وقت مطلع یہ تھا ؎

توڑے ہے عجزِ تنک حوصلہ بر روئے زمیں
سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں

جب بعد میں فارسی شعرا کے مطالعہ سے یا دوسرے اثرات سے طبیعت پر تصوف کا رنگ زیادہ چڑھا۔ تو انہوں نے مندرجہ بالا مطلع کی بجائے ذیل کا صوفیانہ مطلع لکھ دیا جو

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس زمانے میں انہوں نے کئی ایک قصیدے منقبت میں لکھے۔ اور بہت سی اردو غزلوں میں بھی حضرت علی سے اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ لیکن بعد کی غزلوں میں یہ اظہار اس کثرت سے نہیں مرزا کی اس زمانے کی شاعری کتابی اور دماغی شاعری تھی۔ اور مرزا کی جن خصوصیات پر لوگ سر دھنتے ہیں۔ اُن کا وجود عنقا تھا۔

بادۂ نیم رس یقین سے تو نہیں کہا جاسکتا کہ مرزا نے یہ طرز شاعری کب ترک کیا۔ لیکن چونکہ نسخہ حمیدیہ میں صاف اور اعلیٰ درجہ کے اشعار کی تعداد بہت کافی ہے قیاس ہے کہ ۲۰ - ۲۲ سال کی عمر تک یعنی دہلی آنے کے پانچ چھ سال بعد وہ ابتدائی طرز بالکل ترک کر چکے ہونگے۔ مرزا نے جس طریقے سے اپنا اسلوب شاعری بدلا۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے۔ کہ ذیل کے مطلعوں والی غزلیں اور اپنا اردو کا بہترین قصیدہ وہ ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھ چکے تھے۔

؎ حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد	بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
؎ آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک	کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
؎ بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی	سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
؎ درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے	کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
؎ نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی	امتحاں اور بھی باقی ہیں تو یہ بھی نہ سہی
؎ جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی	مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
؎ آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے	ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مندرجہ بالا غزلوں کے علاوہ بھوپالی نسخہ میں کئی صاف اور بلند پایہ اشعار ایسے ہیں جنہیں بیدل کا رنگ بہت پھیکا پڑ گیا ہے۔ اور جو دورِ ثانی کے بہترین اشعار کے ہم پایہ ہیں۔ مضمون اور زبان کی خصوصیات کے لحاظ سے تو یہ اشعار دوسرے دور کے اشعار کے ساتھ ترتیب دیئے جانے چاہئیں لیکن چونکہ سوائے قیاس آرائی کے اُن کی تدوین کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ ہم نے خارجی

شہادت کی بنا پر انہیں نسخہ بھوپال کی باقی غزلوں کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ویسے یہ ظاہر ہے کہ ۲۵ برس کی عمر تک مرزا نے جو اشعار لکھے وہ اس زمانے کی یادگار ہیں۔ جب ان کی زبان آہستہ آہستہ صاف ہو رہی تھی۔ اور خیالات اور مضامین بھی شگفتہ اور سہل الفہم ہوتے جاتے تھے۔ اس دَورِ ارتقا کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن میں بیدل کا رنگ غالب تھا اور کئی نہایت صاف مثلاً:۔

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی

دوسرا دَور

دوسرے دَور میں ہم نے وہ اشعار درج کئے ہیں۔ جو نسخہ بھوپال کے بعد لکھے گئے۔ لیکن ۱۸۴۲ میں دیوان کا جو ایڈیشن طبع ہوا۔ اس میں موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب یہ دیوان کلکتہ جانے سے پہلے ہی مرتب کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ کلکتہ سے حکیم احسن اللہ خاں کو لکھتے ہیں۔" سطرے چند کہ بدیباچگی دیوان ریختہ کسوت حرف و رقم پوشیدہ ۔۔۔ ارمغاں معطر ستم"۔ قرین قیاس ہے کہ یہ وہی دیباچہ ہوگا۔ جو مرزا نے اردو دیوان کے آغاز میں فارسی میں لکھا۔ اور جس میں دیوان ریختہ کے انتخاب کرنے کا بھی ذکر ہے۔ اسکے علاوہ اس دَور کی کئی غزلیں جو نسخہ بھوپال کے حاشیہ پر موجود ہیں۔ بقول ڈاکٹر لطیف کے ۱۸۳۲ سے پہلے لکھی گئیں۔ اور گلشن بیخار میں بھی جو ۱۸۳۲ میں لکھی گئی۔ اس دور کی کئی غزلوں کا انتخاب اور پرانی غزلوں کے کئی تتمے موجود ہیں جن سے یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ غالب نے پرانی غزلوں کی اصلاح اور تکمیل ۱۸۳۲ سے اور غالباً کلکتہ جانے سے پہلے ہی کر لی تھی۔ مرزا کلکتہ ۱۸۲۷ میں گئے۔ اور وہاں قریباً ڈیڑھ دو سال رہے۔ اس اثنا میں انہوں نے اور اشعار بھی لکھے ہیں۔ لیکن کلام کا زیادہ حصہ فارسی میں ہے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ مرزا اس زمانے میں اردو اشعار بہت کم کہتے تھے۔ جب تک دربار سے تعلقات کی وجہ سے انہیں اردو پر زیادہ توجہ نہ کرنی پڑی وہ فارسی اشعار ہی لکھتے رہے۔ وہ خود ایک فارسی خط میں نائب والی حیدر آباد کو لکھتے ہیں۔" در آغاز ریختہ گفتمے و بہ اردو زبان غزل سرائے بودمے تا بپارسی ذوقِ سخن یافت۔ ازاں وادی عنانِ اندیشہ برتافت دیوانِ مختصرے از ریختہ فراہم آورد و آنرا گلدستۂ طاق نسیاں کرد۔ کما بیش

سی سال است کہ اندیشہ پارسی سگال است"۔ اس خط اور مرزا کی دوسری تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ منتخب دیوان مرتب کرنے کے بعد انہوں نے بہت دیر تک اردو شعرگوئی کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور سوائے چند قطعوں اور غزلوں کے انکے جو اشعار ۱۸۴۲ میں شایع ہوئے وہی تھے جنہیں وہ ۱۸۲۶ یا شاید سفر کلکتہ سے پہلے لکھ چکے تھے۔

نفسیاتی ژرف بینی دوسرے دور میں آئینہ طبیعت کا زنگ صاف ہوگیا ہے۔ فارسی ترکیبیں بہت کم ہیں۔ اور خیالات بھی صاف اور خوشگوار ہیں۔ کلام میں بیدل اور صائب کی بجائے عرفی اور نظیری کا رنگ غالب ہے۔ تشبیہیں نیچرل اور موزوں ہیں اور اظہار خیالات میں خلوص بہت نمایاں ہے۔ لیکن اس دور کی اہم ترین خصوصیت نفسیات انسانی کے متعلق شاعر کی معلومات ہیں۔ جو دیوان غالب کے صفحے صفحے پر ظاہر ہوتی ہیں۔ ہم بیشتر غالب کا بیان نقل کر چکے ہیں۔ کہ جب ہوش آیا۔ تو عرفی اور نظیری کی تقلید نے اُسے اس سراب سے نکالا جس میں بیدل کی تقلید اُسے لے گئی تھی۔ عرفی اور نظیری کی مقبول ترین خصوصیت معاملہ بندی تھی جس میں عشق و محبت کی کیفیتیں بیان ہوتی تھیں۔ لیکن معاملہ بندی کا دائرہ بہت تنگ تھا۔ محبت کی وسیع اور متفاوت دنیا میں سے فارسی شعرا نے چند حالتیں انتخاب کر لی تھیں اور انہیں کو مختلف و لآویز طریقوں سے بیان کر دیا جاتا تھا۔ غالب کے پیش نظر بھی انہی شعرا کے نمونے تھے۔ لیکن اس کی نظر اکبری شعرا سے بہت وسیع تھی۔ اور محبت کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھی۔ مثلاً پرانے شعرا کے نزدیک فقط عاشق ہی نامراد اور مایوس ہوتا تھا۔ اور دوسرے سب کامیاب۔ لیکن مرزا کی نظر اپنی ناکامی اور مایوسی کی چٹان سے ٹکرا کر رک نہ جاتی۔ اور فرط جذبات کے باوجود بھی وہ زندگی کی صحیح تصویر ہی دیکھتے۔ چنانچہ اسبارے میں انکے کئی شعر ہیں۔ جو مشرقی عشق کے رسمی نقطۂ نظر سے بہت مختلف ہیں مثلاً

عشق کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
تمہاری طرز روش جانتے ہیں ہم کیا ہے

یا

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

ایسے اشعار کئی ہیں۔ لیکن ایک فارسی شعر تو بہت ہی پُر لطف ہے۔

ماہم بہ لاغ ولابہ تسلی شویم کاش   ناداں زبزمِ درست چہ خوشنو میرود

اس خصوصیت کے علاوہ کہ مرزا کی نظر محبت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ ایک توجہ طلب خصوصیت مرزا کی ژرف بینی ہے۔ یعنی ان کی نظر محبت بلکہ انسانی زندگی کے ان حقائق پر پڑتی ہے۔ جنکی طرف عام طور پر خیال نہیں جاتا۔ اوران کے کئی اشعار میں ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ جو بظاہر غلط یا عجیب اور توقعات کے خلاف نظر آتے ہیں۔ لیکن جب ان پر غور کیا جائے۔ تو اُن کی درستی سمجھ میں آتی ہے۔ اور وہ انسانی فطرت اور واقعات کے عین مطابق معلوم ہوتے ہیں غالب نے ۲۶ برس کی عمر سے بیشتر ہی دو شعر ایسے لکھے تھے۔ جو اس خصوصیت کی بہترین مثال ہیں۔ اور جنہیں پڑھکر حیرانی ہوتی ہے۔ کہ شاعر کی نگہ خارا شگاف پر وہ حقیقت کیسے عُریاں ہوگئی جس پہ ہماری سطحی سوچ کی وجہ سے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ وُہ اشعار یہ ہیں۔

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے   تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھکو کیا معلوم تھا ہمدم   کہ ہوگا باعث افزائش دردِ دروں وہ بھی

مرزا اگر اپنا بیان محبت تک ہی محدود رکھتے۔ اور اسکی گوناگوں کیفیتوں کو اس وسعت اور بالغ نظری سے بیان کردیتے۔ تو بھی مشرقی شعرا میں وہ بے نظیر تھے۔ لیکن مرزا فقط قلمروِ محبت کے رازداں ہی نہیں تھے۔ بلکہ محبت کے علاوہ انسان کی باقی کیفیتوں سے بھی خوب واقف تھے۔ دوسرا شعر جو ہم نے نقل کیا ہے۔ حقیقتاً فقط محبت سے متعلق نہیں۔ بلکہ انسان کی عام جذباتی زندگی پہ صادق آتا ہے چنانچہ اس زمانے میں لوگ پروفیسر جیمس کے اس نظریے سے عام طور پہ متفق ہیں۔ کہ انسانی جذبات ان جذبات کے اظہار سے بڑھتے۔ بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جب شروع شروع میں جیمس نے یہ نظریہ پیش کیا۔ تو سائینسدانوں کو بہت عجیب معلوم ہوا۔ اور آج بھی عام توقعات کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ معلم نفسیات کے ایک مسئلہ کو دلائل اور مثالوں سے ثابت کرنے میں اور ایک شاعر کے اپنے احساسات نظم کردینے میں بہت فرق ہے۔ لیکن آخر یہ ایک امر واقع ہے۔ کہ مرزا نے یہ شعر جیمس کی کتاب سے بہت پہلے لکھا تھا۔ اور شاعر کی چشم بصیرت اس " راز نہاں روزگار سے

"محرم" ہوگئی تھی۔ جس کیلئے سائینسدان کو ابھی برسوں انتظار کرنا تھا۔ یہی وہ اشعار ہیں جنکی نسبت کہا ہے۔

مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم ‏ ‏ ‏ ورائے شاعری چیزے دگر ہست

غالب کے اس قبیل کے اشعار جنمیں انسانی قلب کی وہ کیفیتیں نظم ہیں۔ جو بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ بہت ہیں۔ ہم ان میں سے چند درج ذیل کرتے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے۔ کہ غالب کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن کی دلچسپی جوں جوں ہمارا نفسیات کا علم وسیع ہوتا جائیگا۔ اور بڑھتی جائیگی۔ مثلاً

ع ‏ ‏ شوق کو منفعل نہ کر، ناز کو التجا سمجھ

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلاست ‏ ‏ ‏ قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے ‏ ‏ ‏ تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُسنے کہا ‏ ‏ ‏ مینے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے[1]

لفظی صناعی

مرزا نے ابھی دور میں اردو دیوان منتخب کیا۔ اور اشعار کی کمی بیشی کے علاوہ الفاظ اور تراکیب میں بھی ترمیم کی۔ مرزا کی شاعری کے مطالعہ کیلئے یہ حک واضافہ بہت دلچسپ ہے۔ ان میں سے بیشتر اصلاحیں تو زبان کو سادہ بنانے کیلئے کی گئی ہیں۔ اور دقیق فارسی الفاظ یا تراکیب کی جگہ آسان الفاظ لکھدیئے ہیں۔ یا جن الفاظ میں کوئی سقم تھا۔ انہیں بدل دیا ہے۔ مثلاً؎

گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط ‏ ‏ ‏ شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

پہلے یہ شعر یوں تھا۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط ‏ ‏ ‏ شعلہ خس میں جیسے خوں در رگ نہاں ہو جائیگا

[1] ۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے۔ کہ مرزا کے رشک کے اشعار جو بعض لوگوں کو بہت پسند ہیں نفسیاتی حقیقت پر مبنی نہیں۔ غالب میں انائی کیفیت بہت نمایاں تھی۔ اور یہ قدرتی امر تھا۔ کہ وہ رشک کے بہت سے مضامین لکھتے۔ لیکن ان اشعار میں اکثر انہوں نے ایک خیال کو لیکر مبالغہ اور شوخی سے اسقدر کام لیا ہے۔ کہ اگرچہ مضمون پر لطف ہوگیا ہے مگر نفسیاتی حقیقت دبکر نظر سے پنہاں ہوگئی ہے۔

یا   بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل   جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پہلے یہ شعر یوں تھا ؎

عشرت ایجاد چہ بوئے گل وکو دودِ چراغ   جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

بعض جگہ چند الفاظ کے بدلنے سے مختلف مضمون پیدا ہوگیا ہے۔

مثلاً ؎ ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام   مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزار باد یاں

پہلے یہ شعر اس طرح تھا۔

ہے مری وحشت عدوئے اعتبارات جہاں   مہر گردوں ہے چراغِ رہگزار باد یاں

یا ؎ نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی   سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

پہلے مضمون اس سے قدرے مختلف تھا۔ ؎

نہیں بند زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر   سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

شروع میں کئی دفعہ تشبیہیں یا الفاظ کسی مضمون یا لفظ کی رعائت سے لکھے تھے۔ لیکن اس سے مضمون زیادہ دقیق ہوجاتا۔ غالب نے انتخاب کے وقت اس لفظی رعایت کو قائم نہیں رکھا۔ اور زبان کو سہل کرنے کیلئے اسکو بدل دیا ہے۔ مثلاً ان کا ذیل کا شعر مشہور ہے۔

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد   مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

پہلے "حسرتِ دل" کی رعائت سے "گنہ" نہیں بلکہ "بے گنہی" لکھا تھا۔ اور یہ شعر یوں تھا۔

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد   مجھ سے حساب بے گنہی اے خدا نہ مانگ

یا ؎ ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو   ہیں وبالِ تکیہ گاہ ہمتِ مردانہ ہم

پہلے "تکیہ گاہ" کے خیال سے "گراں خوابی" لکھا تھا۔ لیکن لفظی رعائت قائم رکھنے سے مضمون پیچیدہ ہوجاتا چنانچہ انہوں نے پہلا مصرعہ بدل کر مضمون صاف کر دیا۔ نقش اول حسب ذیل تھا۔

ضعف نے باندھا ہے پیمانِ گراں خوابی اسد   ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

زبان کی اس ترمیم اور الفاظ کے تغیر و تبدل کے علاوہ غالب کے کلام میں کئی جگہ ایک خیال

مختلف صورتوں میں نظم ہوا۔ یعنی نفسِ مضمون اصولاً تو ایک ہے۔ لیکن خفیف فرق سے مختلف اشعار میں مختلف طریقوں سے ادا ہوا ہے۔ بعض جگہ تو یہ مضامین ایسے ہیں۔ جو خود شاعر کو مرغوب ہیں۔ (مثلاً بہشت کا استہزا۔ انسانی قلب کی فطری غمگینی۔ انسان کی بےبسی۔ رشک۔ مذہب کے معاملہ میں آزاد خیالی وغیرہ) اور چونکہ شاعر کے دل میں ان کا ہجوم رہتا تھا۔ شاعر انہیں بار بار نظم کرنے پر مجبور ہوتا تھا لیکن اسکے علاوہ بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعر کو ایک مضمون سوجھا۔ اور اُسنے اُسے نظم کر دیا لیکن شاعر پہلے اظہار سے مطمئن نہیں ہوا۔ اور وہ خیال اُسے گدگداتا رہا حتےٰ کہ وہ نقشِ ثانی میں بہتر طریقے سے ادا ہوا۔ مثلاً غالب کا شعر ہے۔

؎ سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا　　　یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

مضمون بہت بلند پایہ نہیں۔ اور اسمیں کسی شاعرانہ رفعت کی گنجائش کم ہے۔ لیکن جہانتک طرزِ ادا کی لطافت اور زبان کی تاثیر اور (ظاہری) بیساختگی کا تعلق ہے۔ نقشِ ثانی، نقشِ اول سے بہتر ہے۔

؎ مرگیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے　　　بیٹھنا آکے وہ اس کا تری دیوار کے پاس

یا ؎ وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دلکے پار　　　جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

خیال نفیس تھا۔ لیکن لفظی رعایت نے شاعر کے مطلب پر خفیف سا پردہ ڈال دیا تھا۔ نقشِ ثانی شاعر کے شاہکاروں میں سے ہے۔ اور اسمیں لطفِ بیان نے خیال کو اس طرح چمکا دیا ہے کہ اس سے بہتر طریقِ اظہارِ خیال ہیں نہیں آسکتا ؎

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے[1]

مندرجہ بالا مثالوں سے اور الفاظ کی اصلاح اور ترمیم سے ایک اور بات بھی۔ شن ہوجاتی

---

[1] ۔ اس شعر کا لطف خالص وجدانی ہے۔ ہمارے ایک دوست پڑھکر فرمانے لگے۔ کہ دیکھو واقعی نگہ میں نگاہ سے ایک الف کم ہے۔ ان کا فرمانا بجا۔ لیکن شارحوں کی انہی فاضلانہ موشگافیوں سے شاعر کے اصل مطلب پر پردے ڈالے جاتے ہیں۔ ہائے　　　شعر مرا بمدرسہ کہ برد۔

ہے۔ کہ خیالات سے قطع نظر غالب کو طرز بیان کا بہت خیال رہتا تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خیالات غالب کے اعلیٰ ہیں۔ اور زبان ذوق کی۔ اور اگر زبان سے مطلب روزمرہ اور محاورات کا استعمال ہے۔ جو ایک جگہ مقبول ہیں تو دوسری جگہ ناپسند یا آج مستعمل ہیں تو کل متروک، تو یہ خیال بیشک صحیح ہے۔ لیکن اگر ہم زبان سے مراد لیں الفاظ کا انتخاب، اُن کی ہم آہنگی اور اُن کی نشست۔ تو مرزا کا مرتبہ اس بارے میں تمام شعرا سے بلند ہے۔ الفاظ ان کے لئے اظہار مطلب کا ہی وسیلہ نہیں تھے۔ بلکہ شاعرانہ حسن پیدا کرنیکا ذریعہ۔ اُن کے الفاظ کا استعمال اور انکی ترتیب اسطرح کی تھی۔ کہ معنی اور مضمون سے قطع نظر الفاظ کا ترنم اور انکی ہم آہنگی ہی پر لطف ہوتی۔

مثلاً۔ درد دل لکھوں کبتک جاؤں انکو دکھلاؤں ‏ ‏ ‏ انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

یا۔ ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی ‏ ‏ ‏ جسکو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

سودا کی غزلوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انکی زبان قصیدہ کی زبان ہے۔ اور فارسی ترکیبوں سے تغزل کا رنگ ماند پڑ جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بھاشا میں مٹھاس زیادہ ہے۔ اور یاس و حزن کے اظہار میں وہ زیادہ موثر ہوتی ہے۔ لیکن آخر محبت کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اس میں طرح طرح کی حسیات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور انہیں نظم کرنے کیلئے ایک کامیاب شاعر الفاظ اور بحریں بھی مختلف انتخاب کریگا۔ غالب کی ایک غزل مشہور ہے۔ ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اسمیں محبت کی اس حالت کا بیان ہے جسمیں بجھا ہوا دل جی اٹھتا ہے۔ اور عشق و محبت کے ولولے طبیعت کو پھر بیقرار کرتے ہیں۔ یہ تمام غزل فارسی ترکیبوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن چونکہ جوش و ولولے کا بیان ہے۔ وہ ترکیبیں اظہار مضمون کو اور موثر کرتی ہیں۔ اور جہاں تک ہمارا خیال ہے۔ اردو شاعری میں اس کیفیت کی اس سے بہتر تصویر اور کہیں نہیں

برخلاف اس کے جب مرزا مایوسی اور غم کا بیان کرتے۔ تو فارسی ترکیبیں بہت کم ہوتی تھیں

مثلاً

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ

کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

یا ذیل کی غزل لیجئے جو مندرجہ بالا غزل کی طرح شاعر کے دلِ محزوں کی ایک اور دلآویز تصویر ہے :-

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

تیسرا دور

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ تیسرے دَور میں مرزا نے اردو اشعار بہت کم لکھے۔ اور چونکہ یہ فارسی شاعری کا زمانہ تھا۔ زبان پہ فارسی ترکیبیں بہت چڑھی ہوئی تھیں۔ اس لئے جب کسی موقع پہ وہ عنانِ شاعری اردو زبان کی طرف موڑتے۔ (مثلاً چلتی ڈلی کی تعریف میں) تو اردو میں بھی فارسی ترکیبیں دوسرے دَور سے زیادہ استعمال ہوئیں۔ ویسے اس زمانے کی ادبی کاوش کا ماحصل ان کا فارسی کلام ہے۔ حالی کے بعد کسی نے اس حصہ کی طرف بہت توجہ نہیں کی۔ اور عجیب بات ہے کہ جب لوگ مرزا کی ذہنیت یا ان کے فلسفہ پر تبصرہ کرتے ہیں۔ تو صرف اردو اشعار کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ حالانکہ تیس سے پچاس برس کی عمر تک جو انسانی زندگی کا اہم ترین زمانہ ہے۔ مرزا نے توجہ بیشتر فارسی نظم و نثر کی طرف ہی ملحوظ رکھی۔ اسکے علاوہ چونکہ اردو دیوان میں بیشتر غزلیں ایسی ہیں جن میں عام طور پر تسلسل خیالات نہیں ہوتا۔ ان سے مرزا کے طبعی رجحانات کا اندازہ اس تیقن سے نہیں ہو سکتا جس طرح انکے فارسی قطعات یا قصائد یا مثنویوں سے۔ اور غالب کی دیش بھگتی وغیرہ کے متعلق جو غلط

نظر پڑے ہیں ہوئے ہیں۔ اُنکی نسبت ہمارا خیال ہے۔ کہ اگر تبصرہ نگار انہیں قبول کرنے سے پہلے غالب کی فارسی نظم و نثر کا بغور مطالعہ کر لیتے تو وہ ان غلطیوں کا شکار نہ ہوتے۔

فارسی شاعری

یادگارِ غالب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ مرزا نے فارسی شعر اسوقت سے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ جب وہ آگرہ چھوڑ کر ابھی دہلی نہیں آئے تھے۔ لیکن چونکہ شروع میں زیادہ تر غزلیں اردو ہی میں لکھیں فارسی کی طرف توجہ اسوقت ہوئی جب بیدل کا رنگ ترک ہو چکا تھا۔ اسلئے فارسی دیوان میں سوائے چند ابتدائی غزلوں کے دقیق خیالات اور دور از کار تشبیہوں کی وہ بھرمار نہیں۔ جو انکے ابتدائی اردو کلام میں ہے۔

ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کہ مرزا نے اُردو اور فارسی دونو زبانوں میں فارسی اساتذہ کی پیروی کی ہے۔ اسلئے عام طور پر ان کی فارسی غزلوں کا بھی رنگ وہی ہے۔ جو ان کی اردو غزلوں کا۔ اور جو خصوصیات ان کی اردو شاعری کے متعلق بیان ہوئی ہیں۔ وہی اُن کی فارسی شاعری کا مابہ الامتیاز ہیں۔ چونکہ فارسی کلام اس زمانے کی یادگار ہے۔ جب شعر و سخن کی مشق مدتوں جاری رہ چکی تھی۔ اس لئے پختگی کلام کے لحاظ سے اُن کا کلام ہندوستان کے دوسرے [illegible] شعرا سے کسی طرح کم پایہ نہیں۔ لیکن غالباً یہ صحیح ہے۔ کہ جو قوتِ اظہار انکو اُردو پر تھی۔ وہ فارسی پر حاصل نہیں ہوئی [illegible] مرزا خود کیا کہیں۔ شاعرانہ نقطۂ نظر سے دیوان اردو کا مرتبہ دیوان فارسی سے کسی قدر بلند ہی ہے۔ ویسے فارسی میں مسلسل غزلیات اردو سے زیادہ ہیں۔ کئی موثر غزلوں میں خدا کو مخاطب کر کے حالِ دل بیان کیا ہے۔ اور جو مضامین اردو میں ایک شعر میں فقط "رمز و کنایہ" سے بیان ہوئے ہیں۔ ان کا اظہار فارسی میں صاف صاف ہے۔ چونکہ اس دَور کے اخیر میں طبیعت تصوف کی طرف زیادہ مائل ہو گئی تھی۔ صوفیانہ اشعار بھی بعد کی غزلوں میں بہت ہیں۔

غزلوں کے علاوہ فارسی کلیات میں کئی ایک قطعات بھی ہیں جن میں سے بعض زبان اور خیالات کے لحاظ سے بہت پُر لطف ہیں۔ رباعیات بھی [illegible] — اور بعض بہت خوب ہیں۔

مثنویاں گیارہ ہیں۔جن میں سے "ابر گہر بار" اور "تحفۂ دیر" بہترین ہیں۔قصائد کم و بیش ۶۴ ہیں پہلے ۱۲ خدا، رسولؐ اور ائمہ محترم کی تعریف میں ہیں ۔اسکے بعد ایک قصیدہ اکبر شاہ اور ۵ ابہادر شاہ کے متعلق ہیں۔انکے بعد ملکہ وکٹوریہ کی باری آتی ہے ۔اور تین قصائد ملکۂ انگلستان کی تعریف میں ہیں سوائے چار کے باقی قصائد میں انگریزی حکام اور دیسی راجوں نوابوں کی تعریف کی ہے۔تین قصیدے دوستوں کے متعلق ہیں۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین اور مولینا صدرالدین کی تعریف میں۔آخری قصیدہ جو بہت دلچسپ ہے۔ اپنے متعلق ہے ۔ اور اس میں انسانی قلب کی اس کیفیت کا بیان ہے ۔جسے انہوں نے ایک اردو شعر میں بھی نظم کیا ہے۔

دل میں یاد یار و ذوقِ وصل تک باقی نہیں۔
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مرزا کو ان قصائد پر بہت ناز تھا۔اور اُن کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ مرزا نے انہیں لکھتے وقت تلاش مضمون اور شعر نویسی میں بہت محنت کی ہوگی۔اُن کی تشبیہیں بالخصوص پُر لطف ہیں۔ اور ہم ان میں سے چند ایک کا انتخاب دوسرے حصے میں دینگے۔لیکن یہ خیال بیکار ہے۔کہ یہ قصائد اسی طرح مقبول ہونگے جس طرح انکی غزلیں۔ مدحیہ قصائد کا تعلق عام لوگوں سے زیادہ ممدوح کی ذات سے ہوتا ہے۔ اور ان کا معاوضہ قبول عام نہیں۔ بلکہ وہ صلہ ہوتا ہے جو ممدوح کی طرف سے شاعر کو عطا ہوتا ہے۔ ویسے یہ صحیح ہے کہ ہمارے نئے نقاد جو مرزا کی قصیدہ نویسی کو بطور خود ایک ناقابل معافی جرم سمجھتے ہیں۔ وہ بھی نکتہ چینی کرتے وقت مرزا کے ماحول اور مشرقی شاعری کی تاریخ کو مدنظر نہیں رکھتے۔

چوتھا دَور چوتھا دَور مرزا کا درباری دَور ہے ۔اس زمانے میں مرزا نے کئی فارسی قصائد لکھے ۔اور ایک آدھ فارسی غزل بھی اسی زمانے کی ہے لیکن دربار سے تعلقات استوار ہونیکی وجہ سے مرزا کو بھی درباری زبان کو اپنی زبان بنانا پڑا۔ اور اس زمانے کے اکثر اشعار اُردو میں ہیں۔بیشتر غزلیں ہیں۔جنہیں مرزا نے بادشاہ کو خوش

کرنے کیلئے یا قلعہ کے مشاعروں میں پڑھنے کیلئے لکھا۔ لیکن اُنکے علاوہ کئی قصائد اور قطعات بھی ہیں۔ جو بادشاہ یا کسی شہزادہ کی تعریف میں ہیں۔ جب مرزا نے دیوان ریختہ پہلی دفعہ مرتب کیا تھا۔ تو اسوقت تک کسی رئیس کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ چنانچہ نسخہ حمیدیہ میں کوئی مدحیہ قصیدہ نہیں۔ اسکے بعد قصائد فارسی زبان میں لکھے گئے۔ لیکن درباری دور میں مرزا کو اردو زبان میں بھی کئی مدحیہ قصائد لکھنے پڑے۔ جو اُن کے دیوان میں موجود ہیں۔

ان قصائد میں سے ایک دو کسی قدر پر لطف ہیں۔ لیکن اُس زمانے کی صحیح یادگار انکی اردو غزلیں ہیں۔ اور جہانتک زبان کا تعلق ہے۔ یہ دَور مرزا کی پختگی کا زمانہ ہے۔ انہوں نے بیدل کی پیروی اُنیس بیس برس کی عمر میں ترک کر دی تھی۔ لیکن چونکہ وسیع اور پیچیدہ مضامین سے طبیعت کو اُنس باقی تھا۔ انہیں ایک شعر میں ادا کرنیکے لئے فارسی ترکیبوں کا استعمال گوارا کرنا پڑتا تھا۔ اور دَورِ ثانی کے کئی اشعار میں لطف زبان اور ندرت خیال میں ایک طرح کا تصادم ہے لیکن مرزا نے لطف زبان کیلئے خیالات کو قربان نہیں کیا۔ درباری دَور میں البتہ لطفِ زبان ندرت خیال پر غالب آ گیا ہے۔ اور اخیر میں تو خیالات شگفتہ الفاظ اور دلپذیر طرز اظہار کیلئے محض زنگارِ آئینہ کا کام دیتے ہیں۔

مرزا کی شاعری میں اس نمایاں تغیر کی وجہ دربار سے تعلق تھا۔ بادشاہ اور شہزادے شاہ نصیر کی طرز کے مداح تھے۔ جسے ذوق نے برقرار رکھا تھا۔ چنانچہ مرزا بھی مشاعروں میں دیکھتے تھے۔ کہ وہ غزلیں مقبول ہوتی ہیں۔ جن کی زبان سادہ اور آسان ہو، تشبیہیں اور فارسی ترکیبیں اسقدر ہوں جسقدر آٹے میں نمک اور ان کی بجائے روزمرہ اور محاورہ کی افراط ہو۔ چنانچہ مرزا پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا۔ اور اس دَور کی کئی غزلیں ہیں۔ جن پر ذوق کا رنگ غالب ہے۔ مثلاً انکی وہ مشہور غزل دیکھئے۔ جسکے مقطع میں بہادر شاہ کے ارادۂ حج کی طرف اشارہ ہے۔ اس غزل کا کوئی شعر نہیں۔ جسے ذوق نہ لکھ سکتا ہو۔ مضامین سادہ اور عامیانہ ہیں اور روزمرہ کی افراط ہے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو   کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج　　　اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

ظرافت

لیکن جس خصوصیت نے اس زمانے کے اشعار کو ایک امتیازی رنگ دیدیا ہے۔ وہ مرزا کی شوخی اور ظرافت ہے۔ ابتدائی دور میں مرزا کے اکثر اشعار معمہ تھے۔ شاعرانہ حسن سے عاری، متین اور سنجیدہ۔ لیکن ہم بتا چکے ہیں۔ کہ جوں جوں مرزا نے طبیعت کی زود حسی کو اپنی مضبوط عقل کے قابو میں کر لیا۔ اُن کے اشعار میں ایک طرح کی شگفتگی آ گئی۔ ایک مغربی اہل فکر کا قول ہے۔ کہ جو آدمی احساسات کا بندہ ہے۔ اسکے لئے زندگی ایک ٹریجیڈی ہے۔ اور سوچنے والے کیلئے کامیڈی۔ مرزا قوی احساسات اور جذبات کے مالک تھے۔ لیکن اُن کی فہم و دانش اس سے بھی قوی تر تھی۔ اور جوں جوں انہیں زندگی کے نشیب و فراز سے آگہی ہوئی جن واقعات کیلئے وہ پہلے آنسو بہاتے تھے۔ اب انہیں پر مسکرا دیتے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ مرزا کی شوخی کی اصل بنا انکی جدت طرازی اور ہر بات میں نیا پہلو نکالنے کی عادت تھی۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ جس طریقے سے انہوں نے غم اور رنج کی باتوں میں شگفتگیِ طبع کو برقرار رکھا وہ اُسی آدمی سے ہو سکتا تھا۔ جسنے بقول انکے "سختی و سستی رنج و آرام کو ہموار کر دیا ہو۔ اور جو غم اور رنج کی شدت سے اسقدر اندھا نہ ہو جاتا ہو۔ کہ سوائے رنج و الم کے اور اُسے کچھ نظر نہ آئے۔ ؎

رازدانِ خوئے دہرم کردہ اند
خندہ بر دانا و ناداں میزنم

دنیا کے حوادث میں شاید المناک ترین واقعہ کسی کی موت ہے۔ جس پر دوست کیا دشمن بھی آنسو بہاتے ہیں۔ لیکن اردوئے معلیٰ کے پڑھنے والے جانتے ہیں۔ کہ مرزا نے تعزیت کے موقع پر بھی ظریفانہ انداز قائم رکھا۔ اور اظہار رنج اور تلقین صبر کی بجائے خطوں میں جانفزا لطیفے ہی لکھے۔ موت کی نسبت مرزا کا یہ انفرادی نقطہ نظر کسی حد تک تو ان کی جدت پسندی کی وجہ سے ہوگا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ یہ خاص زاویۂ نگاہ اسی چشم بصیرت کا عطیہ تھا۔ جسنے اُن کیلئے "سختی و سستی اور رنج و آرام سب کو ہموار کر دیا تھا۔ شروع میں جب انہوں نے جذبات

کی باگ عقل کے ہاتھوں میں نہیں دی تھی۔ تو انکے اشعار میں موت کا بیان اسی طرح تھا جس طرح دوسروں کے کلام میں۔ مثلاً "ہائے ہائے" کی ردیف میں ان کی مشہور غزل پڑھیے۔ جو انہوں نے کسی کی وفات پر ۲۳ ۲۴ سال کی عمر میں لکھی تھی۔ اگرچہ مرثیہ بہت پُر درد ہے۔ اسلوب خیال بالکل رسمی اور عامیانہ ہے۔ جب ہم اس کا عارف والے مرثیہ سے مقابلہ کرتے ہیں۔ جو اس سے پچیس تیس برس بعد لکھا گیا۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس عرصے میں شاعر کے نقطۂ نظر میں بہت تبدیلی ہو گئی تھی۔ بعد کے مرثیہ میں مرزا نے ہجوم غم کی وجہ سے اپنا سکون اور توازن [illegible] دیا۔ اور باوجودیکہ موضوع بہت دردناک ہے [illegible] نے اپنی شوخ نگاری برقرار رکھی ہے۔ عارف سے خطاب ہے۔ ؎

تم کونسے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

پچیس تیس برس [illegible] تفاوت سے غالب نے جو دو مرثیے لکھے۔ ان کی طرز تحریر میں جو فرق ہے وہ ان کی عام شاعری میں نمایاں ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں متانت غالب تھی۔ لیکن بتدریج خیالات شگفتہ ہوتے گئے۔ اور اگرچہ اُن کی ظرافت کا بہترین نمونہ انکے اردو خطوط ہیں۔ جو انہوں نے غدر کے بعد لکھے۔ لیکن جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے۔ جو کثرت شوخ اور ظریفانہ اشعار کی درباری دور میں ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔

مرزا کی عام شاعری کا میدان وسیع تھا۔ اسی طرح شوخی و ظرافت کو بھی انہوں نے چند مضامین کیلئے مخصوص نہیں رکھا۔ اُن کی ظرافت بہت پاکیزہ اور فحش سے پاک تھی۔ اور تبسم زیر لب سے آگے کبھی نہ بڑھتی۔ لیکن اس میں رو رعایت کسی کی نہ تھی۔ گاہے گاہے اپنے اوپر بھی ہنس لیا کرتے تھے ؎

غافل ان ماہ طلعتوں کے واسطے	چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ	آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے
غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا	وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

ایک دو جگہ تو شوخی حد سے گذر گئی ہے۔ اور محمل لیلےٰ کی طرف ہاتھ اُٹھتا نظر آتا ہے۔ مثلاً ؎

حسن میں حور سے بڑھکر نہیں ہونے کے کبھی　　آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

یہ ظریفانہ اشعار بیشتر فقط شوخیٔ طبع کا اظہار ہیں۔ لیکن جس کثرت سے اور جس چبھتے ہوئے طریقے سے انہوں نے بہشت کا تمسخر اڑایا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ یہ موضوع دل کو ضرور بھاتا تھا۔

مثلاً　میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں　　کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

یا　کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

یا　ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام　　قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

پانچواں دَور؟

غالب کی شاعری کو ہم نے چار دَوروں میں تقسیم کیا۔ اور غالب نے غدر کے بعد جو فارسی اور اردو اشعار لکھے ہیں۔ ان کا انتخاب چوتھے دَور کے اشعار کے اخیر میں بطور تتمہ کے ترتیب دیا ہے۔ بظاہر تو مرزا غدر کے ۱۱-۱۲ سال بعد زندہ رہے۔ اور انکے اس زمانے کے اشعار کو ڈاکٹر لطیف نے ایک علیحدہ دور شاعری بھی قرار دیا ہے۔ لیکن چونکہ اس تمام مدت میں انہوں نے اردو کی دو تین غزلیں، ایک قطعہ، فارسی کی دو غزلیں، اور چند فارسی قصیدے ہی لکھے ہیں۔ جو ادبی نقطۂ نظر سے بھی اُسی طرز کے ہیں جس طرز کے اُنکے چوتھے دَور کے اشعار۔ ہم نے ان اشعار کو جداگانہ دَور کی تحت میں شائع نہیں کیا۔

غالب کا متداول اردو دیوان　پہلی مرتبہ ۱۸۶۲ء میں شایع ہوا۔ لیکن یہ دیوان اسی قلمی نسخے کی نقل ہے۔ جو مرزا نے ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علیخاں کے پاس بھیجا تھا۔ اس دیوان اور ان اشعار کے علاوہ، جو "نسخۂ حمیدیہ" ایڈیشن میں شایع ہوگئے ہیں۔ غالب کا متفرق کلام تین چار جگہ شایع ہوا ہے۔ ایک اردو غزل، ایک قطعہ، اور ایک غزل کے چند اشعار ان کے رقعات میں ملتے ہیں۔ اور یقیناً غالب کے ہیں۔ ان اشعار کے علاوہ غالب کا "غیر مطبوعہ" کلام جو مختلف رسائل وغیرہ میں شایع ہوا۔ اسے غالب کا نتیجۂ فکر ماننے سے پہلے ہمارے خیال میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے بالخصوص وہ ۲۵-۲۶ غزلیں، جنہیں مولینا عبدالباری آسی نے ایک بے سر و پا بیاض کی بنا پر "شرح کلام غالب" میں شایع کیا ہے۔ یقیناً غالب کی نہیں۔ ان کے علاوہ دو تین غزلیں

اور چند قطعات نواب سعید الدین احمد خاں اور لوہارو خاندان کے دوسرے افراد سے حاصل ہوئے ہیں۔ ممکن ہے وہ سبھی غالب کے ہوں۔ لیکن ان میں بھی بلند پایہ اشعار بہت کم ہیں۔ ہمارے خیال میں فقط ایک ہے

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں مَیں — کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

غالبؔ کی مقبولیّت کی وجوہات

ہم نے مرزا کی شاعری کی خصوصیات جس ترتیب سے وہ کسی دَور میں زیادہ نمایاں تھیں بیان کر دی ہیں۔ لیکن غالب کی غیر معمولی مقبولیت سمجھنے کیلئے وہ کافی نہیں۔ کلام غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ہے۔ جسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے نہایت نفیس طریقے سے بیان کیا ہے۔" لوح سے تمت تک مشکل سے سَو صفحے ہیں۔ لیکن کیا ہے۔ جو یہاں حاضر نہیں۔ کونسا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں"۔ مرزا کی شاعری بیشتر عشق و محبت کا بیان ہے۔ لیکن منطقی آئے تو اُسکے لئے یہاں دلائل و براہین ہیں۔ شگفتہ طبع لوگوں کیلئے شوخی اور ظرافت۔ اور انسانی فطرت کی داستاں سُننا ہو۔ تو یہاں وہ پتے کی باتیں ملینگی۔ جن کا لطف جوں جوں چشمِ بصیرت کھلتی جائیگی بڑھتا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے! اور لطف اُٹھاتا ہے لیکن ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس ساز میں نغموں کی فراوانی اور ہر نغمہ کی دلآویزی کی وجہ یہ ہے۔ کہ کلام غالب سنی سنائی باتوں کا بیان نہیں۔ بلکہ قلبِ غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اس رباب پہ دستِ قدرت نے ایک ایک کرکے سارے سُر بجائے ہیں۔ اور دیوانِ غالب انہی سُروں کی صدائے بازگشت ہے۔ ؂

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم — کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

سر والٹر رالے نے شیکسپیئر کی نسبت لکھا ہے۔" وہ نایاب ترین چیز تھا یعنی ایک پُورا انسان"۔ شیکسپیئر کی نسبت تو یہ رائے اسکی کتابوں کے مطالعہ پر مبنی ہے لیکن جن گوناگوں تجربوں سے مرزا کو واسطہ پڑا تھا اگر انکا شیکسپیئر کے حالات سے مقابلہ کریں۔ تو مرزا کا پلّہ شیکسپیئر سے ہلکا نہیں رہیگا۔ مرزا کی زندگی میں انکے ایک مخالف نے اُن کی نسبت طنزاً لکھا تھا۔" آپ انتخابِ ماں ہیں۔ یکہ دوراں ہیں جس طرف طبیعت آئی۔ اسکی خاک اڑائی چنانچہ

دخترِ رز سے جو تاک لگائی۔ تو وہ ظرف پیدا کیا۔ کہ مینائے گردوں میں شرابِ شفق قاضیِ آفتاب بادب پیشکش لایا۔ اور قماربازی پر جو دھیان کیا۔ تو وہ چھٹے جواری ہوئے کہ میر بساط اور بچھڑے داؤں کھانے لگے"۔ لیکن یہ تصویر کا فقط ایک پہلو ہے۔ مرزا اگر میخانے اور قمارخانے کی پوری طرح خاک چھان چکے تھے۔ تو وہ شرع اور تصوف کی منزلوں سے بھی ناواقف نہ تھے۔ دہلی کے سب سے بڑے عالم مولوی فضل حق خیرآبادی اور مولینا صدرالدین اُنکے عزیز ترین دوست تھے۔ اور جس کثرت سے تصوف کے مسائل انکے اشعار میں ادا ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے شاید ہی کسی اور شاعر میں ملینگے۔ وہ رنگ رلیوں میں پلکر جوان ہوئے تھے۔ لیکن زمانے نے ایک کرکے اپنے ترکش کے سارے تیر اُنپر چلائے اور اگر وہ بزمِ نشاط اور محفلِ عشرت میں اجنبی معلوم نہ ہوتے تھے تو دردمندِ دل کے مصائب بھی خوب سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ میخوار ہو یا محتسب، شوخی اور ظرافت کا متلاشی ہو یا المزدہ۔ فلسفی ہو یا عاشقانہ مضامین کا دلدادہ، ان سب کیلئے کلامِ غالب میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ جسے وہ پڑھتے ہیں اور سر دُھنتے ہیں۔

مرزا کی مقبولیت کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے۔ کہ وہ نئی طرز کے آدمی تھے۔ اور انکے خیالات کا جو اسلوب تھا۔ زمانہ اسکی تائید کر رہا ہے۔ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ مرزا تقلید کے قائل نہ تھے۔ اپنی سمجھ پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ ان کی جدت پسندی نئے مضامین اور نئی تشبیہیں تلاش کرنے تک محدود نہیں تھی۔ بلکہ وضع قطع، پوشش، فنِ لغت، فنِ شعر، انشائے خطوط اور دوسری شخصی اور ادبی باتوں میں بھی وہ اپنے معاصرین اور پیشروؤں کی پیروی کرنا ضروری نہ سمجھتے اور آزادانہ ان پر نکتہ چینی کرتے۔

کلکتہ میں جب انکے اشعار پر اعتراض ہوا تھا کہ انہوں نے قتیل کے وضع کردہ اصولوں کا خیال نہیں رکھا تو انہوں نے نہایت زور سے کہا تھا۔ ؎

زلّہ بردارِ کس چرا باشم   من ہمایم مگس چرا باشم[1]

---

[1] ۔ حال ہی میں ایک نقاد نے اردو ادب پر انگریزی ادبیات کا اثر دکھاتے ہوئے بتایا ہے۔ کہ جدید اُردو شاعری، اُردو نثر اور ادبیات میں اساتذۂ سلف کی تقلید سے آزادی انگریزی ادبیات اور مغربی اساتذہ سے تعلقات کا نتیجہ ہے۔ بڑی حد تک ہم اس رائے سے متفق ہیں۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے۔ کہ حالی، جو بہت حد تک اردو شاعری، فنِ تنقید اور سوانح نگاری میں موجودہ انقلاب کا بانی تھا۔ انگریزی سے قریباً قریباً نابلد تھا۔ غالب خود انگریزی سے بالکل بے بہرہ تھا۔ اور یہ امر بھی بہت عجیب ہے کہ کلکتہ کا مدرسہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا جاری کردہ تھا۔ اور جہاں معلمین اور طلبا کو انگریز افسروں اور اساتذہ سے ملنے کے بہت موقع ملتے رہتے تھے۔ تقلید اور تنگ خیالی کا مرکز بنا ہوا تھا اور غالب جسے یہ مواقع کبھی میسر نہیں آئے تھے۔ آزاد خیالی کا وعظ کر رہا تھا!

یہ آزاد خیالی اور تقلید سے نفرت تمام عمر اُنکی امتیازی خصوصیت رہی اور موجودہ زمانے میں بھی یہی طرزِ عمل زیادہ مقبول ہے۔ اسی طرح مرزا نے اپنے دوستوں کی کتابوں پر جو تبصرے لکھے۔ وہ اگرچہ بہت بلند پایہ اور عمیق نہیں۔ لیکن ان میں اور مغربی طرز کی تقاریظ میں یکبات مشترک ہے۔ کہ وہ کتاب اور مصنف کی تعریف میں مبالغہ سے پاک ہیں۔ اسکے علاوہ زبان اور محاورہ[1] پر مضمون اور خیالات کو مقدم رکھنے کی جو خصوصیت کلامِ غالب میں موجود ہے۔ مغربی شاعری کے تنقیدی اصول بھی اسکے حامی ہیں۔ چنانچہ ان سب باتوں کی وجہ سے موجودہ نسل جس کی تعلیم مغربی اصولوں پر ہوئی ہے۔ مرزا میں اور اپنے خیالات میں دوسرے مشرقی شعرا کی نسبت بہت زیادہ باتیں مشترک پاتی ہے۔

اعتراضات پُرانی طرز کے غزلگو شعرا میں سے موجودہ نسل کو غالب سب سے زیادہ پسند ہے۔ لیکن جن لوگوں نے فنِ تنقید کے عام اصولوں سے گزر کر جزوی اور فروعی باتوں میں بھی مغربی شاعری کی تقلید کو شاعری کی معراج سمجھا ہے۔ انہوں نے غالب کے کلام پر کئی اعتراض کئے ہیں۔ بالعموم یہ اعتراض خاص غالب کے متعلق نہیں۔ بلکہ تمام مشرقی شاعری پر عائد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک اہم اعتراض ہے۔ کہ غالب نے بیشتر غزلیں لکھیں۔ اور غزل شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ایک ناقص ذریعہ ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ غزل کے اشعار میں ربط ردیف اور قافیے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مضمون کی وحدت سے نہیں۔ اور غالب کی اکثر غزلیں الگ الگ اشعار کے مجموعے ہیں۔ لیکن آخر یہ غالب کی بدقسمتی تھی۔ کہ جب اُس نے شعر گوئی شروع کی۔ تو غزل کے علاوہ اور کوئی صنفِ شاعری مقبول نہ تھی۔ اور اسکے علاوہ یہ بھی

---

[1] ۔ مرزا کی قدر شائد دہلی اور لکھنؤ سے زیادہ پنجاب میں ہوئی ہے۔ اور اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ چونکہ پنجاب میں اردو زبان بولی نہیں جاتی۔ لوگ زبان اور محاورہ کی لطیف خوبیوں سے اس طرح لطف اندوز نہیں ہوتے جسقدر خیالات سے۔ اور یہ اتفاق کہ اردو زبان کا مستقبل دہلی اور لکھنؤ سے زیادہ پنجاب سے وابستہ ہوگیا ہے۔ دیوان غالب کی مقبولیت میں اضافہ کا باعث ہوا ہے۔

بے انصافی ہوگی اگر ہم اس امر کا اعتراف نہ کریں کہ غالب کے دیوان میں مسلسل اشعار کی جو کثرت ہے ۔ وہ کسی اور ہندوستانی شاعر کے کلام میں شاید ہی ہوگی ۔ اور اس کی اکثر غزلوں میں کچھ ردیف قافیہ کی ہم آہنگی سے اور کچھ شاعر کے اپنے جذبات کے پرتو سے ایک اس طرح کی فضا پیدا ہوگئی ہے جس میں مختلف اشعار کی انفرادیت کھپ گئی ہے ، اور کوئی تال بے سُر نہیں معلوم ہوتی ۔

غزل پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے ۔ کہ چونکہ غزل میں معنوی وحدت تو کوئی ہوتی نہیں غزلگو شعرا اپنے سامنے چند قافیے رکھ لیتے ہیں ۔ اور انکے مطابق اسوقت جو مضمون ذہن میں آئے ۔ اُسے نظم کرکے غزل مکمل کر لیتے ہیں ۔ اسلئے نہ تو شعر میں آمد ہوتی ہے ۔ اور نہ ہی غزل شاعر کے ذاتی نقطۂ نظر کا اظہار ۔ ممکن ہے یہ خیال کسی اور غزلگو شاعر کے متعلق صحیح ہو لیکن کم از کم مرزا اس سے مستثنیٰ ہیں ۔ انہوں نے خود ایک خط میں اس خیال کی بڑے زور سے تردید کی ہے وہ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں ۔" کیا ہنسی آتی ہے ۔ کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ اُستاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لئے ۔ اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں ۔ لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اسکے قوافی پیش نظر رکھ لئے ہوں ۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل قصیدہ لکھنے لگا ۔" قطع نظر اس امر سے کہ مرزا اس طریق شعر گوئی سے خود بہت متنفر تھے ۔ اُنکے کلام سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ انکی غزلگوئی قافیہ پیمائی نہیں ہے ۔ بلکہ اُنکی اپنی دلفریب شخصیت کا اظہار ۔ ایک شاعر کے خیالات میں بھی عام انسانوں کی طرح تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے ۔ اور اگر آج ایک بات کا ایک پہلو نظر آتا ہے ۔ تو کل دوسرا ۔ چنانچہ دیوانِ غالب میں بھی یہ تفاوت موجود ہے ۔ لیکن دیوان غالب میں مشکل سے ہی کوئی شعر ایسا ملیگا جسے غالب کی اُس عظیم اور متنوع شخصیت سے جس سے ہم یادگارِ غالب کیوجہ سے خوب واقف ہیں ، منسوب نہ کیا جا سکے ۔ مرزا غالب کا زاویۂ نگاہ عام لوگوں

سے کئی باتوں میں مختلف تھا۔ اور انکے اشعار میں انکے اپنے خیالات ہی کی تکرار ہوتی ہے۔ دوسروں کے خیالات کا اظہار نہیں۔ ہم بہشت کی نسبت لکھ چکے ہیں۔ کہ انہوں نے اس کا ذکر ہمیشہ استہزا سے کیا۔ اور یہ انکے شخصی نقطۂ نظر کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح فرہاد کا ذکر انکے اشعار میں کئی جگہ آیا ہے۔ اور سب جگہ طنزاً۔ مذہب کے متعلق انکے بیسیوں اشعار ہیں۔ اور ہر شعر انکی وسعت نظر اور انکے طبعی تشکک کا اظہار ہے۔ اسی طرح رشک کے مضامین ہوں یا انسان کی فطری مجبوریوں کا اظہار۔ ادائے مضمون کے طریقے اگرچہ شعر شعر میں مختلف ہیں۔ لیکن وہ مرزا کے اسلوب خیال کو ہی نمایاں کرتے ہیں۔ اس پر پردے نہیں ڈالتے۔ اور کہیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ مرزا نے ایک مضمون قافیے سے مجبور ہو کر باندھ دیا ہے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ غزل ایک جامہ موزوں ہے۔ جو مرزا کی شخصیت پر راست آیا۔ اور جس نے اس دلفریب شخصیت کو اور نمایاں کر دیا۔

نیچرل شاعری

غزل گوئی کے علاوہ مرزا کی شاعری پر اعتراض کیا گیا ہے۔ کہ ان کی شاعری "نیچرل شاعری" نہیں۔ جب حالی نے یہ اصطلاح اپنے شاہکار "شعر و شاعری" میں پہلی مرتبہ استعمال کی تھی۔ تو اُسنے اس سے وہ شاعری مراد لی تھی۔ جو خیالی نہ ہو بلکہ نیچر یا فطرت کے مطابق ہو۔ اگر کلام غالب کو اس نقطۂ نظر سے جانچا جائے تو اس اعتراض کی صحت قابلِ تسلیم معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگرچہ مرزا نے عام شاعروں کی طرح کئی جگہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اُنکے بیشتر مضامین عین فطرت کے مطابق ہیں۔ اور فطرتِ انسانی کے جوراز اُن کے کلام میں بے نقاب ہوئے ہیں۔ اور شعرا میں بہت کم ہیں۔ لیکن معترضین نیچرل شاعری سے بالعموم مناظر قدرت کی شاعری مراد لیتے ہیں۔ اور ان کی رائے ہے۔ کہ مرزا کے کلام میں یہ بڑا عیب ہے کہ انہوں نے مغربی شاعروں کی طرح مناظرِ فطرت پر نظمیں نہیں لکھیں۔ حقیقتاً یہ اعتراض بھی خاص مرزا کے متعلق نہیں۔ بلکہ اکثر مشرقی شعرا پر کیا جا سکتا ہے۔ اور عموماً وہی لوگ کرتے ہیں۔ جو اپنے بزرگوں کی تقلید سے تو آزاد ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن مغرب کی کورانہ تقلید کو انتہائی

آزاد خیالی اور معراج کمال سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی زبان کی کئی بلند پایہ نظمیں مناظر فطرت کے متعلق ہیں۔ اور انگریزی ادب میں مناظرِ فطرت کی شاعری کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن آخر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگلستان (بالخصوص لیک ڈسٹرکٹس) میں موثر اور شاندار مناظر قدرت کی جو فراوانی ہے۔ وہ ہندوستان یا کم از کم دہلی کے گرد و نواح میں میسر نہیں۔ اور اگر کوئی دہلوی شاعر اس خیال سے مرعوب ہو کر انگریزی شاعری میں مناظرِ فطرت کے متعلق بہت نظمیں ہیں۔ خود بھی اونچے اونچے پہاڑوں اور خوش منظر جھیلوں کے خوبصورت مناظر اور چہچہاتے پرندوں کی موسیقی کو اپنی شاعری کا موضوع بنالے۔ تو ظاہر ہے کہ اس شاعری سے زیادہ اُن نیچرل یا مصنوعی کوئی چیز نہ ہوگی۔ کیونکہ شاعر نے تو خود یہ مناظر دیکھے ہی نہیں۔ گرم ملکوں میں جو لوگ چٹیل میدانوں میں رہتے ہیں۔ انہیں وہ دلفریب مناظر دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ جو قدرت نے فیاضی سے کشمیر یا سوئٹزرلینڈ یا لیک ڈسٹرکٹس میں بہم پہنچائے ہیں۔ انہیں جو خوبصورت مناظر دیکھنے نصیب ہوتے ہیں وہ نسبتاً محدود ہیں۔ مثلاً چاندنی رات، صبح، شام، شفق کی رنگینی، دریا کا کنارہ، بسنت بہار۔ برسات۔ اور اردو زبان میں اگرچہ غزلوں میں نہیں۔ لیکن دوسری اصناف شاعری میں ان مناظر کے متعلق کئی نظمیں ہیں۔ مرزا نے اس صنف شاعری میں کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا۔ اور مناظر فطرت کے متعلق انکے جو اشعار ہیں۔ ان میں ایک طرح کا تصنع اور تکلف ہے۔ لیکن ان کے قصائد اور غزلیات میں ان مناظر کے متعلق کئی اشعار ہیں۔ جو ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ان مناظر سے بے پروا نہیں تھے۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ نیچرل شاعری کی نشو و نما شاعر کے ماحول پر منحصر ہے۔ اور اگر مرزا بھی مخزن کے ابتدائی دور کے بعض شاعروں کی طرح کوؤں اور کیکروں اور چیلوں کی تعریف میں نظمیں لکھتے۔ تو اُنکے کلام کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان نظموں کا ہوا ہے۔

کلاسیکل اردو کے نقادوں نے مرزا کے کلام پر جو اعتراض کئے ہیں۔ وہ یا تو زبان کے متعلق ہیں۔ یا بقول سر والٹر رالے "بہی کھاتہ والوں" کی نقادی، یعنی سرقہ اور توارد کی بحث۔ مرزا یاس

اور مولینا آرگس (مولینا عبدالباری آسی ؟) نے محنت و تفتیش سے اساتذۂ قدیم کے کلام سے کئی شعر ایسے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ جن کے مضامین غالب کے اشعار سے ملتے جلتے ہیں۔ کسی زمانے میں ملٹن کے اشعار کے متعلق بھی اسی طرح کا حساب کتاب ہوا تھا۔ لیکن اس سے اس کی شہرت کو کوئی ضعف نہیں پہنچا۔ کیونکہ ایک تو بقول گوئٹے کائنات میں کوئی چیز بالکل نئی نہیں۔ اور دوسرے ایک شاعر کے چند اشعار میں توارد یا سرقہ بتانے سے اسکے باقی اشعار کی خوبیاں ضایع نہیں ہو جاتیں

غالب کا فلسفہ

ان اعتراضات سے قطع نظر ایک اور مسئلہ جو آجکل معرضِ بحث میں ہے۔ غالب کے فلسفہ کے متعلق ہے۔ غالب کے مداح مُصر ہیں۔ کہ وہ ایک بہت بڑا فلسفی تھا۔ اور اگر فلسفہ سے پیچیدہ اور دقیق خیالات کا اجتماع مراد لیا جائے۔ تو اس بیان سے بہت کم لوگ اختلاف کرینگے۔ لیکن اگر کسی شاعر کے فلسفے سے اس کا انسانی زندگی یا اسکے کسی اہم پہلو کے متعلق کوئی خاص شخصی نقطۂ نظر مراد ہے۔ تو آجتک یہ دعویٰ ثبوت کا محتاج رہا ہے۔ ایک غزل گو کی شاعری کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ جب تک اقبال کی طرح وہ اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی خاص کوشش نہ کرے۔ اس میں چند خیالات کی تکرار کی بجائے مختلف النوع خیالات کا ہجوم ہوتا ہے۔ چنانچہ غالب کے خیالات کے متعلق کوئی بھی نظریہ قائم کیا جائے۔ اس کی تردید کیلئے بیسیوں اشعار مل جائینگے۔ اسکے علاوہ مرزا کا دل ایک ایسا جامِ جہاں نما ہے کہ جہیں ایک ہی نقش بار بار نظر نہیں آتا۔ بلکہ اسمیں فطرت کے تمام نقوش نمایاں ہیں۔ ان کا دل ایک آئینہ ہے۔ جسمیں تمام فطرت کے عکس نظر آرہے ہیں۔ اور ایک تصویر سے دوسری تصویر مختلف۔ یہ ممکن ہے۔ کہ چند نقوش پر پردہ ڈالنے سے اور ایک آدھ کو نمایاں کرنے سے ایک تصویر بنائی جا سکے۔ جسے خوش فہم حضرات غالب کا فلسفۂ زندگی یا پیغام سمجھ لیں۔ لیکن آخر اس کوشش سے فایدہ؟ کیا یہ ضروری ہے۔ کہ ہر شاعر کوئی خاص پیغام یا فلسفۂ زندگی چھوڑ جائے؟ یہ صحیح ہے کہ بعض حضرات ایسے ہیں جن کے نزدیک ایک شاعر کی خوبی اسی میں ہے کہ وہ اپنے خیالات اور احساسات کا نچوڑ رباعیوں اور قطعوں کی صورت میں اُنکے حوالے کردے جنہیں وہ دیواروں پر لگائیں۔ اور روزمرہ کی

زندگی میں اپنے لئے چراغِ راہ بنائیں۔ ان خوش نصیب لوگوں کی طبیعتیں سدھے سدھائے گھوڑوں کی طرح ہیں۔ جو ایک باگ کے اشارے سے جسطرف چاہیں موڑ لی جاسکتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ بلند ترین شاعری ان لوگوں کیلئے نہیں۔ شاعر کا کام عقائد کو بدلنا نہیں۔ بلکہ تخیل کی نشو و نما اور تربیت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی کے راز جو ذاتی احساسات اور مشاہدات کا عطیہ ہیں اگر ان کا نچوڑ حقائق اور فلسفہ کی صورت میں انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب تک تخیل کی تربیت اور نشو و نما اسی شعوری بلندی تک نہ ہو گئی ہو۔ ایک بلند مرتبہ شاعر جو انسانی فطرت کا بھی صحیح نباض ہوتا ہے۔ اس لطیف نکتے سے بیخبر نہیں۔ کہ انسان کے عقائد اور اسکے تخیل میں اکثر ایک خفیف سا تضاد ہوتا ہے۔ اور اگر فلسفۂ زندگی اور پیغام سے ایک شخص کے عقائد بدل دیئے جائیں۔ لیکن دنیائے تخیل (یا غیر شعور) پہلی حالت میں ہی رہے۔ تو یہ تضاد فقط اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اس سے انسانی فطرت ان بلندیوں پر نہیں پہنچتی۔ جنکے حاصل کرنے کیلئے شاعری مفید ہو سکتی ہے۔ وہ ایک شرابخور کو دیکھتا ہے۔ جسے میخواری کے نقائص سمجھا دیئے گئے ہیں۔ اور وہ اسے ترک کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہو گیا ہے۔ کہ شراب خوری بُری ہے۔ لیکن اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کے ذہن کی گہرائیوں میں ایک شرابخور کے خیالات ہی موجزن رہتے ہیں۔ اسکی دنیائے تخیل ایک شرابخور کی ہے۔ گو وہ پرہیزگاری کا فلسفہ بھی خوب سمجھتا ہے۔ اب انسانی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے۔ کہ اس حالت میں شرابخوری کے خلاف جسقدر دلیلیں اسکے سامنے پیش کی جائینگی۔ اُن سے اسکی باطنی کشمکش میں اضافہ تو ہوگا۔ لیکن جب تک اسکی دنیائے تخیل ہی بدل نہ دی جائے۔ وہ اس گڑھے سے باہر نہیں نکل سکیگا۔ اسی طرح بہت ممکن ہے۔ کہ ایک آدمی فلسفۂ عمل کا بہت معتقد ہو۔ صبح شام "اسرارِ خودی" اور "درسِ حیات" کی تلاوت کرتا رہتا ہو۔ لیکن جب عمل کا وقت آئے۔ تو تخیل ساتھ نہ دے۔ بلکہ مخالف ہو۔ اور اُسکے ذہن کی گہرائیوں سے فقط ایسے احساسات اور خیالات پیدا ہوں۔ جن سے وہ عمل غیر ضروری بلکہ مضر معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اگر تخیل کی صحیح تربیت نہیں ہوئی تو اس فلسفۂ عمل سے سوائے ایک ذہنی کشمکش کے

اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اور بقول حکیم ملت کے ؎

برقے کہ بہ خود بپیچد میرد بہ سحاب اندر!

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر بڑا شاعر زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔ اور انتہائی شاعرانہ عظمت کا معیار یہی انسانی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہے۔ لیکن اس اثر اندازی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ شاعر کسی معین فلسفۂ زندگی یا پیغام کا حامل بھی ہو۔ یہی نہیں بلکہ دنیائے شعر میں انتہائی عظمت اکثر انہی لوگوں نے حاصل کی ہے۔ جنہوں نے انسانی عقائد اور زندگی کے فلسفوں کو تو نہیں چھوا۔ لیکن اپنے کلام میں تخیل کی تربیت اور نشو ونما کا ایسا سامان چھوڑ گئے ہیں جس سے انسانی فطرت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ شکسپیئر اور غالب دونو اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونو نے زندگی کے کسی ایک پہلو پر زیادہ زور نہیں دیا۔ کیونکہ ایک پہلو پر زیادہ زور تو وہ دے جسے دوسرے پہلو نمایاں نظر نہ آتے ہوں۔ لیکن یہ صرف ظاہر بین ہی کہینگے۔ کہ انہوں نے انسانی زندگی کو متاثر نہیں کیا۔ انہوں نے کوئی فلسفہ یا پیغام دنیا کے لئے یادگار نہیں چھوڑا لیکن انسانی تخیل کی صحیح تربیت اور انسانی فطرت کے ارتقا کیلئے ان کا کلام اسیطرح مفید ہے جسطرح ایک عظیم اور بلند مرتبہ شخصیت کا فیض صحبت۔ ایک بڑا شاعر خود ایک عظیم الشان شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اور اپنے کلام سے جو اس کی شخصیت کی انتہائی گہرائیوں کا اظہار ہے۔ اپنی شخصیت کا پرتو ناظرین کے دل ودماغ پر ڈالتا ہے۔ اور ایک نہایت لطیف طریقے سے ناظرین کی تخیلی زندگی بھی اسی رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ جو شاعر کے تخیل میں نمایاں ہوتا ہے۔ ان کا تخیل شاعر کی دنیائے تخیل سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ اور جس طرح یونانی ٹریجیڈی میں ہیرو کے کارہائے نمایاں اور خوبیاں دیکھنے سے اور دنیائے تخیل میں ہیرو کی طرح محسوس کرنے لگتے[۵۱]، ہم بھی ایک لطیف طریقے سے ہیرو کی خصوصیات

۵۱۔ یہ ایک لطیف نفسیاتی حقیقت ہے۔ جسے علم نفسیات کے ماہر آج ہم پر ظاہر کر رہے ہیں۔ لیکن شعرا اور صوفیائے کرام کے کلام میں اس کی طرف کئی اشارے ہیں۔ مثلاً مولینا جامی کہتے ہیں۔ ؎

گر در دل تو گل گزرد گل باشی — در بلبل بیقرار بلبل باشی

تو جزوی و حق کل است گر روزے چند — اندیشۂ کل پیشہ کنی کل باشی

سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک شاعر کے مطالعہ سے اس کی شخصیت اور اُسکے تخیل کا رنگ ہم پر چڑھ جاتا ہے۔ اور اگر یہ مطالعہ مستقل اور گہرا ہو۔ تو یہ اثر بھی دیرپا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طریقے سے کلامِ غالب کے مطالعہ سے غالب کی عظیم شخصیت کا پرتو ہم پر پڑتا ہے۔ اور اگرچہ یہ اثر اسی طرح واضح و نمایاں نہیں جسطرح دلائل و براہین سے عقائد کا بدلنا۔ لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں تخیل کی یہ تربیت عقائد کی شعوری تبدیلیوں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اور شاعری کی یہی نیم پیغمبرانہ خصوصیت ہے جس کی نسبت غالب نے خود اشارہ کیا ہے۔ ؂

اگرچہ شاعراں نغز گفتار   زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں   خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم   ورائے شاعری چیزے دگر ہست

فلسفۂ غم

غالب کے فلسفہ کی نسبت ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ آج تک جو کوششیں غالب کو فلسفی ثابت کرنے کے متعلق ہوئی ہیں وہ اکثر ناکام رہی ہیں۔ لیکن انکے علاوہ غالب کی افتادِ طبع اور اسکی شخصیت کے متعلق بھی کئی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اور چونکہ علامہ اقبال کے کلام کی وجہ سے اسوقت رجائی اور قنوطی فلسفوں کا اختلاف ملک کے سامنے بہت نمایاں ہے۔ غالب کے متعلق بھی چند مضامین اس موضوع پر شایع ہوئے ہیں۔ کہ خواہ غالب کسی خاص سکول کا فلسفی نہ ہو۔ آخر اُس کی طبیعت میں کونسا رنگ غالب تھا۔ مولانا نیاز فتحپوری نے ایک مضمون میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "اگر غالب نے کوئی فلسفہ پیش کیا۔ تو وہ فلسفۂ تفاول و مسرت تھا"۔ لیکن جمہور بالعموم اس امر پر متفق ہیں کہ غالب کے اشعار میں غم و حزن کی جھلک مسرت و اطمینان سے نمایاں ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ کلامِ غالب میں کئی جگہ تو غم کا بیان بیشتر خیال آرائی ہے۔ اور زورِ طبع یا طبیعت کی شوخی دکھانے کا ذریعہ۔ مثلاً ذیل کے اشعار ہیں:۔

ہفت آسماں بگردش و ما درمیانِ او   غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود
ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ   جسکی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا   وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

لیکن غالب کا تمام کلام پڑھنے کے بعد دل پر جو اثر باقی رہتا ہے۔ وہ کسی قدر مایوسی اور افسردگی کا ہے۔ یا جسے انہوں نے خود ایک شعر میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے   بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

حقیقت یہ ہے۔ کہ مرزا اُن بے اندازہ خواہشوں اور ارمانوں بھرا دل لائے تھے۔ کہ اُن کا پورے طرح مطمئن ہونا بہت مشکل تھا۔ لکھتے ہیں۔

نامرادم دارد ایں افزونیٔ خواہش بہ دہر
آب بر من بستہ اند آرے ز استسقائے من

اسکے علاوہ کئی طبیعتیں ہوتی ہیں۔ کہ جب ان کی خواہشات پوری نہیں ہوتیں۔ تو جس طرح شراب پینے والے خمار اور اعضاشکنی کو دُور کرنے کیلئے اَور شراب پی لیتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کی مایوسی اور بے اطمینانی کا علاج کامیابی اور کامرانی سے تو ہوتا نہیں۔ انکی طبیعتیں خواہشوں کو اور بڑھا کر عارضی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔ یعنی بقول غالب ع

ہر چہ ز سرمایہ کاست در ہوس افزودہ ایم

یا ع   نشاطِ خاطرِ مفلس زکیمیا طلبی است

لیکن جب خواہشیں اور امیدیں اسقدر بڑھ جائیں۔ تو بے اطمینانی بھی قدرتی امر ہے۔ اور جسقدر خواہشیں اور آرزوئیں زیادہ ہونگی۔ مایوسی کے موقع بھی اسی کثرت سے ہونگے۔ ؎

ہر گونہ حسرتے کہ ز ایام می کشیم
دُردِ تہِ پیالۂ امید بودہ است

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مرزا کے کئی اشعار میں مایوسی اور افسردگی کا رنگ غالب ہے۔ اسکے علاوہ اگرچہ مرزا کی زندگی کسی لحاظ سے ناکامیاب نہیں رہی۔ انکی قسمت میں مصائب کا حصہ بھی بہت تھا۔ وہ دو برس کے تھے۔ کہ باپ کی وفات ہوئی اور پانچ برس کے ہوئے تو چچا مر گئے۔ بیشک

اسکے بعد وہ عیش وعشرت میں پلے۔ لیکن اس چندروزہ عیش وعشرت کا خمیازہ بہت بھگتنا پڑا۔ قرضخواہوں کے پنجے سے انہیں عمر بھر نجات نہیں ملی۔ زندگی کے بہترین سال دیوانی مقدمے کی تگ و دو میں گزرے۔ جس کا نتیجہ ناکامی اور رسوائی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ ۳۰ برس کی عمر میں بھائی کی دیوانگی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ جب ذرا سنبھلنے کی فرصت ملتی۔ تو کوئی اور چرکہ لگ جاتا۔ ۵۰ سال کی عمر میں قماربازی کے جرم میں جیل جانا پڑا۔ بادشاہ کی استادی ملی تو دو ہی سال میں ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

مرزا کو جب ان حالات سے سابقہ پڑا تو عجیب نہیں کہ ان کے اشعار میں غم کا عنصر غالب ہو لیکن غم کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ اور ان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک غم حالی کا ہے۔ جس سے بیتاب ہوکر شاعر اپنے گرد و نواح کی دنیا ہی بدل دیتا ہے۔ دوسرا غم میر تقی میر کا غم ہے۔ جو انسان کی اپنی طبعی بےچینی اور باطنی کشمکش کا اظہار ہے۔ اور جس میں حساس اور زودرنج انسان کو غم سے اسقدر محبت ہو جاتی ہے۔ کہ اگر اُسے دُور کرنیکی کوشش کی جائے۔ تو وہ اور بےچین ہوتا ہے۔ غالب کا غم نہ تو حالی کا غم ہے۔ جس پہ دنیا کی سب خوشیاں نثار ہونی چاہیئں۔ اور نہ ہی میر تقی میر کا غم جو اگر مستقل رہے تو ایک طرح کی دماغی بیماری ہے۔ غالب کا غم اس صحتمند آدمی کا حزن و افسوس ہے۔ جسے دنیا کی اچھی چیزوں سے محبت ہے۔ اور جب وہ انہیں مسلسل سعی کے باوجود حاصل نہیں کرسکتا۔ تو وہ غمگین ہو جاتا ہے۔ غالب کے اشعار سے حزن و افسردگی جھلکتی ہے۔ لیکن غالب کی افسردگی عام قنوطیوں کی طرح دنیا کی مذمت نہیں۔ بلکہ دنیا کی دلفریب چیزوں سے لگاؤ کی وجہ سے ہے۔ غالب کی انتہائی مایوسی میں بھی ترک دنیا اور رہبانیت یا مردم بیزاری کا شائبہ تک نہیں۔ بلکہ یہ حزن و افسردگی اسی آدمی کی ہے۔ جو زندگی کی قدر و قیمت پہچانتا ہے۔ اور جسے اس سے جدا ہونا یا اسے نہ پاسکنا ناگوار ہے۔

اس کے علاوہ ہمیں مرزا کی مردانگی کی داد دینی چاہیئے۔ کہ اگرچہ اشعار میں جو اُن کے باطنی جذبات کا آئینہ ہیں۔ اُن کی مایوسی اور

بے اطمینانی صاف ٹپک پڑی ہے[1]۔ زندگی میں انہوں نے غم کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور میر تقی میر کی طرح پژمردگی اور غم کو اپنی خوش طبعی اور زندہ دلی پر غالب نہیں آنے دیا۔ ؎

پیرم مگر بہ طبع جواناں گراں نیم
خوں خوردنم نہفتہ و میخوردن آشکار

آدمی جب کسی چیز کیلئے خواہش کرتا ہے۔ اور نہیں پاتا۔ تو اسکی مایوسی قدرتی امر ہے۔ خواہ یہ ناکامی خواہشات کی فراوانی سے ہو یا نامساعد اتفاقات سے۔ لیکن زندگی میں مسلسل اضطرار اور بے چینی نبھ نہیں سکتی۔ عام طور پر مایوس اور ناکام لوگ اپنی ناکامیوں کو قضاء و قدر کے سر پر ڈالکر سمجھ لیتے ہیں کہ ان کی قسمت کا قصور ہے۔ مرزا کی غمزدہ طبیعت نے بھی یہ ایک طرح کا سکون اور توازن حاصل کیا۔ لیکن رسمی طریقے سے قسمت کو ملزم قرار دیکے نہیں۔ بلکہ اس نگاہِ ژرف بیں کی مدد سے جو اگر ان کی ناکامیوں سے آگاہ تھی۔ تو دوسروں کی ناکامیاں اور مایوسیاں بھی اُس سے پنہاں نہ تھیں۔ انسان جب دیکھتا ہے کہ زمانے کے ترکش میں ہزاروں تیر ہیں۔ ایک سے ایک زہریلا اور ان سے کوئی محفوظ نہیں۔ تو طبیعت میں ایک طرح کا سکون آجاتا ہے۔ غالب کے کئی اشعار اس حالت کا اظہار ہیں ؎

بیصرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر ۔۔۔ حضرت بھی کل کہینگے کہ ہم کیا کیا کئے

یا۔ ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی ۔۔۔ وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

علاوہ ازیں مرزا نے زندگی کا سرد گرم دیکھا تھا۔ وہ جانتے تھے۔ کہ اگر خوشی محدود اور قلیل الفرصت

---

[1] ۔ مرزا خود کہتے ہیں :۔

آسودہ دلاں چوں شنوند آہ و فغانم ۔۔۔ دانند کہ من مردنیم رنج و الم را
غافل کہ ہم از ہولِ نگونساری بختست ۔۔۔ فریاد گراز لب جہد ارباب ہمم را
غم خست دردِ من و خونابۂ آں زخم ۔۔۔ بر چشم روا داشت بروں دادنِ نم را
در سُرمہ فرو خفتہ گدایانہ خروشیست ۔۔۔ بیش آمدہ روز سیہی حرف و رقم را

ہے۔ تو غم بھی اتھاہ اور غیر محدود نہیں۔ اور انسانی فطرت ہی کچھ اس طرح پابند اور مجبور واقع ہوئی ہے کہ غم کی باگ بہت ڈھیلی نہیں چھوڑی جا سکتی۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

جب انکے عزیز شاگرد ہرگوپال تفتہ ترکِ دنیا کیلئے آمادہ ہوئے تو مرزا نے جو خط لکھا وہ اُنکے نقطۂ نظر کا بہترین اظہار ہے۔ وہ لکھتے ہیں "کیوں ترکِ لباس کرتے ہو۔ پہننے کو تمہارے پاس کیا ہے جس کو اتار کر پھینکو گے۔ ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائیگی بغیر کھائے پیئے گذارہ نہ ہوگا۔ سختی و سستی و رنج و آرام کو ہموار کرو و جس طرح ہو۔ اُسی صورت بہر صورت گذرنے دو"

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں بتایا ہے۔ ایک شاعر کے کلام میں اس کا فلسفہ اسی طرح ساری و پریشاں ہوتا ہے۔ جس طرح ایک پھول کے نواح میں اس کی خوشبو۔ اسکی تعیّن بہت مشکل ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی زندگی کے متعلق اُنکے نقطۂ نظر کا واضح اظہار اُن کے وہ فارسی اشعار ہیں۔ جنہیں ہم نے "زندگی" کے عنوان سے تیسرے حصے میں انتخاب کیا ہے۔ ۵

تو نالی از خلۂ خار دنگری کہ سپہر ‫ سرِ حسینؑ علیؑ بر سناں بگرداند
بہ روبشادی و اندوہ دل منہ کہ قضا ‫ چو قرعہ بر نمطِ امتحال بگرداند

یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند
کلیم را بہ لباسِ شبہاں بگرداند

مذہب

فلسفہ کے علاوہ ایک اور دلچسپ مسئلہ غالب کا مذہب ہے۔ اور مرزا کی تصانیف دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ انہیں مذہب سے دلچسپی عوام سے ضرور زیادہ رہی ہے۔ انہوں نے مہرِ نیمروز میں ابتدائے آفرینش وغیرہ کے متعلق ہندو عقائد کا جو خلاصہ درج کیا ہے۔ اس سے اور انکے بعض اشعار (مثلاً تحفہ دیر) سے ہندو مذہب

کے عقائد سے جو واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اِس زمانے میں بھی بہت کم مسلمانوں کو ہو گی۔ بستانِ مذاہب اکثر اِنکے مطالعہ میں رہتی تھی۔ اور پارسیوں کی مذہبی کتب مثلاً دساتیر سے اُن کی ذاتی واقفیت تھی۔ ممکن ہے۔ کہ مذاہبِ عالم میں یہ دلچسپی ہرمز کی تعلیم کا اثر ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہے۔ کہ انہیں اسمیں دلچسپی ضرور تھی۔ اور انکے کئی نہایت پاکیزہ اشعار اسی مسئلہ کے متعلق ہیں۔ اور رسمی قافیہ پیمائی سے زیادہ قلبی کاوش کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً

؎ دیر و حرم آئینہ تکرارِ تمنا	واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں
؎ با من میاویز اے پدر فرزندِ آذر را نگر	ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد
؎ دلم در کعبہ از تنگی گرفت آوارۂ خواہم	کہ با من وسعتِ بتخانہ ہائے ہند وچیں گوید
؎ آوارۂ غربت نتواں دید صنم را	باشد کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

اسکے علاوہ جزوی عقائد سے قطع نظر عام مذہب کے متعلق مرزا کا نقطۂ نظر بہت دلچسپ ہے مشرقی شعرا بالعموم مذہب کے معاملہ میں آزاد خیال رہے ہیں۔ اور دارالافتا کی تنگ نظری اور سختی کی تلافی حافظ اور عمر خیام، خسرو اور فیضی کی روشن خیالی اور وسیع مشربی سے ہوتی رہی ہے۔ مرزا بھی جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے۔ مذہب کے معاملے میں بیحد آزاد خیال تھے لیکن انتہائی آزاد خیالی کے باوجود اُن میں ابو نواس اور سرمد کی بیقاعدگی نہیں تھی۔ وہ انسان کی ذہنی اور روحانی نشو و نما پر کسی طرح کی پابندیاں عائد کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن وہ اس لطیف نکتے سے بھی بیخبر نہ تھے۔ کہ یہ نشو و نما بہترین اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ جب یہ کسی نظام اور آئین کے ماتحت ہو۔ مثلاً عام طور پر تو یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ شریعت اور طریقت کے رستے جدا جدا ہیں۔ لیکن مرزا جانتے تھے۔ کہ حقیقتاً ان دونوں میں کوئی اصولی اختلاف نہیں۔ طریقت کا تعلق بالعموم انسان کے تزکیہ نفس اور اسکی ذاتی روحانی تربیت سے ہوتا ہے۔ اور شرع اُسکے افعال کو اجتماعی یعنی سوسائٹی کے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ اور انسان کی پوری نشو و نما کیلئے کوئی پہلو بھی نظر انداز نہیں ہو سکتا چنانچہ باوجودیکہ مرزا کا اپنا رنگ طریقت سے قریب تر تھا۔ وہ شریعت کی اہمیت سے بھی غافل نہ تھے

ایک قصیدہ میں رسولِ اکرمؐ کی تعریف میں لکھا ہے۔ ع

حزو بسایۂ شرعت زفتنہ زنہاری

اُن کا طبعی رجحان تو ہمسفر اور رہنما سے آزاد ہو کر آزادانہ تلاش حق کا تھا۔ لیکن جانتے تھے۔ کہ "رہ ورسم منزلہا" سے واقفیت مفید بلکہ ضروری ہے۔ ے

عناں گسیختہ براہ تاختن تا چند

بشرع پیچم و گردم بپویہ ہنجاری

شرع اور حق کے تعلق کو انہوں نے ایک اور فارسی شعر میں نہایت لطیف پیرایہ میں نظم کیا ہے۔

بشرع آویز و حق میجو نہ مجنوں کم نہ واللہ ے

کہ دل با محمل است اما زباں با ساریاں دارد

اسی طرح صوفیہ کرام میں ایک مصرع مشہور ہے۔ ع

باخدا دیوانہ و با مصطفیٰ ہشیار باش

یعنی خالق اور مخلوق کا تعلق تو انسان کے اپنے متعلق ہے۔ لیکن چونکہ نبی کریم ایک جماعت کے سردار ہیں۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے اُس جماعت کے اصول و آئین ملحوظ رہنے چاہئیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ مرزا نے اس اصول سے سرِ مو تجاوز نہیں کیا۔ خدا کا ذکر انہوں نے اپنی نظموں میں جس آزادی اور بیباکی سے کیا ہے۔ اس کی مثال ہندوستانی شاعری میں کہیں نہیں ملتی۔ لیکن پیغمبر صلعم کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ادب کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اور اگرچہ خدا کے متعلق ان کے کئی اشعار ایسے ہیں جنہیں دار الافتا میں کفر کے کلمات سمجھا جائیگا۔ رسول اکرمؐ کا جہاں کہیں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ انہیں پورا ادب و احترام ملحوظ رکھا ہے۔

مرزا کی اس "پابند آزادی" یعنی آزاد خیالی اور حفظِ مراتب کی ایک دلچسپ مثال انکے مختلف مذاہب کے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ یادگارِ غالب اور مرزا کے اپنے کلام سے انکے ہندو اور عیسائی دوستوں سے جو مخلصانہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تو اس قابل ہیں کہ ہم اس روشن خیالی کے زمانے

میں انہیں چراغ راہ بنائیں. لیکن ان کے باوجود مرزاؔ ضبط و آداب رسوم سے کبھی غافل نہیں ہوئے اور جماعت بندی کا بھی خیال رکھتے تھے ۔ چنانچہ وہ مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔" بندہ پرور میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیزداری جسکو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں ۔ اُسکو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے۔ اور اُسکے مراتب و مدارج ہیں"۔

مرزا شرع کی قدر و اہمیت سمجھتے تھے ۔ لیکن مذاہب کے جزوی اختلاف اور فقہ کی پیچیدگیوں اور بلاضرورت پابندیوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آجکل لوگ قانون کی موشگافیوں سے خوب واقف ہیں۔ لیکن فقہ کی باریکیاں کچھ اس سے بڑھکر ہوتی ہیں۔ قرون وسطیٰ میں عیسائی مفکروں کے نزدیک ایک اہم مسئلہ فرشتوں کے حجم کا تھا۔ اور انکے درمیان اکثر اس سوال پر بحثیں ہوتی تھیں۔ کہ ایک تلوار کی نوک پر کتنے فرشتے بیک وقت کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اسلامی فقہ کے کئی مسائل بھی اسی طرح فرضی اور حقیقت اور روزمرہ کے واقعات سے بعید ہوتے تھے ۔ لیکن مرزا کی سلیم الطبعی کو یہ خیالی قلا بازیاں پسند نہیں تھیں ۔ اور انہوں نے اپنے خطوط میں مروجہ تعلیم فقہ اور مسائل ابوحنیفہؒ کے خلاف بہت جلے کٹے فقرے لکھے ہیں۔ اُن کے خیال میں انسان کو چاہیئے کہ مذہب کی اصولی باتوں کو سمجھ لے اور ان پر ایمان رکھے ۔ فقہ اور مذہب کی جزوی باتوں میں وقت ضایع کرنا بیفائدہ ہے۔ اور یہ وقت دل و دماغ کی تربیت میں صرف ہونا چاہیئے میر مہدی کے نام ایک خط لکھا ہے۔ اس میں میر سرفراز حسین کو تلقین کرتے ہیں" میاں کس قصے میں پھنسا ہے فقہ پڑھکر کیا کریگا۔ طب و نجوم و ہیئت و منطق فلسفہ پڑھ۔ جو آدمی بنا چاہے۔ خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام۔ یہی ہے مذہب حق والسلام والاکرام ۔ علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر"۔

انہوں نے ایک دو مذہبی بحثوں میں حصہ لیا ہے۔ لیکن ان میں بھی جزوی اختلافات اور فقہی موشگافیوں کو ناپسند کیا۔ چنانچہ مقلدوں اور غیر مقلدوں میں خدا کے علاوہ کسی اور کو مخاطب کرنے کے متعلق جو اہم اختلاف ہے ۔ مرزا اسکو بھی بے ضرورت اور جزوی سمجھتے تھے ۔

ابلہاں را زانکہ دانش نارسا است
گفتگوہا بر سرِ حرفِ ندا است

عقیدتاً مرزا اثنا عشری شیعہ تھے۔ اور جب شاعرانہ رنگ میں حضرت علیؓ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تو بہت کچھ کہہ جاتے۔ اسکے علاوہ وہ توحید اور رسالت کے قائل تھے۔ لیکن ان کے کلام سے خیال ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد کی قبا انکے بدن پہ پوری طرح پھبتی نہیں تھی ؎

رموزِ دیں نشناسم درست و معذورم
نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی است

تمام مغلوں میں ایک طرح کی "ہیگین ازم" پائی جاتی ہے۔ وہ بابشرت "عیشِ امروز" کے قائل ہوتے ہیں۔ اور "روزِ فردا" کا خیال انہیں اس طرح مضطرب نہیں رکھتا جس طرح سامی نسل کے لوگوں کو۔ مرزا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ اور "عیشِ امروز" کے وہ بھی اسی طرح قائل تھے۔ جس طرح بابر یا جہانگیر اور جسطرح مغلیہ سلطنت کے بانی نے کہا تھا۔ ع

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسی طرح مرزا کے کئی اشعار سے خیال ہوتا ہے کہ وہ روزِ جزا یا جسمانی عذاب و اجر کے قائل نہ تھے بہشت کا جہاں کہیں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ مثنوی ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا رباعی۔ ہمیشہ شوخی بلکہ تمسخر سے ہی کیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس طرح دورِ عباسیہ کے کئی حکمائے اسلامی یا سرسید احمد خاں نعیمِ جسمانی کے قائل نہ تھے۔ مرزا کی رائے بھی اس معاملے میں عام مسلمانوں سے مختلف تھی۔

حُبِّ وطن حال ہی میں مرزا کے چند مداحوں نے اُن کے بعض اشعار سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان میں حُبِ وطن کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا حقیقتاً یہ خیال نہ صرف مرزا کے حالاتِ زندگی اور اُنکے فارسی کلام سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ بلکہ مرزا کی افتادِ طبیعت کے غلط اندازے پہ مبنی ہے۔ مرزا بقولِ خود شہد کی مکھی نہیں تھے گُڑ کی مکھی تھے۔ ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ جب غدر سے دو سال پہلے فیصلہ ہوا کہ بہادر شاہ کے بعد

شاہی سلسلہ ختم کر دیا جائے اور اسکے جانشین کا خطاب شاہزادہ ہو۔ تو مرزا کو شاہی سلسلہ کے ختم ہونے کا کوئی صدمہ نہیں ہوا ــــــ کوئی فکر تھا۔ تو اپنے مستقبل کے متعلق اور انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں درخواستیں گزارنی شروع کر دیں۔ کہ شام و روم کے بادشاہوں کے درباری شاعر ہوتے ہیں۔ مجھے کیوں نہ "کوئین پوئٹ"[1] گنا جائے!

مرزا معاملہ فہم آدمی تھے۔ اور اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ سے اُن کی وابستگی کبھی بھی اتنی گہری نہیں ہوئی۔ کہ وہ اس کی بربادی سے بیقرار ہو جاتے اور اگر ہو بھی تو اپنے سوا مرزا کس کو اسقدر اہم سمجھتے تھے۔ کہ اسکے لئے آنسو بہاتے۔

مرزا کے خطوط سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ان کے کئی انگریزوں کے ساتھ مخلصانہ تعلقات تھے۔ "اسٹرلنگ" کی موت کے بعد اُس کا جو مرثیہ انہوں نے لکھا ہے۔ اُسے کسی طرح رسمی یا خود غرضانہ نہیں کہا جا سکتا۔ "میجر جان جاکوب" کے ساتھ اُن کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور جب میجر دہلی آتے تو اُنکے ٹھہرنے کا انتظام مرزا کرتے۔ سر جان میکلوڈ۔ میٹکاف۔ تھامسن نے اُن کے ساتھ بہت شریفانہ برتاؤ کیا۔ اسکے علاوہ نہ صرف مرزا کے کئی انگریزوں سے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ انگریزی نظام کو بھی مغلیہ نظام پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ جب سرسید احمد خاں نے آئینِ اکبری کی بہت محنت سے تصحیح کی۔ اور اشاعت کے وقت مرزا کی رائے کے لئے کتاب کو بھیجا تو انہوں نے اسوقت جو مثنوی لکھی ہے اس سے انکا ما فی الضمیر بخوبی ظاہر ہوتا ہے:۔

گرز آئین میسرو و با ماتخن — چشم بکشا اندریں دیرکہن
صاحبانِ انگلستاں را نگر — شیوہ و اندازِ ایشاں را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

---

[1] ۔ مرزا نے سر جان میکلوڈ فنانشل کمشنر پنجاب کیلئے اپنی اردو نثر اور نظم کا انتخاب کیا تھا۔ اسکے دیباچہ میں لکھتے ہیں "البتہ میں اس کا مستحق ہوں کہ کوئین پوئٹ گنا جاؤں۔ اور اس علاقہ سے ایک نیا نام اور نئی عزت پاؤں۔"

(منقولہ از ادبی دنیا۔ اگست ۱۹۳۶ء)

زیں ہنر منداں ہنر بیشی گرفت | سعی بر پیشینیاں بیشی گرفت
حق ایں قوم ست آئیں داشتن | کس نیارد ملک بے زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند | ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار
گشتہ آئینِ دگر تقویم پار!

معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ تقریظ سرسید کے پاس پہنچی۔ تو چونکہ انہوں نے ابھی تقلید کی ان ذہنی زنجیروں کو نہیں توڑا تھا۔ جن سے مرزا آزاد تھے۔ انہیں مرزا کی مثنوی پسند نہ آئی۔ اور انہوں نے اسے کتاب کے ساتھ شایع نہ کیا۔ لیکن مرزا کی اس مثنوی سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ "دع ماکدر خذما صفا" کے اصول پر پوری طرح عامل تھے۔ اور ملکی یا نسلی تعلقات کو بہت اہمیت نہیں دیتے تھے۔

غالب کے معاصرین

مرزا نے اپنے اشعار اور خطوط میں جا بجا اپنی محرومیٔ قسمت اور معاصروں کی ناقدر شناسی کی شکایت کی ہے۔ اس سے اور یادگارِ غالب کے بعض اندراجات سے یہ خیال عام ہو گیا ہے۔ کہ مرزا کی بقدرِ استحقاق قدر ان کی اپنی زندگی میں نہیں ہوئی۔ حقیقتاً یہ خیال جس قدر عام ہے اسی قدر غلط ہے۔ اور مرزا کے زمانے کے حالات اور اس زمانے کے تذکروں میں، جتنی تحقیق کی جائے۔ یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ زمانے نے مرزا کی قدر میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اور اگر مرزا اس سے مطمئن نہیں تھے۔ تو اکی وجہ یہی تھی۔ کہ وہ اپنی تمام تصنیفات کی نسبت، جو اچھی رائے رکھتے تھے۔ اس سے پورا پورا اتفاق کرنا صحیح ادبی مذاق کو ناگوار تھا۔ یہ درست ہے کہ شاعری میں جب کوئی نئے راستے نکالتا ہے تو اسکی قدر آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ لیکن مرزا نے فنِ شعر میں کوئی نیا راستہ نہیں نکالا۔ فقط اپنے ذہنی جوہر سے پرانی روش میں کامیابی حاصل کی۔ اور اپنے کمالِ شاعری سے غزل کو انتہائی عروج تک پہنچا دیا۔ نیز باوجودیکہ اب تعلیم اور چھاپہ خانہ کی توسیع سے کلامِ غالب کے پڑھنے والے

بڑھ گئے ہیں۔ غزل کی خوبیوں کے سمجھنے کی صلاحیت اس نسل میں جس کی ادبی تربیت نئے اصولوں پر ہو رہی ہے۔ غالب کے معاصرین سے کچھ بہت زیادہ نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ جب ہم تمام حالات کا بالتفصیل مطالعہ کرتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے۔ کہ زمانہ غالب کی نہیں بلکہ معاصرین غالب کی رائے کی تائید کر رہا ہے۔ مرزا کو اپنے فارسی قصائد اور فارسی نثر پر بے انتہا ناز تھا۔ اور فارسی غزلگوئی میں بھی وہ خواجہ حافظ کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ لیکن باوجودیکہ ہم مرزا کے فارسی کلام کی اہمیت مانتے ہیں۔ مرزا اُسے جسقدر بلندپایہ سمجھتے تھے۔ اُس سے متفق ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ اور اسکے متعلق جو کچھ مرزا کے معاصرین (مثلاً نواب مصطفٰے خاں شیفتہ۔ مولینا صدرالدین آزردہ۔ تجنبر۔ نیر وغیرہ) کی رائے تھی۔ وُہی درست معلوم ہوتی ہے۔ مرزا کے فارسی کلام کو تو موجودہ زمانے میں بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ہوا۔ اُن کی شاعری کو جو بلند جگہ دی جاتی ہے۔ وہ اُنکے منتخب دیوان ریختہ کی وجہ سے ہے۔ عوام الناس مرزا کا یہ مصرع ع

شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن!

پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں کہ مرزا کا وہی کلام آج الہامی سمجھا جاتا ہے۔ جسکی نسبت انکے معاصرین کہتے تھے۔ قطعہ

مزا کہنے کا جب ہے اِک کہے اور دوسرا سمجھے	اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مگر انکا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے	کلامِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے

یہ قطعہ حکیم آغا جان عیش کا ہے۔ جو انہوں نے اجمیری دروازہ کے مشاعرہ میں پڑھا تھا۔ حکیم صاحب شعر کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ لیکن شعر فہمی میں ان کا وہ مرتبہ نہیں تھا۔ جو ان کے کئی دوسرے معاصرین کا، جو اس قطعہ کے مضمون سے متفق نہ تھے۔ لیکن آخر یہ قطعہ اس منتخب دیوان کے متعلق نہیں۔ جس کو سب شعر فہم حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔ اس میں جن اشعار کی دِقت کی شکایت ہے۔ انہیں خود مرزا نے مطبوعہ دیوان میں شائع کرنے کے قابل نہ سمجھا۔ اور لکھا کہ "منتخب دیوان سے باہر جو میرے اشعار ملیں۔ انہیں میرا نہ سمجھا جائے"۔ لیکن اگر مرزا کی اس تحریر

کے بعد بھی اس مسئلہ میں اختلاف کی کوئی گنجائش تھی۔ تو اس کا جواب نسخہ بھوپال ہے۔ جس میں خارج شدہ اشعار شایع ہوئے ہیں۔ اور جنہیں دیکھکر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ مرزا کے معاصرین نے اگر ان اشعار کو الہامی نہ سمجھا۔ تو ان پر کفر کا فتوے نہیں عاید ہوتا۔ بلکہ اردو ادب ان کا ممنون ہے۔ کہ انہوں نے تنقید اور تمسخر سے مرزا کو ان سرخ و سپید خزف ریزوں کے جمع کرنے سے روکا۔ اور ان کی توجہ اس بحرِ شعر و سخن کی طرف کھینچی جس میں غواصی کا صلہ وہ بے بہا موتی ہیں۔ جو اردو ادب کیلئے مایۂ ناز ہیں!

اس کے علاوہ جن لوگوں نے مرزا کے معاصرین کے متعلق فقط مرزا اور حالی کی شکائتیں ہی پڑھی ہیں۔ وہ اُس قدر و منزلت سے ناواقف ہیں۔ جو مرزا کے ممتاز معاصرین کے دلوں میں مرزا کی تھی۔ اور جسکا ثبوت تمام معاصرانہ تذکروں میں ملتا ہے۔ شعرا کے تذکروں میں جگہ انہیں اس وقت سے ملنی شروع ہو گئی تھی۔ جب وہ ابھی سولہ سترہ سال کے تھے۔ گلشن بیخار جو اس زمانے کا اہم ترین تذکرہ ہے۔ اسمیں مرزا کی اس قدر تعریف اور انکے کلام سے اسقدر طویل انتخاب درج ہے۔ کہ گارسن تاسی اپنی تاریخ ادبیات اردو میں حیرت ظاہر کرتا ہے۔ کہ شیفتہ جسکی نمایاں خصوصیت میانہ روی ہے۔ ایک شاعر کا اسقدر مداح ہے! سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں دہلی کے ممتاز لوگوں کے جو حالات درج کئے ہیں۔ ان میں غالب کو دہلی کے باقی سب شعرا سے پہلے جگہ دی ہے۔ اور اس میں غالب کی شاعرانہ عظمت کا جسطرح اعتراف کیا ہے اس پر غالب جتنا بھی فخر کرتا بجا تھا۔ نواب ضیاء الدین نے خود دیوان غالب کا دیباچہ لکھا۔ جو اگرچہ دیوان کے ساتھ شایع نہیں ہوا۔ آثار الصنادید میں چھپ چکا ہے۔ اُنکے دوسرے مداحوں میں سے مولوی فضل حق، خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر، مومن ناسخ۔ نساخ آسمانِ علم و ادب کے درخشاں ستارے تھے۔ لوگ مرزا سے ملنے اور ملاقات کرنیکے لئے دہلی آتے۔ عزیز لکھنوی اور صفیر بلگرامی کی ملاقات کے حالات ہم درج کر چکے ہیں۔ اُنکے علاوہ سید غوث علی شاہ قلندر جنکا مزار پانی پت میں مرجع خاص و عام ہے۔ اور جو مولینا اسمٰعیل میرٹھی کے مرشد بھی تھے۔ مرزا سے ملنے انکے مکان پر گئے اور مرزا سے انکی ملاقاتوں کا حال انکے لاجواب تذکرہ

میں مفصل درج ہے۔ اسکے علاوہ زمانے نے مرزا کی تصانیف کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُنکا اردو دیوان شایع کرنیکے لئے دو ناشر جس طرح بیتاب تھے۔ اسکی تفصیل انکے خطوط میں ہے۔ اُنکی دستنبو ہاتھوں ہاتھ بکی۔ اور تو اور اُنکے رقعات کی بہت مانگ تھی۔ ہندوستان کے اکثر ممتاز رؤسا و اکابر سے انکے تعلقات تھے اور وہ انکی مدد بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک فارسی خط میں قاضی القضاۃ مولوی ولایت حسین کے تین سو روپے بھیجنے کی رسید ہے۔ اردوئے معلیٰ میں نواب میر غلام بابا خاں رئیس سُورت کی طرف سے پہلے ایک گھڑی اور بعد میں نذرِ امدادی پانے کا شکریہ ادا کیا ہے۔ مہاراجہ الور انہیں تحفے تحائف بھیجتے رہتے تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں نے ان کی مصیبتوں کے دوران میں ہمیشہ مدد کی۔ بڑودہ سے بھی انہیں نقدی جاتی تھی۔ شاہِ لکھنؤ کیطرف سے بھی پہلے قصیدے پر پانچہزار روپیہ انعام کا حکم ہوا اور اگرچہ مرزا کی بدقسمتی سے یہ رقم اُن تک نہ پہنچی۔ بعد میں پانچسو روپیہ سالیانہ مقرر ہوا۔ اور جب تک سلطنت قائم رہی۔ مرزا کو ملتا رہا دربار رامپور کے مرزا پر جو احسانات تھے۔ سبکو معلوم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دربار دہلی میں انکی قدر حسبِ توقع نہیں ہوئی۔ لیکن ہم ان حالات کا ذکر کرچکے ہیں۔ جو مرزا کی ترقی میں حائل تھے۔ مرزا ابھی تیرہ سال کے تھے کہ ذوقؔ ظفرؔ کے استاد ہوگئے۔ اسکے بعد کئی واقعات ایسے ہوئے جن کا ظفر کو ضرور ملال رہا ہوگا۔ اور یہ امر بھی توجہ طلب ہے۔ کہ ظفر اردو کا شاعر اور اردو شاعری کا قدردان تھا۔ اور مرزا اس زبان کو جو اسکے دربار میں نشوونما پارہی تھی کسی قابل نہ سمجھتے تھے۔ ظفر صاف اور موثر اشعار کا دلدادہ تھا۔ مرزا نازک خیالی اور مضمون آفرینی پر جان دیتے تھے۔ لیکن اسکے باوجود ظفر نے مرزا کیساتھ کبھی بے انصافی نہیں کی۔ ۱۸۴۷ء میں جب مرزا پر قمار بازی کی وجہ سے مقدمہ چلایا گیا۔ تو بادشاہ نے مجسٹریٹ کو مرزا کے متعلق سفارشی خط لکھا۔ اسکے بعد اگرچہ مرزا اپنا ابتدائی طرزِ شاعری ترک کرچکے تھے۔ ذوق کی زندگی میں انہیں استاد مقرر کرنا بہادر شاہ جیسے وضعدار بادشاہ کیلئے ناممکن تھا۔ لیکن اسکے باوجود اس نے انہیں درباری مورخ مقرر کیا۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب عطا کیا۔ اور چھ سو روپیہ سالیانہ مقرر کیا۔ جو یہ خیال کرتے ہوئے کہ ذوق کا ابتدائی مشاہرہ پانچ روپیہ ماہوار تھا۔ کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتا۔ تحفے تحائف بھی جاتے رہے۔ یہ صحیح ہے کہ عہدِ اکبری و شاہجہانی میں شعرا کی جو قدردانی

ہوتی تھی۔ وہ بہادر شاہ نے نہ کی۔ لیکن وہ ہو ہی کیسے سکتی تھی۔ جب زمانہ ہی بدل چکا تھا۔

زمانہ دگرگون آئیں نہاد
شد آں مُرغ کو بیضہ زریں نہاد

مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی نسبت مشہور ہے کہ اس نے ایک شاعر کی اس درخواست پر کہ میں نے ایک لاکھ روپیہ کبھی نہیں دیکھا۔ اسکے سامنے لاکھ روپے کا ڈھیر لگا کر اُسے بخش دیا۔ لیکن بیچارے بہادر شاہ نے تو شائد خود ایک لاکھ روپیہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس طرح کی فیاضی کیسے کرتا!

مسٹر والٹر رالے انگریزی شاعر ملٹن کی نسبت لکھا ہے کہ ملٹن کا سب سے بڑا مداح ملٹن ہے۔ اور ملٹن کی جو کوئی تعریف لکھیگا۔ اُسے ملٹن کے اپنے خیالات ہی مختلف الفاظ میں ادا کرنے پڑینگے۔ یوں تو شاعرانہ خود نمائی میں ہمارے سب شعرا مغربی شعرا سے بہت آگے ہیں لیکن رالے نے جو کچھ ملٹن کی نسبت لکھا ہے۔ وہ غالب کی نسبت لفظ بلفظ صحیح ہے۔ لوگ ڈاکٹر بجنوری کے "مقدس وید اور دیوان غالب" والے فقرے کو دُہراتے ہیں۔ اور اُسے خوش اعتقادی اور مبالغہ کا انتہائی اظہار سمجھتے ہیں لیکن آخر بجنوری نے بھی فقط غالب کے دو فارسی اشعار لکھکر شاعرانہ نثر میں انکی تشریح کر دی تھی۔

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے — دیوانِ مرا شہرتِ پرویں بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے — آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے!

مرزا اپنی تعریف میں بھی وہی مبالغہ روا رکھتے تھے۔ جو مدحیہ قصائد میں ممدوح کی تعریف میں۔ اسے لفظ بلفظ صحیح ماننا مذاقِ سلیم کو گوارا نہیں۔ اور یہ امر افسوسناک ہے کہ کلام غالب کی موجودہ شہرت اور مرزا کے معاصرین کی مزعومہ اور مفروضہ ناقدر شناسی سے یہ خیال بہت عام ہو گیا ہے۔ کہ ایک شاعر کی اس کے زمانے میں یا اسکے ملک میں صحیح قدردانی نہیں ہو سکتی۔ اور آج جو شاعر غزلوں کا ایک دیوان مرتب کر لیتا ہے۔ وہ اسے جرمن قوم کے نام ہی معنون کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہندوستان میں تو شعر فہم کوئی نہیں رہا۔ ان حضرت کے کلام کو کوئی سمجھ سکتا ہے۔ تو جرمن قوم کے افراد۔ ہم شاعرانہ تعلی کو اگر اسے "شاعرانہ تعلی" ہی سمجھا جائے۔ بہت بڑا عیب نہیں گنتے۔ لیکن موجودہ شاعروں اور انکے حواریوں کا طرز طریق کہ وہ

ناظرین کو اشعار کی خوبیوں سے واقف کرکے نہیں بلکہ انہیں مرعوب کرکے اور انکی ناقابلیت جتا کر داد لیتے ہیں۔ کسی طرح بھی قابلِ تحسین نہیں۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ اس طرزِ استدلال کے عام ہونیکی بڑی وجہ غالب کی موجودہ شہرت اور یہ خیال ہے کہ غالب کی اپنے زمانے میں صحیح قدر نہیں ہوئی۔

حلیہ ہم نے پہلے حصہ میں صفیر بلگرامی اور عزیز لکھنوی کی غالب سے ملاقات کا حال درج کیا ہے۔ اس سے مرزا کی اخیر عمر کی کمزوری اور انکی اس زمانے کی وضع قطع کا حال معلوم ہوگیا ہوگا۔ لیکن مرزا نے اپنے شاگرد مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام جو خط ان کی تصویر ملنے پر لکھا ہے۔ وہ اس بارے میں نہایت جامع ہے۔ اور چونکہ نہ صرف اس میں مرزا کے ایام جوانی کی ایک دلآویز تصویر ہے۔ بلکہ ان کی جدت پسندی اور امتیازی رنگ قائم رکھنے کی خصوصیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ہم اس میں سے ایک طویل اقتباس درج ذیل کرتے ہیں۔ "تمہارا حلیہ دیکھکر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا۔ تو میرا رنگ چنپئی تھا۔ اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے۔ تو چھاتی پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس کلمہ پر کہ ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پہ کیا گزری بقول شیخ علی حزیں ؎

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی۔ اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملا۔ حافظ۔ بساطی۔ نیچہ بند۔ دھوبی۔ سقا۔ بھٹیارہ۔ جولاہہ۔ کنجڑا منہ پر ڈاڑھی۔ سر پہ بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔"

اخلاق و عادات

مرزا کے اخلاق و عادات کی حالی نے یادگارِ غالب میں جو تصویر کھینچی ہے۔ اس میں اضافہ کی گنجائش بہت کم ہے۔ اور شاعر کی شہرت کی بنیاد شاید دیوانِ غالب سے بھی زیادہ مولینا حالی کے اس شاہکار پر ہے۔ لیکن جیسا کہ حالی نے حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ یہ تصویر یک طرفی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے مرزا کے "کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں۔ اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی"۔ مرزا کی ذہنی اور دماغی خوبیوں سے ان کی شگفتہ طبعی، ذہانت، آزاد خیالی اور محققانہ نظر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لفظی اور ذہنی راستبازی کو وہ بہت اہمیت دیتے تھے۔ اور انکے فارسی خطوط میں "راستی بالائے طاعت است" کا فقرہ اتنی دفعہ دُہرایا گیا ہے۔ کہ یہ اصول انکی زندگی کا اہم ترین مسلک معلوم ہوتا ہے ——— جب اُن کی کوئی غلطی انہیں سمجھادی جاتی۔ وہ بلا تامل اس کا اعتراف کر لیتے۔ اسکے علاوہ وہ پورے درجے کے وضعدار تھے۔ اور گو انہیں صحیح نوابی شان کبھی میسر نہیں ہوئی۔ اُن سے جہانتک ہو سکا۔ انہوں نے جاگیرداروں کی تمام وضعداریاں نبھائیں۔ دوستوں کا وہ بہت خیال رکھتے۔ اور جن لوگوں کو اپنا دوست سمجھتے۔ ان کی مصائب اور بدحالی سے متاثر ہو جاتے۔ حسنِ اخلاق اور لحاظ و مروت میں وہ عہدِ مغلیہ کے شرفا کا ایک اچھا نمونہ تھے۔ لیکن مرزا آخر انسان تھے۔ فرشتہ نہیں تھے۔ اُن کا دل غصے سے۔ رنج سے رشک سے اور اس طرح کے تمام انسانی جذبات سے متاثر ہوتا۔ بعض وقت وہ طیش میں اپنے مخالفین کی نسبت ایسے سخت فقرے لکھ جاتے کہ انہیں دُہرانے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ فارسی لُغت نویسوں کی نسبت جو دُرشت اور فحش الفاظ انہوں نے استعمال کئے۔ اُنکا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اسی طرح نواب شمس الدین اور ان کے درمیان جائداد کے متعلق تنازعہ تھا۔ قضارا نواب ولیم فریزر کے قتل کے مقدمہ میں ماخوذ ہوئے۔ اس موقع پر مرزا نے ایک فارسی خط میں تاریخ کو لکھا ہے۔" انہ ایزدِ ستمگر کش ستم رسیدہ نواز بدعاہائے صبحدی میخواہم۔ کہ این خبر دسرب آزرم زود تر بباد افراہ گرفتار و از سرفرازی بپایۂ دار آید و دانم کہ ہمتم ظفریاب

ودعایم مستجاب است"۔ نواب شمس الدین تختۂ دار پہ لٹکا دیئے گئے۔ لیکن مرزا کا غصہ فرو نہیں ہوا وہ ایک اور خط میں لکھتے ہیں "قبلۂ حاجات۔ در نگے کہ در نگارش ضراعت نامہ روبے داد۔ بر افسردگئے شوق محمول نشود۔ چکنم ہمت بکارے شگرف آویختہ بود۔ و نظر منظرے بلند را دید بانی ہمیکرد۔ تا آنکہ ہنگام سر آمد و ہر کردار کیفرے کہ بایست یافت۔ مرزبان میوات مانند کریم خاں سرہنگ خویش بحلق آویختہ شد و براثرش بعدم آباد رفت ع

ہر کسے آں درود عاقبت کار کہ کشت"

یہ صحیح ہے کہ نواب نے بھی مرزا کو تکلیف دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور اس کے علاوہ مرزا کو نواب کے جرم کا یقین بھی ہوگا۔ لیکن پھر بھی ان خطوط میں ذاتی اطمینان اور غیظ و غضب کا اظہار درس عبرت سے کہیں زیادہ نمایاں ہے۔ اور یہ جذبات ایک ایسے شخص کے نہیں ہونے چاہئیں جس کے تمام ارمان "قلندری و آزادگی و ایثار و کرم" کے ہوں۔

مولینا حالی یادگار غالب میں ایک جگہ لکھتے ہیں "غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو ماہوار ہوگئی تھی۔ اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا۔ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔" مرزا کے ایک آدھ خط اور چند فارسی اشعار میں بھی اسی طرح کا اظہار ہے۔ لیکن میرے خیال میں عام طور پر یہ مان لینا کہ مرزا کا سارا قرضہ اُن کی خیرات کی وجہ سے تھا صحیح نہیں۔ حالی کے علاوہ کسی اور تذکرہ نگار نے ان کی فیاضیوں کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اسکے علاوہ غریبوں اور مسکینوں کے لئے تنگ رہنا تو وہی گوارا کر سکتا ہے۔ جو ان کی خاطر اپنا آرام اور اپنی ضروریات قربان کرے۔ مرزا بالعموم اپنے آرام اور اپنی آسائش کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور تو اور انہوں نے اپنے بھائی مرزا یوسف اور اسکے اہل و عیال کی غدر اور اسکے بعد کوئی خاص مدد نہیں کی۔ غدر کی مصیبتیں مرزا یوسف کو تن تنہا جھیلنی پڑیں۔ اور جب وہ مرگیا۔ تو معلوم ہوتا ہے مرزا نماز جنازہ میں بھی شریک

نہیں تھے۔ اس کی وفات کے بعد مرزا نے اپنی بھتیجی، بھاوج وغیرہ کیلئے کیا کیا۔ اس کا کہیں پتہ نہیں۔ لیکن ان کے ایک اردو خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کم از کم تین سال تک اپنی بھتیجی کو ایک پائی نہیں بھیجی (حالانکہ مرزا کا اپنا بسر اوقات بشیتر چچا کی پنشن پر تھا) بیشک یہ غیر معمولی وقت تھا۔ اور مرزا اپنی مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ لیکن ان کے حالات کا بغور مطالعہ کرنیکے بعد یہی خیال ہوتا ہے۔ کہ ان کی اپنی ضرورتیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں۔ کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہیں کرتے تھے اور نہ اپنے تئیں خطرے میں ڈالتے۔

مرزا کو زندگی کی مہم تن تنہا طے کرنی پڑی تھی۔ اس لئے وہ اپنی اہمیت سے خوب واقف تھے۔ اسکے علاوہ اُنھوں نے زندگی کا سبق کتابوں اصولوں سے نہیں بلکہ زمانے کے طمانچوں سے سیکھا تھا۔ وُہ جانتے تھے۔ کہ اخلاق کے معلمین خودنمائی اور فخر کے خلاف کیا کہیں۔ انسان کو اپنی خوبیوں کی طرف اکثر خود توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے اور جیسا کہ ہم بالتفصیل بتا چکے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی نظم و نثر کے متعلق انکسار[1] اور کسر نفسی سے کبھی کام نہیں لیا۔ اور غالب کا سب سے بڑا مداح غالب ہی ہے۔

ہم نے سطور مندرجہ بالا میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ کہ اگرچہ مرزا بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اُنکے احساسات اور جذبات عام انسانوں کے تھے۔ اور اُن کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ ان کا دل یوگیوں یا ولیوں کا دل نہیں تھا۔ بلکہ عام انسانوں کا۔ وُہ شاعر تھے۔ عام

---

[1] یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ غالب کے متعلق مولانا مہر کی کتاب شایع ہوئی۔ اسمیں انہوں نے "اخلاق و عادات" کے باب میں غالب کے "انکسار" "ایثار و کرم" اور مخالفت سے "عفو و درگزر" پر بہت زور دیا ہے۔ ایک خاص عنوان ہے "احسان لینا گوارا نہ تھا" ہم پہلی تین خصوصیات کی نسبت ذکر کر چکے ہیں۔ چوتھی کی نسبت ہمیں سمجھ نہیں آتا۔ کہ قاضی ولایت حسین، نواب میر غلام بابا خاں اور کئی دوسرے مربیوں کا نذر امدادی بھیجنا اگر احسان نہیں تھا تو کیا تھا۔ اور مرزا کے قصائد، خطوط وغیرہ کے کئی اندراجات کے باوجود مولینا نے کیسے مان لیا۔ کہ "غالب کسی کا ذرا سا احسان بھی گوارا نہیں کرتے تھے"۔

انسانوں سے زیادہ حساس اور اپنے احساسات کے اظہار پر قادر۔ لیکن انکے جذبات اور احساسات وہی تھے۔ جو تمام انسانوں کو بیقرار رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ناظرین ان کے دل کی داستان میں اپنی ہی کہانی پڑھتے ہیں۔ مرزا کو خود اپنی اس "بشریت" پر ناز تھا۔ ؎

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام
آشکارا دم ز عصیاں میزنم

ہم ایک فارسی قطعہ سے جسمیں انہوں نے اپنی طبعی افتاد کو نہایت خوبی سے نظم کیا ہے۔ اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

اسداللہ خاں غالب

نہ چنانم کہ بر عقیدۂ خویش　　از فسونِ کسے ہراس کنم
نتوانم کہ از نصیحت و وعظ　　عالمے را خدا شناس کنم
نہ کہ اخبارِ باستانی را　　دیو افسانہا قیاس کنم
نہ کہ ز آثار ہرچہ مشہور ست　　اثر تازہ اقتباس کنم
نہ کہ از بہر حُلّہ ہائے بہشت　　ترک آرائش لباس کنم
نہ کہ در عالم فراخ روی　　عار از ژندۂ پلاس کنم
چوں نہ من ساقیم نہ محتسبم　　نہ بر بزم نہ مے بکاس کنم

نہ بواجب نہ سعی در مانم!
نہ بہر مدعا مکاس کنم

انتخاب

ہر چند منش کہ یزدانی سروش است در سرآغاز نیز گزیدہ گو و پسندیدہ خو
بود اما بیشتر از فراخ روئی پئے جادہ نشناساں برداشتے و کجئ رفتار آناں را
لغزش مستانہ انگاشتے تا ہمدراں تکاپو پیش خراماں را بجستگی ارزش ہمقدمی
کہ در من یافتند مہر بجنبید و دل از آزرم بدرد آمد اندوہ آوارگیہائے من خوردند
و آموزگارانہ در من نگرستند شیخ علی حزیں بخندہ زیر لبی بیراہہ رویہائے مرا در نظرم
جلوہ گر ساخت و زہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی
مادۂ آں ہرزہ جنبشہائے ناروا در پائے رہ پیمائے من سوخت ظہوری بسرگرمی
گیرائی نفس حرزے ببازو و توشہ بکرم بست نظیری لاابالئے خرام بہنجار
خاصۂ خودم بچالش آورد اکنوں بہ یمن فرہ پرورش آموختگئے ایں گروہ فرشتہ شکوہ
کلک رقاص من بخرامش تدرو است و برامش موسیقار بجلوۂ طاؤس است و بپرواز عنقا۔

(غالب)

انتخاب

فہرس

ریختہ

خمخانۂ شباب

بہارِ عجم

اُردوئے معلّیٰ

کلامِ غالب کی تاریخی تدوین

دیوانِ غالب کی تاریخی تدوین میں سب سے پہلا قدم مفتی انوار الحق نے اٹھایا۔ جنہوں نے نسخہ حمیدیہ کی اشاعت کے وقت غالب کے وہ اشعار جو ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھے گئے تھے۔ بعد کے اشعار سے جُدا کرکے ترتیب دیئے مفتی صاحب نے یہ ترتیب صحیح عالمانہ ذوق سے متاثر ہو کر کی ہے۔ لیکن اس التزام میں اُنہیں بہت پیچیدگیاں پیش نہیں آئیں۔ کیونکہ دیوان کے مرتب کرتے وقت انکے پیشِ نظر دیوانِ غالب کا ایک ایسا قلمی نسخہ تھا جس کی تاریخ کتابت سنہ ۱۲۳۶ھ درج تھی۔ ظاہر ہے کہ جو اشعار اس نسخہ میں موجود تھے۔ وہ تاریخ کتابت سے پہلے ہی لکھے گئے تھے۔ اور چونکہ شاعر کی عمر اسوقت ۲۵ برس کی تھی جو اشعار اس نسخہ کے متن میں درج تھے۔ وہ اس عمر تک لکھے جاچکے ہونگے مفتی صاحب نے یہ نسخہ کسی قدر احتیاط سے شایع کیا۔ لیکن پھر بھی اس میں چند ایک غلطیاں ہیں۔ اور یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ مطبوعہ کتاب ہو بہو قلمی نسخہ کے مطابق ہے۔ مثلاً نسخہ حمیدیہ کے صفحہ ۵۱ پر ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

مفتی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ یہ غزل قلمی نسخہ میں درج ہے لیکن صفحہ ۱۰ کے بالمقابل انہوں نے قلمی نسخہ کا جو صفحہ نمونتاً دیا ہے۔ اسکے حاشیہ پر یہ غزل موجود ہے۔ اسی طرح غالب کی مندرجہ ذیل مطلع والی

مشہور غزل بھی قلمی نسخہ میں درج ہے۔ لیکن مطبوعہ نسخہ میں اس امر کی نسبت کوئی اشارہ نہیں۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اس کے علاوہ مفتی صاحب نے قلمی نسخہ کے اشعار جس ترتیب سے شایع کئے ہیں۔ اس سے یہ خیال ہو سکتا ہے۔ کہ قلمی نسخہ کے حاشیہ کے اشعار بھی تاریخ کتابت یعنی ۱۲۳۷ھ ہجری سے پہلے کے ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ بلکہ ان اشعار کا متن میں درج نہ ہونا ہی اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ دیوان کی کتابت کے وقت تو یہ اشعار موجود نہیں تھے۔ بلکہ بعد میں لکھے گئے۔

مفتی انوار الحق کے بعد دیوان غالب کی ترتیب کی سب سے پہلی باقاعدہ کوشش ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے کی۔ انکا مُرتبہ دیوان غالب باوجودیکہ ۱۹۲۸ء میں ہی اسکی اشاعت کے وعدے ہوئے تھے۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ لیکن جن اصولوں پہ وہ اسے مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کی تشریح انہوں نے اپنی کتاب کے تیسرے باب میں کر دی ہے۔ اسکے مطابق انہوں نے شاعر کے اردو کلام کو بتفصیل ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ دورِ اول ۱۸۱۱ – ۱۸۲۱

۲۔ دورِ ثانی ۱۸۲۲ – ۱۸۳۲

۳۔ دورِ ثالث ۱۸۳۲ – ۱۸۵۵

۴۔ دورِ رابع ۱۸۵۶ – ۱۸۶۹

بظاہر تو یہ ترتیب نہایت معقول ہے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ اگر شاعر کے کلام کو ان چار حصوں میں ترتیب دیکر مطالعہ کیا جائے تو اس سے شاعر کی ذہنی نشوونما سمجھنے میں بہت مدد ملنی چاہئیے۔ لیکن اگر اس ترتیب کو بغور دیکھیں تو اس کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً چوتھے دور میں جس میں شاعر کا م برس کا کلام درج ہے۔ مرزا غالب نے ایک قطعہ اور ایک غزل فقط دو نظمیں اردو میں لکھی ہیں۔ جنہیں بمشکل توثیق سے ان کا کلام کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دو نظموں سے ایک شاعرانہ دور ترتیب نہیں دیا

جا سکتا۔ اور انہیں سامنے رکھکر جو نتائج ہم اخذ کرینگے۔ وہ بلیشتر قیاس آرائی پر مبنی ہونگے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب کے پاس تاریخی ترتیب کا ذریعہ بھوپالی نسخہ کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ بیشک اس نسخہ کے حاشیہ کے اشعار کو انہوں نے ترتیب دیکر ہماری واقفیت میں اضافہ کیا۔ لیکن اسبارے میں بھی انکی رائے کہ جو اشعار قلمی نسخہ کے متن یا حاشیہ میں درج نہیں وہ سب ۱۸۳۲ء کے بعد کے ہیں غلط ہے۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے گلشن بیخار ۱۸۳۲ء میں لکھی۔ اور اسکا ایک قلمی نسخہ جس کی نواب مصطفٰے خاں نے خود تصحیح کی تھی، برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اس میں انہوں نے غالب کے اردو دیوان کا انتخاب دیا ہے۔ اور اس میں کئی ایسی غزلیں موجود ہیں جو بھوپالی نسخہ کے حاشیہ پر تو موجود نہیں۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ اگر وہ ۱۸۳۲ء سے بعد لکھی گئی ہوتیں۔ تو انکا انتخاب شیفتہ اپنے تذکرے میں نہ کرسکتے اسی طرح "حکیم ڈلی" کی تعریف میں مرزا نے جو قطعہ لکھا ہے۔ وہ قیام کلکتہ میں یعنی ۱۸۳۲ء سے پہلے لکھا گیا۔ لیکن قلمی نسخہ کے حاشیہ پر اس کا کوئی اندراج نہیں۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے۔ کہ جو اشعار نسخہ بھوپال کے حاشیہ پر درج ہیں۔ وہ ۱۸۳۲ء سے پہلے کے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں ہوسکتا۔ کہ قلمی نسخہ ۱۸۳۲ء تک کے تمام اشعار کی مکمل یادداشت ہے۔ اور جو اشعار اس میں نہیں وہ ۱۸۳۲ء سے ۱۸۵۵ء یعنی تیسرے دور کے شمار کئے جانے چاہئیں۔

ان سب باتوں کے باوجود ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب کلام غالب کے مطالعہ کو کسی اصولوں پر منضبط کرنے کی پہلی ٹھوس علمی کوشش ہے۔ اور سب سے پہلے انہوں نے شاعر کے کلام کو تاریخی ترتیب سے مطالعہ کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ جسقدر ڈاکٹر صاحب کو تنقید اور ریسرچ کے اصولوں سے واقفیت ہے اتنی غالب کی تصنیفات سے نہیں۔ اور اپنی کتاب میں انہوں نے کئی باتیں ایسی لکھی ہیں جو غلط ہیں اور جس نے اُنکی کتاب کی علمی وقعت کو بہت صدمہ پہنچایا ہے مثلاً وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲ پر غالب کے متعلق لکھتے ہیں۔ "وہ ۱۸۵۷ء کے غدر تک مہر نیمروز لکھنے میں مشغول رہا"۔ لیکن مرزا تو یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں ہی ختم کرچکے تھے۔ چنانچہ وہ ایک فارسی خط میں مولوی رجب علی خاں کو ۱۱ رجون ۱۸۵۲ء کو لکھتے ہیں" مسودہ روزنامہ روداد اورنگ نشیناں چغتائیہ بدست ہیراسنگھ

سوال داشتہ ام و ہنوز از رسید نش نشاں نیافتہ ام"۔ ان کا ایک اور خط مارچ ۱۸۵۲ء کے کچھ دن بعد مولوی رجب علیخاں کو لکھا گیا۔ اس میں بھی اس کتاب کا ذکر ہے اور لکھا ہے۔" بعد حمد و نعت و منقبت و بدح والی عصر و سبب تالیف کتاب کہ آئین نامہ طرازاں ہنگامہ آرا است۔ از کشور کشایاں تا نصیر الدین سلطان ہمایوں سخن راندہ ام۔ باقی فرداست"۔ چونکہ مرزا نے کبھی بھی ہمایوں کے بعد کے حالات نہیں لکھے۔ ظاہر ہے کہ مہر نیم روز ۱۸۵۲ء تک ہی مکمل ہوگئی ہوگی۔ علاوہ ازیں جیسا کہ نواب ضیاء الدین کی تاریخ طباعت سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۵۵ء میں چھپ بھی گئی تھی۔ اور اس کا ایک نسخہ ۱۸۵۵ء کا چھپا ہوا برٹش میوزیم میں بھی موجود ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ۱۸۵۹ء کے بعد کی اہم تصنیف مرزا کی فارسی مثنوی ابر گہربار ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب سر سید نے ۱۸۴۵ء میں آثار الصنادید لکھی۔ تو یہ مثنوی لکھی جا چکی تھی۔ چنانچہ سر سید لکھتے ہیں"..... اور ایک مثنوی مشتمل ادیہ غزوات ..... کے اگرچہ ہنوز ناتمام ہے۔ لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے"۔ علاوہ ازیں اس مثنوی کے کئی اشعار مہر نیم روز میں انتخاب ہو چکے ہیں۔

غالب کے اردو دیوان کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے۔ کہ ۱۸۵۵ء کے قریب منتخب ہوا۔ لیکن مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۸ء میں جو تذکرۃ الشعرائے اردو دہلی سے شایع کیا اس میں وہ غالب کے متعلق لکھتے ہیں۔"..... اور ایک دیوان اردو انکی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے مطبع سید الاخبار میں درمیان ۱۸۴۳ء کے چھپا تھا..... وہ دیوان بندہ کے پاس بھی ہے"۔ اسی ضمن میں انہوں نے انتخاب کے متعلق بھی ذکر کیا ہے۔ کہ مرزا نے ایک ضخیم دیوان کو "منتخب کر کے چھوٹا سا دیوان بنا لیا ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ دیوان جو ۱۸۴۲ء میں چھپ کر شایع ہوا۔ اس سے بہت پہلے منتخب ہوا ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ انتخاب مرزا کے سفر کلکتہ ۱۸۲۷ء سے پہلے مکمل ہو چکا تھا۔ اور اسکا دیباچہ بھی لکھا جا چکا تھا۔ چنانچہ مرزا نے کلکتہ سے حکیم احسن اللہ خاں کو جو خط لکھا ہے۔ اسمیں لکھتے ہیں" سطرے چند کہ بدیباچگی دیوان ریختہ کسوت حرف و رقم پوشیدہ ....

ارمغان میفرستم"۔ اسکے علاوہ مرزا کی فارسی نظم و نثر کا ایک بیش قیمت مجموعہ بانکے پور لائبریری میں
موجود ہے۔ جسکی تاریخ کتابت تو ۱۱۵۴ھ ہجری درج ہے لیکن جو یقیناً ۱۲۵۴ھ ہجری یعنی ۱۸۳۸ء
میں لکھا گیا۔ اس میں بھی دیوان ریختہ کا فارسی دیباچہ موجود ہے۔ اس زبردست شہادت کی بنا پر ہمارے
خیال میں یہ یقین کرنا خطرے سے خالی ہوگا۔ کہ مرزا کا پہلا اردو دیوان ۲۵ برس کی عمر سے پہلے ہی
مرتب ہو چکا تھا۔ اور اسکے چند سال بعد یعنی ۱۸۲۸ء سے پہلے انہوں نے اسمیں سے مشکل اور
کم پایہ اشعار نکال کر منتخب دیوان ریختہ مرتب کر لیا تھا۔ اسکے بعد انہوں نے بیشتر فارسی شعر کہے ہیں
اردو اشعار بہت کم۔ ان کا پہلا اردو دیوان ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء میں سید المطابع
میں شایع ہوا۔ اس مطبوعہ نسخہ کی ایک جلد اب بھی خان بہادر سید ابو محمد کلکٹر پیلی بھیت کے پاس ہے
معلوم ہوتا ہے اسکے چند سال بعد دربار کے تعلقات کی وجہ سے مرزا کو اردو کی طرف زیادہ توجہ دینی
پڑی اور بالآخر ۱۸۵۵ء میں جب انہوں نے نواب رام پور کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا تو اسکے
ساتھ انہوں نے اپنے اس زمانے تک کے کہے ہوئے اردو کلام کا مجموعہ بھیجا۔ یہ مجموعہ متداول
دیوان کی بنیاد ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کلام غالب کا پہلا انتخاب نہیں۔

اسکے علاوہ، ڈاکٹر صاحب نے مرزا کی فارسی تصنیفات کو بہت اہمیت نہیں دی۔
انہوں نے غالب کے اردو کلام کو چار دوروں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن فارسی کلام
کو بالکل بالائے طاق رکھا ہے۔ اب ایک شاعر کے کلام کی تاریخی تدوین کا سب سے بڑا فائدہ یہی
ہے۔ کہ اس سے شاعر کی طبعی نشو و نما اور اسکی ذہنی تربیت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اور خیالات کا
تغیر و تبدل دکھانے سے شاعر کی شخصیت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اب مرزا کی ذہنی حالت
اور انکے خیالات کا اظہار فقط انکا اردو کلام ہی نہیں بلکہ فارسی زبان میں بھی انہوں نے شعر کہے
ہیں۔ جو تعداد میں اردو سے کہیں زیادہ ہیں۔ اسکے علاوہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے بھی مرزا اپنے فارسی
کلام کو اردو دیوان سے کہیں زیادہ اہم سمجھتے تھے۔ ؎

نیست نقصان یک دو جزو است ار سواد ریختہ — کان دو نم برگے ز نخلستان فرہنگ منست

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ — بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست
فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال — مانی وارژنگم و آں نسخہ ارژنگ منست
کے درخشد جوہر آئینہ تا باقیست زنگ — صیقلی آئینہ ام ایں جوہر آں زنگ منست

اور یہ بھی صحیح ہے کہ مرزا کے اردو دیوان میں یا تو انکی طفولیت اور عنفوانِ شباب کے چند سالوں کا کلام ہے یا درباری دور کے اشعار ہیں جن کا بیشتر حصہ فرمائشاً لکھا گیا۔ اب اگر اس کلام کو مرزا کا ماحصل زندگی سمجھا جائے۔ تو اس سے غالب کی ذہنیت یا اسکے کمالِ شعر گوئی کی نسبت جو نتائج اخذ ہونگے۔ وہ غیر مکمل مواد پہ مبنی اور غلط ہونگے۔

اس اصولی کمی کے علاوہ فارسی سے ناواقفیت یا بے اعتنائی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے تصنیفاتِ غالب کی تعیین میں کئی فاش غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً یہ ایک مسلمہ اصول ہے۔ کہ کسی خط کی تاریخ تحریر اس کے مضمون سے معین ہو سکتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے سفہ ۱۲ پر جو مثال اسے واضح کرنے کیلئے دی ہے۔ وہ خود غلط ہے۔ وہ مرزا کے دو خطوط کا ذکر کرتے ہوئے جو ۱۸۶۱ء کے ہیں اور جنہیں غالب کے اردو دیوان کا ذکر ہے لکھتے ہیں "اسی طرح نواب ضیاالدین خاں کا وہ خط بھی جو بلا تاریخ ہے۔ (جس کا اقتباس درج ذیل ہے) اسی سال سے منسوب ہونا چاہیئے"۔

"جناب قبلہ و کعبہ۔ آپ کو دیوان دینے میں کیوں تامل ہے۔ . . . .
ایک جلد ہزار جلد بن جائے۔ میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو تمہاری تعریف کا قصیدہ اہلِ عالم دیکھیں۔ تمہارے بھائی کی نثر سب کی نظر سے گزرے"

اس خط کی تاریخ تحریر معین کرنا بہت آسان نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ خط اردو دیوان کے متعلق نہیں۔ جو ۱۸۶۱ء میں میرٹھ گیا۔ بلکہ فارسی کلیات کے متعلق ہے۔ کیونکہ نہ تو اردو دیوان میں نواب ضیاالدین کی "تعریف کا قصیدہ" ہے اور نہ انکے "بھائی (نواب امین الدین) کی تعریف کی نثر" یہ دونوں چیزیں فارسی کلیات میں ہیں۔ غالباً ڈاکٹر صاحب نے فارسی کلیات کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر ہم نے فیصلہ کیا کہ غالب کے فارسی کلام کو وہی اہمیت دیجائے۔

جو اسے شاعر خود دیتا تھا۔ اور تاریخی تدوین میں کلیات فارسی کا انتخاب بھی شامل ہو۔ اس تدوین کیلئے مواد کی فراہمی میں ہمیں کئی برس لگے۔ ہمیں زیادہ محنت اسلئے کرنی پڑی۔ کہ غالب کے اردو فارسی کلام کے قلمی اور ابتدائی مطبوعہ نسخوں کی نسبت جو ہماری تدوین کے ماخذ ہیں کسی کو واقفیت نہیں تھی ہم اپنی تحقیقات کے آغاز میں ہی اس نتیجے پر پہنچے تھے۔ کہ ایک بغزلگو شاعر کے کلام کو قیاسات اور اندرونی شہادت کی بنا پر تاریخی ترتیب سے مرتب کرنا بہت مشکل ہے یہ ترتیب اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے جب اسکی بنا خارجی شہادت پر ہو۔ ہمیں اس مطلب کیلئے برٹش میوزیم میں گلشن بےخار کا جو قلمی نسخہ ہے۔ وہ بہت مفید پڑا۔ پھر سفر رام پور کے دوران میں ۱۸۵۵ء کا لکھا ہوا اردو دیوان اور فارسی دیوان (مطبوعہ ۱۸۴۵ء) کی قلمی نقل ملی۔ سب سے بڑھکر یہ ہوا کہ دیوان غالب کے سب سے پہلے مطبوعہ نسخہ کا سراغ ملا جو بالآخر ہمیں خان بہادر سید ابو محمد کلکٹر دہلی کی عنایت فرمائی سے دستیاب ہوا۔ اس مطبوعہ نسخہ میں مروجہ دیوان اردو سے بہت کم شعر ہیں۔ درباری دور کے اشعار نہیں اور اشعار کی تعداد قریباً اتنی ہے جو اس دیوان اردو میں تھی جسکا خاتمہ ۱۲۵۴ھ یعنی ۱۸۳۸ء میں نواب ضیاء الدین نے لکھا۔ مروجہ دیوان اردو میں فقط غزلیات کے اشعار ۱۴۸۸ ہیں، قصائد و قطعات وغیرہ کے اسپر مستزاد۔ جب نواب ضیاء الدین نے ۱۸۳۸ء میں دیوان غالب اشاعت کیلئے مرتب کیا اور وہ خاتمہ لکھا۔ جو آثار الصنادید میں چھپ گیا ہے۔ تو اشعار کی تعداد ۱۰۷۲ تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ مرتب ہونیکے چار برس بعد تک نہ چھپ سکا۔ اور جب شایع ہوا تو اسمیں چند اشعار کی کمی بیشی ہوئی۔ اور جس طرح غالب نے ۱۸۶۱ء میں متداول اردو دیوان سے نواب ضیاء الدین کا خاتمہ حذف کر دیا تھا۔ اولین مطبوعہ نسخہ میں بھی اسے شایع نہ کیا۔ یہ نسخہ سید المطابع دہلی میں ۱۸۴۲ء میں طبع ہوا۔ اور غدر سے پہلے ایک دفعہ اور کانپور میں چھپا جو دیوان، خان بہادر سید ابو محمد کے کتبخانہ کی زینت ہے۔ اسپر سے سرورق غائب ہے۔ لیکن کتاب کی ظاہری صورت، اشعار کی تعداد، اور دوسری وجوہات کی بنا پر یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ یہ نسخہ باختلاف خفیف اسی قلمی نسخہ کی نقل ہے۔ جو ۱۸۳۸ء میں نواب ضیاء الدین نے مرتب کیا۔ اور جو ۱۸۴۲ء میں سید المطابع دہلی میں چھپا ہم نے قلمی نسخہ گلشن بےخار، دیوان غالب (مملوکہ سید ابو محمد) اور نسخہ حمیدیہ کی مدد سے مرزا کے اردو کلام کو

اور فارسی دیوان کے ان نسخوں کی مدد سے جو ہمیں رام پور ملے یا جنہیں ہم نے بانکے پور لائبریری میں تلاش کیا۔ کلامِ غالب کو مندرجہ ذیل چار دَوروں میں ترتیب دیا۔

۱۔ پہلا دَور .... ۱۸۲۱ تک

اس دَور میں وہ اشعار ہیں جو ۲۵ برس کی عُمر سے پہلے لکھے گئے۔ اور جو نسخہ حمیدیہ کے متن میں موجود ہیں۔

۲۔ دوسرا دَور .... ۱۸۲۱ .... ۱۸۳۲ تک

اس دَور میں وہ غزلیات ہیں جو نسخہ حمیدیہ کے متن میں موجود نہیں۔ لیکن دیوان غالب (مملوکہ سید ابو محمدؒ) میں چھپ چکی ہیں۔ یہ دیوان غالباً ۱۸۴۲ء میں چھپا تھا اور بظاہر تو ہمیں دوسرے دَور کو ۱۸۲۱ء سے ۱۸۴۲ء تک گننا چاہیئے تھا۔ لیکن ہمارے پاس اس امر کے باور کرنے کی کئی وجوہات ہیں کہ اس دیوان کے قریباً سبھی اشعار ۱۸۳۲ء تک لکھے جا چکے تھے۔

(۱) غالب ۱۸۳۰ء کے قریب یا اس سے پہلے اردو شعر گوئی ترک کر چکے تھے۔ اور اس زمانے سے دربار کیساتھ تعلقات استوار ہونے تک انہوں نے فارسی شعر ہی لکھے۔ وہ خود ایک خط میں شمس الامرا نائبؒ والی حیدرآباد کو لکھتے ہیں:" در آغاز ریختہ گفتمے وبہ اردو زبان غزل سرا بودمے۔ تا بہ پارسی زبان ذوقِ سخن یافت وانان وادی عنانِ اندیشہ برتافت۔ دیوان مختصرے از ریختہ فراہم آوردہ و آں را گلدستہ طاق نسیاں کرد۔ کما بیش سی سال است کہ اندیشہ پارسی سگال است"۔ اس سے یہ امر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا نے جو اشعار ۱۸۳۲ء میں لکھے ان میں آئندہ دس سالوں میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا ہوگا۔

(۲) نواب ضیاء الدین نے اردو دیوان کیلئے جو خاتمہ ۱۸۳۸ء میں لکھا۔ اسمیں دیوان غالب کے تمام اشعار کی تعداد ۱۰۷۲ بتائی ہے۔ اور نسخہ ابو محمدؒ میں بھی اشعار کی تعداد قریباً اتنی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرزا نے ۱۸۳۸ء سے ۱۸۴۲ء تک چار سال میں اردو اشعار میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا۔

(۳) اس دَور میں ہمارے شمار کے مطابق ۵۸ غزلیات ہیں۔ ان میں سے کئی غزلیات ایسی ہیں۔ جو بھوپالی قلمی نسخہ کے حاشیہ پر موجود ہیں اور بقول ڈاکٹر لطیف ۱۸۳۲ء سے پہلے کی ہیں نصف کے قریب غزلیات کا انتخاب نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ گلشن بیخار میں موجود ہے۔ یہ تذکرہ ۱۸۳۲ء میں لکھا گیا۔ اور

اس کا نہایت ابتدائی قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ ان دونو ذرایع سے ہم ۴۳ غزلوں کی نسبت کہہ سکتے ہیں۔ کہ وُہ ۱۸۳۲ء سے پہلے کی ہیں۔ باقی غزلوں اور قطعات میں سے شاید ایک آدھ اس سال سے بعد کی ہو۔ لیکن بہت سی ایسی ہونگیں جو گلشن بیخار کی تصنیف سے پہلے لکھی جا چکی تھیں۔ لیکن جنکا انتخاب شیفتہ اپنے مختصر سے تذکرہ میں درج نہ کرسکے۔ مثلاً جگنی ڈلی کی تعریف میں جو قطعہ ہے۔ وہ یقیناً ۱۸۳۲ء سے پہلے کا ہے لیکن گلشن بیخار میں اسکا کوئی شعر منتخب نہیں ہوا۔

(۴) مرزا غالباً اپنا دیوان کلکتہ جانے سے پہلے ہی منتخب کر چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے وہاں سے حکیم حسن اللہ خاں کو جو فارسی خط لکھا ہے۔ اسمیں انہیں دیوان ریختہ کا دیباچہ بھیجنے کا ذکر ہے۔ اسکے بعد دیوان کو اشاعت کیلئے مرتب کرتے وقت مرزا نے یہ دیباچہ درج کتا کیا تو اسکی تاریخ تحریر ۲۴۔ ذیقعد ۱۲۴۸ھ لکھی یعنی آغاز ۱۸۳۳ء

ان وجوہات کی بنا پر ہمنے فیصلہ کیا ہے کہ نسخہ ابو محمد کے اشعار کو ۱۸۳۲ء سے پہلے کے گنا جائے بیشک اسمیں دس بیس اشعار ایسے ہونگے جو اس سال کے بعد لکھے گئے اور غالباً اشعار کا معتدبہ حصہ ۱۸۲۶ء سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ لیکن جو شہادت ہمیں دستیاب ہوئی ہے۔ اسکی بنا پر ۱۸۳۲ء کو دوسرے دَور کا اختتامی سال تسلیم کرنا موزوں ترین ہے۔ اور اسمیں غلطی کا بہت کم امکان ہے۔

۳۔ تیسرا دَور ۱۸۲۷......۱۸۴۷

اسے ہم نے تین مختصر دَوروں میں ترتیب دیا ہے۔ (ا) ۱۸۲۷.........۱۸۳۰ یعنی وُہ اشعار جو مرزا نے سفر کلکتہ کے دوران میں لکھے۔ (ب) ۱۸۳۰.........۱۸۳۷ یعنی وہ اشعار جو میخانۂ آرزو مرتب ہونے تک لکھے جا چکے تھے۔ (ج) ۱۸۳۷.........۱۸۴۷ یعنی وہ باقیماندہ اشعار جو دیوان غالب مطبوعہ ۱۸۴۷ء کی رام پور والی نقل میں موجود ہیں۔

۴۔ چوتھا دَور ۱۸۴۸......۱۸۵۵

اسمیں وہ اشعار ہیں جو نسخہ ابو محمد میں نہیں۔ لیکن رام پور لائبریری کے اس قلمی نسخہ میں ہیں۔ جو مرزا نے نواب یوسف علیخاں کو ۱۸۵۵ء میں رام پور بھیجا۔

غدر میں اور غدر کے بعد جو اشعار لکھے گئے تھے۔ اُن سے پانچواں دَور شاعری ترتیب دیا جاسکتا

تھا۔ لیکن دو تین اُردو غزلوں اور چند فارسی قصائد سے ایک علیحدہ دَورِ شاعری ترتیب دینے میں کوئی مصلحت نہیں۔ حقیقتاً یہ زمانہ مرزا کی اُردو نثر کا تھا۔ اور مرزا نے جو اردو فارسی اشعار اس زمانے میں لکھے چونکہ وہ زبان اور بیان کے لحاظ سے چوتھے دَور کے اشعار سے مشابہ ہیں ہمنے انہیں بھی چوتھے دور میں باقی اشعار سے علیحدہ درج کر دیا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم اتنا کہدینا چاہتے ہیں کہ مکمل شرح کلام غالب کی جن غزلوں کو مولینا نیازؔ اور دوسرے اہلِ قلم نے غالب کے نتائج طبع مان لیا۔ انہیں کلام غالب ماننے میں ہمیں بہت تامل ہے۔ ہماری وجوہات بالاختصار یہ ہیں :-

(۱) جس بیاض سے یہ اشعار نقل ہوئے ہیں اُسکے مالک، مُرتب اور کاتب کی نسبت کوئی قابلِ ذکر واقفیت نہیں۔ تاریخ کتابت اس پر درج نہیں۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ "کوئی صاحب شاکر تھے۔ اُنکو مرزا نے وقت بے وقت رام پور میں یہ غزلیں لکھوئیں اور وہ انکے پاس رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب دیوان طبع ہوگا۔ تو یہ غزلیں بھی اس میں شریک کردی جاوینگی"۔ مرزا کے خطوط سے ظاہر ہے کہ وہ رام پور فقط دو دفعہ گئے۔ ایکدفعہ اخیر جنوری ۱۸۶۰ء میں اور دوسری دفعہ اکتوبر ۱۸۶۵ء میں۔ دوسری دفعہ جب مرزا رام پور گئے۔ انکی عمر اڑسٹھ ۶۸ سال سے زیادہ تھی۔ اور صحت کی حالت ناگفتہ بہ۔ ایسی حالت میں یہ خیال کرنا کہ انہوں نے ۲۵ ایسی غزلیں جو دقیق خیالات سے پُر ہیں لکھی ہونگی عبث ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ غزلیں فرمائشاً بھی نہیں لکھی گئیں اور ان میں نواب رام پور کی طرف کسی جگہ اشارہ نہیں۔ مرزا نے بہادر شاہ کی فرمائش پر جو غزلیں لکھیں، اُن میں بادشاہ کا ذکر اکثر آجاتا ہے اب اگر مرزا نے یہ غزلیں بامرِ مجبوری فرمانروائے رام پور کے ارشاد پر لکھیں۔ توکم از کم ایک غزل میں نواب کا ذکر ہوتا۔ غالب نے پہلا سفر ۱۸۶۰ء میں کیا اس سفر کے دَوران میں انہوں نے نواب ضیاءالدین کی فرمائش پر نواب صاحب رام پور سے اپنے دیوان کا نسخہ لیکر نواب ضیاؔالدین کے پاس بھیجا۔ واپسی پر میرٹھ اُترے تو منشی ممتاز علی نے انہیں دیوان کے ایک نسخہ کیلئے کہا۔ اور جیسا کہ مرزا کے خطوں سے ظاہر ہے۔ انہوں نے نواب ضیاءالدین

کے پاس سے یہ نسخہ لیکر میرٹھ بھیج دیا۔ اب اگر ان ۲۵ غزلوں کی نسبت یہ بیان درست ہے کہ وہ دیوان کی طباعت کے وقت شامل ہوئی تھیں تو یہ بات بہت عجیب ہے کہ اس فیصلہ کے تھوڑی دیر بعد جب مرزا میرٹھ اپنے دیوان کی اشاعت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ تو اپنے تازہ ترین کلام کو اس میں شامل نہیں کرتے۔

(۳) مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام غالب کے اردو خطوط ہیں لیکن وہ رام پور کے سفر میں غالب کے شریک نہ تھے۔ غالب انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں " قبلہ وکعبہ۔ فقیر پا در رکاب ہے۔ سہ شنبہ چہار شنبہ ان دونو دنوں میں سے ایک دن عازم رام پور ہونگا۔ ...... اب جو کوئی خط آپ بھیجیں، مکان کا پتہ لکھنا ضروری نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے" ظاہر ہے کہ اگر شاکر صاحب رام پور ہوتے تو انہیں مرزا کے نام (اور شہر کے نام سے) خط لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ مولوی عبدالرزاق کے سوا اور کسی شاکر کا غالب کے خطوط میں کوئی ذکر نہیں۔

(۴) اس زمانے میں مرزا نے جو غزلیں لکھیں۔ اُن کے خیالات سادہ اور زبان صاف ہے مثلاً

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

لیکن مولینا آسی نے جو اشعار شایع کئے ہیں اُن میں سے اکثر دقیق اور مرزا کی اس زمانے کی طرزِ شاعری کے خلاف ہیں۔ جو اشعار سادہ ہیں۔ وہ بھی مرزا کی طرزِ شاعری کی ان خصوصیات سے عاری ہیں جو انکے اس زمانے کے اردو اشعار کا مابہ الامتیاز ہیں ایک شعر تو ایسا ہے کہ اسکے پڑھنے سے میر امانی آسد کا وہ مطلع جسپر مرزا نے اپنا تخلص بدل دیا تھا۔ یاد آتا ہے۔ ؎

وفا جفا کی طلبگار ہوتی آئی ہے   ازل کے دن سے یہ اے یار ہوتی آئی ہے

(۴) مرزا کے علاوہ غالب علیخاں اور دو تین دوسرے شعرا کا تخلص غالب تھا۔ اگر بیاض کے سارے اشعار غالب کے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ کسی اور شاعر کے ہوں۔ غالب کے یقیناً نہیں۔ ہمنے اِن وجوہات کی بنا پر ان غیر مطبوعہ غزلیات کو غالب کے اشعار نہیں مانا اور ان کا انتخاب غالب کی شاعری کے کسی دَور میں نہیں دیا۔

رنگِ بیدل
بادۂ نیم رس

۱۸۰۷؟....۱۸۲۱

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

غالبؔ

دیباچہ دیوان ریختہ

مشام شمیم آشنایان را صلا و نہاد انجمن نشیناں را مژدہ کہ لختے از سامان مجمرہ گردانی آمادہ و دامنے از عودِ ہندی دست بہم دادہ است۔ نہ چو بہائے سنگ شعب خوردہ ہنجار نا طبعی شکستہ بے اندام تراشیدہ بلکہ بہ تیشہ شگافتہ بکاوش ریز ریز کردہ بسوہاں خراشیدہ ایدون نفس گداختگیہائے شوق بجستجوئے آتش پارسی است نہ آتشی کہ در گلخنہائے ہند افسردہ و خاموش داز کفِ خاکستر برگ خورش سیہ پوش بینی چہ بردئے مسلم است تا پاکی باستخوان مردہ ناہار شکستن و از دیوانگی برشتۂ شمع مزار کشتہ آویختن بر آئینہ بدل گداختن نیرزد و بزم افروختن را نشاید رُخ آتش بہ صنع برافروزندہ و آتش پرست را بہ بادہ فراہم در آتش سوزندہ نیک مبادا ندکہ پژوہندہ در ہوائے آں رخشندہ آذر نعل در آتش است کہ بچشم روشنی ہوشنگ از سنگ بیروں تافتہ و در ایوان لہراسپ نشو و نما یافتہ حسن را فروغ است و لالہ را رنگ و مغ را چشم و کدہ را چراغ بخشندہ یزداں درون بجستن برافروز را سپاسم کہ شرارے ازاں آتش تابناک در خاکسترِ خویش یافتہ بکاوکاو سینہ شتافتہ ام و اد نفس دمہ براں بر نہادہ بود کہ در کم مایۂ روزگاراں آنمایہ فراہم تواند آمد کہ مجمرہ را فروشنائی چراغ و رایحہ عود را بال شناسائیٔ دماغ تواند بخشید ہمانا نگارندۂ ایں نامہ را آں در سر است کہ پس از انتخاب دیوان ریختہ بگرد آوردن سرمایۂ دیوان فارسی برخیزد و استفاضۂ کمال ایں فریور فن پس زانوئے خویش نشیند امید کہ سخن سرایان سخنور ستائے پراگندہ ابیاتے را کہ خارج ازیں اوراق یابند از آثار تراوش رگِ کلک ایں نامہ سیاہ نشناسند و جامہ گرد آورندہ را در ستائش و نکوہش آں اشعار ماذون و ماخوذ نسگالند یارب ایں بوئے ہستی ناشنیدہ و از نیستی بہ پیدائی نارسیدہ یعنی نقش بضمیر آمدہ نقاش کہ بہ اسد اللہ خاں موسوم و بہ میرزا نوشہ معروف بہ غالب متخلص است چنانکہ اکبرآبادی مولد و دہلوی مسکن است فرجام کار نجفی مدفن نیز باد۔

تمام شد بست و چہارم شہر ذیقعدہ ۱۲۴۸ھ

غالب

غالب نے جو اشعار ابتدائے شعر گوئی سے ۲۵ برس کی عمر تک لکھے۔ انہیں ہمنے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ صفحہ ۱۷۷ سے صفحہ ۱۹۱ تک اُن غزلوں کے اشعار درج ہیں جنہیں مرتبہ دیوان مرتب کرتے وقت مصنف نے بالکل نظر انداز کر دیا اور جو غالباً نہایت ابتدائی شعر گوئی کا نمونہ ہیں۔ اُن میں سے ہمنے ایسے اشعار کا انتخاب کر دیا ہے جو شاعر کی ابتدائی طرزِ شاعری کو نمایاں کرتے ہیں۔ اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی بے مایہ نہیں۔ صفحہ ۱۹۲ سے صفحہ ۲۴۴ تک ان غزلیات اور قصائد کا انتخاب ہے جنہیں شاعر نے ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھا تھا۔ اور جن کے اکثر اشعار منتخب دیوان ریختہ میں موجود ہیں

ان صفحات میں جب کسی شعر کے مقابل "م" درج ہو تو اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ اگرچہ ردیف اور قافیہ کی وحدت کیوجہ سے یہ شعر باقی اشعار کے ساتھ درج ہے۔ یہ شعر اس دَور کا نہیں بلکہ بعد میں شاعر نے اضافہ کیا ہے۔ جہاں ۱ یا ۲ لکھا ہو وہاں مصرعہ اول یا مصرعہ ثانی بعد کا ہوگا۔

اسی طرح جہاں کسی شعر کے مقابل "ق" درج ہو وہاں اس شعر کو اس سے پہلے دَور کا شعر سمجھنا چاہیے

جہاں ایک غزل کے چند اشعار ایک لکیر کے بعد درج ہیں وہ اس دَور کے نہیں بلکہ شاعر نے بعد میں اضافہ کئے ہیں۔ عموماً ایسے اشعار دَور اول کے دوسرے حصے میں ملینگے جنہیں شاعر نے دیوان مرتب کرتے وقت (یعنی دوسرے دَور میں) اضافہ کیا۔

غزلیات رنگِ بیدل غزلیات

بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبہا
سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیح کوکب ہا

کرے گر فکرِ تعمیرِ خرابی ہائے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیرونِ قالب ہا

عیادت ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے
رفوئے زخم کرتی ہے بنوکِ نیشِ عقرب ہا

کرے ہے حسنِ خوباں پردہ میں شاطگی اپنی
کہ ہے تہ بندیٔ خطِ سبزۂ خط در تہ لب ہا

فنا کو عشق ہے بیقصداں حیرت پرستاراں
نہیں رفتارِ عمرِ تیز رو پابندِ مطلب ہا

اسد کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

وحشی بن صیاد نے ہم رمخوردوں کو کیا رام کیا
رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ صرفِ قماشِ دام کیا

مہر بجائے نامہ لگائی برلبِ پیکِ نامہ رساں
قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

شامِ فراقِ یار میں جوشِ خیرہ سری سے ہمنے اسد
ماہ کو درتسبیح کواکب جائے نشینِ امام کیا

گرفتاری میں فرمانِ خطِ تقدیر ہے پیدا
کہ طوقِ قمری از ہر حلقۂ زنجیر ہے پیدا

زمیں کو صفحۂ گلشن بنایا خوں چکانی نے
چمن بالیدنی ہا از رمِ نخچیر ہے پیدا

نہیں ہے کفِ لبِ نازک یہ فرطِ نشۂ مے سے
لطافت ہائے جوشِ حسن کا سرشیر ہے پیدا

عروجِ نا امیدی چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے
بہارِ بے خزاں از آہِ بے تاثیر ہے پیدا

اسد جس شوق سے ذرّے تپش فرسا ہوں روزن میں
جراحت ہائے دل سے جوہرِ شمشیر ہے پیدا

بہ مہر نامہ جو بوسہ گلِ پیام رہا | ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
ہوا نہ مجھ سے بجز دردِ حاصلِ صیاد | بسانِ اشک گرفتارِ چشم دام رہا
دل و جگر تفِ فرقت سے جلکے خاک ہوئے | ولے ہنوز خیالِ وصالِ خام رہا
شکستِ رنگ کی لائی سحر شبِ سنبل | یہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا
دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا | کہ شب خیال میں بوسوں کا اژدہام رہا

نہ پوچھ حال شب و روزِ ہجر کا غالب
خیالِ زلف و رخِ دوست صبح و شام رہا

ہے بہاراں میں خزاں پرور خیالِ عندلیب | رنگِ گل آتشکدہ ہے زیرِ بالِ عندلیب
عمر میری ہو گئی صرفِ بہارِ حسنِ یار | گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب
منع مت کر حسن کی ہمکو پرستش سے کہ ہے | بادۂ نظارۂ گلشن حلالِ عندلیب

ہے، مگر موقوف بر وقتِ دگر کارِ اسد
اے شبِ پروانہ و روزِ وصالِ عندلیب

ناخنِ دخلِ عزیزاں یک قلم ہے نقب زن | پاسبانیِٔ طلسمِ کنجِ تنہائی عبث
محملِ پیمانۂ فرصت ہے بردوشِ حباب | دعوئے دریاکشی و نشہ پیمائی عبث
اے اسد بیجا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز | عالمِ تسلیم میں یہ دعوئے آرائی عبث

قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہو کر سوئے دشت

م بن گیا تقلید سے میری یہ سودائی عبث!

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ — رفتار نہیں، بیشتر از لغزشِ پا ہیچ

حیرت ہمہ اسرار پہ مجبورِ خموشی — ہستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا ہیچ

تمثال گداز آئینہ ہے عبرتِ بینش — نظارہ تحیر، چمنستانِ بقا ہیچ

گلزارِ دمیدن، شررستانِ رمیدن — فرصت تپش و حوصلۂ نشو و نما ہیچ

آہنگِ عدم نالہ بہ کہسار گرو ہے — ہستی میں نہیں شوخیٔ ایجادِ صدا ہیچ

کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا — سامانِ دعا، وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ

آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدل

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند — اے طفلِ خود معاملہ قد سے عصا بلند

ویرانیٔ جزآمد و رفتِ نفس نہیں — ہے کوچہائے نے میں غبارِ صدا بلند

رکھتا ہے انتظارِ تماشائے حسنِ دست — مژگانِ بازمانده سے دستِ دعا بلند

موقوف کیجئے یہ تکلف نگاریاں — ہوتا ہے ورنہ شعلۂ رنگِ حنا بلند

ہے دلبری کمینگرِ ایجادِ یک نگاہ — کارِ بہانہ جوئیٔ چشمِ حیا بلند

بالیدگی نیازِ قدِ جانفزا اسدؔ

در ہر نفس بقدرِ نفس ہے قبا بلند

حسرتِ دستگہ و پائے تحمل تا چند — رگِ گردن خطِ پیمانۂ بے مُل تا چند

کوکبِ بخت بجز روزنِ پُردود نہیں — عینکِ چشمِ جنوں حلقۂ کاکل تا چند

چشمِ بے خونِ دل و دل تہی از جوشِ نگاہ — بزباں عرضِ فسونِ ہوسِ گل تا چند

بزمِ داغِ طرب و باغ کشادِ پرِ گل — شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند

نالہ دامِ ہوس و دردِ اسیری معلوم — شرح برخود غلطیہائے تحمل تا چند

سادگی ہے عدمِ قدرتِ ایجادِ غنا — ناکسی! آئینۂ نازِ توکل تا چند

اسدِ خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام
مشکل آساں کن یک خلق بتغافل تا چند

بہ کامِ دل کریں کس طرح گمرہاں فریاد — ہوئی ہے لغزشِ پا لکنتِ زباں فریاد

کمالِ بندگیٔ گل ہے رہنِ آزادی — زدستِ مشتِ پر و خارِ آشیاں فریاد

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں، ورنہ — برنگِ نے ہے نہاں در ہر استخواں فریاد

تغافل آئینہ دارِ خموشیٔ دل ہے — ہوئی ہے محو بہ تقریبِ امتحاں فریاد

ہلاکِ بیخبری نغمۂ وجود و عدم — جہان و اہلِ جہاں سے جہاں جہاں فریاد

جوابِ سنگدلیہائے دشمناں، ہمت — زدستِ شیشہ دلیہائے دوستاں فریاد

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسد
خدا کے واسطے اے شاہِ بیکساں فریاد

بینش بسعیِ ضبطِ جنوں نوبہارتر — دل در گدازِ نالہ بہ کاہ آبیارتر

قاتل بعزمِ نازو دل از زخم در گداز | شمشیر آبدار و نگاہ آبدار تر
ہے کسوتِ عروجِ تغافل کمالِ حسن | چشمِ سیہ بمرگِ نگہ سوگوار تر
اے چرخ خاک بر سرِ تعمیرِ کائنات | لیکن بنائے عہدِ وفا استوار تر

آئینہ داغِ حیرت و حیرت شکنجِ یاس
سیماب بیقرار و اسد بیقرار تر

گو بیابانِ تمنا و کجا جولانِ عجز | آبلے پا کے ہیں یاں رفتار کو زندانِ عجز
ہو قبولِ کم نگاہی تحفۂ اہلِ نیاز | اے دل و اے جانِ ناز اے دین و اے ایمانِ عجز
بوسہ یا انتخاب بدگمانیہائے حسن | یاں ہجومِ عجز سے تا سجدہ ہے جولانِ عجز
حسن کو غنچوں سے ہے پوشیدہ چشمی ہائے ناز | عشق نے وا کی ہر یک خار سے مژگانِ عجز
وہ جہاں مسند نشینِ بارگاہِ ناز ہو | قامتِ خوباں ہے محرابِ نیارستانِ عجز

بسکہ بے پایاں ہے صحرائے محبت اے اسد
گردباد اس راہ کا ہے عقدۂ پیمانِ عجز

نہ بندھا تھا بہ عدم نقشِ دلِ مور ہنوز | تب سے ہے یاں دہنِ یار کا مذکور ہنوز
صد تجلی کدہ ہے صرفِ جبینِ غربت | پیرہن میں ہے غبارِ شررِ طور ہنوز
پا بُر از آبلہ، راہِ طلب مے میں ہوا | ہاتھ آیا نہیں یک دانۂ انگور ہنوز
گل کھلے، غنچے چٹکنے لگے، اور صبح ہوئی | سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

اے اسد، تیرگیٔ بختِ سیہ ظاہر ہے

نظر آتی نہیں صبحِ شبِ دیجور ہنوز

حاصلِ دلبستگی ہے عمرِ کوتاہ اور بس — وقفِ عرضِ عقدہ ہائے متصل تارِ نفس

تیز تر ہوتا ہے خشمِ تندرویاں عجز سے — ہے رگِ سنگِ فسانِ تیغِ شعلہ خار و خس

سختیٔ راہِ محبت منعِ دخلِ غیر ہے — پیچ و تابِ جادہ ہے یاں جوہرِ تیغِ عس

اے اسدؔ ہم خود اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

دشتِ الفت میں ہے خاکِ کشتگاں محبوس و بس — پیچ و تابِ جادہ ہے خطِ کفِ افسوس و بس

ہے تصور میں نہاں سرمایۂ صد گلستاں — کاسۂ زانو ہے مجھ کو بیضۂ طاؤس و بس

کفر ہے، غیراز وفورِ شوق، رہبر خواستن — راہِ صحرائے حرم میں ہے جرسِ ناقوس و بس

یک جہاں گل تختۂ مشقِ شگفتن ہے اسدؔ
غنچۂ خاطر رہا افسردگی مانوس و بس

عشاق اشکِ چشم سے دھوویں ہزار داغ — دیتا ہے اور جوں گلِ و شبنم بہار داغ

جوں اعتمادِ نامہ و خط کا، ہو مہر سے — یوں عاشقوں میں ہے سببِ اعتبارِ داغ

ہوتے ہیں نیست جلوۂ خور سے ستارگاں — دیکھ اسکو دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ

وقتِ خیالِ جلوۂ حسنِ بتاں اسدؔ
دکھلائے ہے مجھے دو جہاں لالہ زارِ داغ

بلبلوں کو دور سے کرتا ہے منعِ بارِ باغ — ہے زبانِ پاسباں خارِ سرِ دیوارِ باغ

کون آیا جو چمن بیتابِ استقبال ہے — جنبشِ موجِ صبا ہے شوخیِ رفتارِ باغ

کون گل سے ضعفِ خاموشیِ بلبل کہہ سکے — نے زبانِ غنچہ گویا نے زبانِ خارِ باغ

جوشِ گل کرتا ہے استقبالِ تحریرِ اسدؔ
زیرِ مشقِ شعر ہے نقش از پئے احضارِ باغ

عیسیٔ مہرباں ہے شفاریز یک طرف — دردِ آفریں ہے طبعِ الم خیز یک طرف

سنجیدگی ہے ایک طرف رنجِ کوہکن — خوابِ گرانِ خسرو پرویز یک طرف

خرمن بباد دادۂ دعوے ہیں، ہو سو ہو — ہم اک طرف ہیں برقِ شرر ریز یک طرف

ہر مو بدن پہ شہپرِ پرواز ہے مجھے — بیتابیٔ دلِ تپش انگیز یک طرف

یک جانب اے اسدؔ شبِ فرقت کا بیم ہے
دامِ ہوس ہے زلفِ دلآویز یک طرف

بدر ہے آئینۂ طاقِ ہلال — غافلاں! نقصاں سے پیدا ہے کمال

بسکہ ہے اصلِ دمیدنہا غبار — ہے نہالِ شکوۂ ریحاں سفال

نور سے تیرے ہے اسکی روشنی — ورنہ ہے خورشید یکدستِ سوال

ہو جو بلبل پیروِ فکرِ اسدؔ
غنچۂ منقارِ گل ہو زیرِ بال

ازانجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم — رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم

رسیدن گلِ باغِ واماندگی ہے — عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم

نفس ہو نہ معزولِ شعلہ دُرُودن — کہ ضبطِ تپش سے شرر کار ہیں ہم
تغافل کمینگاہِ وحشت شناسی — نگہبانِ دلہائے اغیار ہیں ہم
تماشائے گلشن، تمنائے چیدن — بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم
نہ ذوقِ گریباں نہ پروائے داماں — نگاہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

اسدؔ! شکوہ کفرو دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے لاچار ہیں ہم

ڈرتا ہوں کوچہ گردیِ بازارِ عشق سے — ہیں خارِ راہ جوہرِ تیغِ عسس تمام
اے بالِ اضطراب کہاں تک فسردگی — یک پرزدن تپش میں ہے کارِ قفس تمام
گذرا جو آشیاں کا تصور بوقتِ بند — مژگانِ چشمِ دام ہوئے خار و خس تمام

کرنے نہ پائے ضعف سے شورِ جنوں اسدؔ
اب کی بہار کا یونہی گذرا برس تمام

سودائے عشق سے دمِ سردِ کشیدہ ہوں — شامِ خیالِ زلف سے صبحِ دمیدہ ہوں
کی متصل ستارہ شماری میں عمر صرف — تسبیحِ اشکہائے ز مژگاں چکیدہ ہوں
ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں
دیتا ہوں کشتگاں کو سخن سے سرِ تپش — مضرابِ تارہائے گلوئے بریدہ ہوں

جوں بوئے گل ہوں گرچہ گرانبارِ مشتِ زر
لیکن اسدؔ بوقتِ گزشتن جریدہ ہوں

خوں در جگر نہفتہ، بہ زردی رسیدہ ہوں — خود آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ ہوں

میں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب — لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں

تسلیم سے یہ نالۂ موزوں ہوا حصول — اے بے خبر! میں نغمۂ چنگِ خمیدہ ہوں

پیدا نہیں ہے اصلِ تگ و تازِ جستجو — مانندِ موجِ آب زبانِ بریدہ ہوں

سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا — یارب میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں

میرا نیاز و عجز ہے مفتِ بتاں اسدؔ
یعنی کہ بندۂ بہ درم ناخریدہ ہوں

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں — برنگِ جادہ سرِ کوئے یار رکھتے ہیں

طلسمِ مستیِ دل آں سوئے ہجومِ سرشک — ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

ہوا ہے گریۂ بیباک ضبط سے تسبیح — ہزار دل پہ ہم اک اختیار رکھتے ہیں

جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالبؔ
بسانِ دشت دلِ پُر غبار رکھتے ہیں

ضبط سے مطلب بجز وارستگی دیگر نہیں — دامنِ تمثالِ آبِ آئینہ سے تر نہیں

ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت — عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

باعثِ ایذا ہے برہم خوردنِ بزمِ سرور — لختِ لختِ شیشۂ بشکستہ جز نشتر نہیں

ہے فلک بالا نشینِ فیضِ خم گردیدنی — عاجزی سے ظاہرا رتبہ کوئی برتر نہیں

کب تلک پھیرے اسدؔ لبہائے تفتہ پر زباں

طاقتِ لب تشنگی اے ساقیٔ کوثر نہیں

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ — ورنہ ہے چرخ و زمیں یک ورقِ گرداندہ

میکدے میں ز دل افسردگیٔ بادہ کشاں — موجِ مے مثلِ خطِ جام ہے ہر جا ماندہ

خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفت بیاں — ہے سخن گرد ز داماںِ ضمیر افشاندہ

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے — ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

حیف بیحاصلیِ اہلِ ریا پر غالب
یعنی ہیں ماندۂ آں سو و ازیں سو راندہ

شکوہ و شکر کو ثمر، بیم و امید کا سمجھ — خانہ آگہی خراب، دل نہ سمجھ بلا سمجھ

وحشتِ دردِ بیکسی بے اثر اس قدر نہیں — رشتۂ عمرِ خضر کو نالۂ نارسا سمجھ

گاہ بہ خلد امیدوار گہ بہ جحیم بیمناک — گرچہ خدا کی یاد ہے کلفتِ ماسوا سمجھ

اے بہ سرابِ حسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں — شوق کو منفعل نہ کر ناز کو التجا سمجھ

ہے خطِ عجز ماو تو اولِ درسِ آرزو — ہے یہ سیاقِ گفتگو کچھ نہ سمجھ فنا سمجھ

نغمہ ہے محوِ سازِ رہ، نشہ ہے بے نیازِ رہ — رند تمام نازِ رہ، خلق کو پارسا سمجھ

نے سر و برگِ آرزو نے رہ و رسمِ گفتگو — اے دل و جانِ خلق تو ہم کو بھی آشنا سمجھ

لغزشِ پا کو ہے بلد، نغمۂ یا علی مدد
ٹوٹے گر آئینہ اسد سبحہ کو خوں بہا سمجھ

بسکہ چشم از انتظارِ خوش خطاں بے نور ہے — یک قلم شاخِ گلِ نرگس عصائے کور ہے

ہے عجب مردوں کو غفلت ہائے اہلِ دہر پہ   سبزہ جوں انگشتِ حیرت دردہاں گور ہے

حسرت آبادِ جہاں میں ہے الم غم آفریں   نوحہ، گویا، خانہ زادِ نالۂ رنجور ہے

کیا کروں غمہائے پنہاں لے گئے صبر و قرار   دزد اگر ہو خانگی، تو پاسباں مجبور ہے

ہے وہاں تکلیفِ عرضِ بے دماغی اور اسدؔ

یاں صریرِ خامہ مجھکو، نالۂ رنجور ہے

یہ سرنوشت میں میری ہے، اشک افشانی   کہ موجِ آب ہے ہر ایک چینِ پیشانی

لبِ نگار میں، آئینہ دیکھ آبِ حیات   بہ گمرہیِ سکندر ہے، محوِ حیرانی

کہوں وہ مصرعِ برجستہ، وصفِ قامت میں   کہ سرو ہو نہ سکے اُسکا مصرعِ ثانی

اسدؔ نے کثرتِ دلہائے خلق سے جانا

کہ زلفِ یار ہے، مجموعۂ پریشانی

ہوا جب حسن کم، خط بر عذارِ سادہ آتا ہے   کہ بعد از صاف مے، ساغر میں دُردِ بادہ آتا ہے

محیطِ دہر میں بالیدن، از ہستی گزشتن ہے   کہ یاں ہر اک، حباب آسا، شکست آمادہ آتا ہے

دیارِ عشق میں جاتا ہے، جو سوداگری ساماں   متاعِ زندگانی ہا، بہ غارت دادہ آتا ہے

اسدؔ وارستگاں با وصفِ ساماں بے تعلق ہیں

صنوبر گلستاں میں با دلِ آزادہ آتا ہے !

خبر نگہ کو نگہ، چشم کو عدو جانے   وہ جلوہ کر، کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو   زیادہ اُس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے

جنوں فسردۂ تمکیں ہے، کاش، عہدِ وفا گدازِ حوصلہ کو پاسِ آبرو جانے
زباں سے عرضِ تمنائے خاموشی معلوم مگر، وہ خانہ بر اندازِ گفتگو جانے

مسیح کشتۂ الفت بر علی خاں ہے
کہ جو اسدؔ تپشِ نبضِ آرزو جانے

صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے غافلاں! آغازِ کار، آئینۂ انجام ہے
بسکہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق ہر بُتِ خورشید طلعت آفتابِ بام ہے
کیا کمالِ عشق نقص آبادِ گیتی میں، ملے پختگی ہائے تصوریاں خیالِ خام ہے

ہو جہاں وہ ساقیِ خورشیدِ مجلس فروز!
واں اسدؔ! تارِ شعاعِ مہر خطِ جام ہے

اے خوشا وقتے! کہ ساقی یک خمستاں وا کرے
تار و پودِ فرشِ محفل پنبۂ مینا کرے
یک درے بر روئے رحمت بستہ دورِ شش جہت
نا امیدی ہے خیالِ خانہ ویراں کیا کرے
نا توانی سے نہیں سر در گریبانی، اسدؔ
ہوں سراپا یک قلمِ تسلیم، جو مولا کرے

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

م

بہ رہنِ ضبط ہے آئینہ بندیٔ گوہر　　　　وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پُرنم ہے
اگر نہ ہووے رگِ خواب صرفِ شیرازہ　　　　تمام دفترِ ربطِ مزاج برہم ہے
اسدؔ بہ نازکیٔ طبع آرزو، انصاف
کہ ایک وہمِ ضعیف و غمِ دو عالم ہے

تا چند نازِ مسجد و بتخانہ کھینچیے　　　　جوں شمع دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر　　　　دامن کو آج اُسکے حریفانہ کھینچیے
ہے ذوقِ گریہ، عزمِ سفر کیجئے اسدؔ
رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

کاشانۂ ہستی کہ برانداختنی ہے　　　　یاں سوختنی چارہ گر ساختنی ہے
ہے شعلۂ شمشیرِ فنا حوصلہ افگار　　　　اے داغِ تمنا! سپر انداختنی ہے
ہے سادگیٔ ذہن تمنائے تماشہ
جائے کہ اسدؔ رنگِ چمن باختنی ہے

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے　　　　کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے
فسردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھ سے　　　　چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے
طراوتِ سحر ایجادیٔ اثر، یک سو　　　　بہارِ نالہ و رنگینیٔ فغاں تجھ سے
نیاز، پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے　　　　جبینِ سجدہ فشاں تجھسے آستاں تجھ سے
بہانہ جوئیٔ رحمت کمینگرِ تقریب　　　　وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے

اسدؔ! بہ موسمِ گُل در طلسم کُنجِ قفس
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

رنجشِ یارِ مہرباں، عیش و طرب کا ہے نشاں
دِل سے اُٹھے ہے جو غبار، گردِ سوادِ باغ ہے
شعر کی فکر کو اسدؔ! چاہیئے ہے دل و دماغ!
عذر، کہ یہ فسردہ دل بے دل و بے دماغ ہے

خدایا دل کہاں تک دن بصد رنج و تعب کاٹے
خمِ گیسو ہو شمشیرِ سیہ تاب، اور شب کاٹے
کریں گر قدرِ اشکِ دیدۂ عاشق، خود آرایاں
صدف دندانِ گوہر سے، بہ حسرت اپنے لب کاٹے
دریغا وہ مریضِ غم، کہ فرطِ ناتوانی سے
بہ تقدیرِ یک نفس جادہ، بہ صد رنج و تعب کاٹے
یقیں ہے آدمی کو دستگاہِ فقر حاصل ہو
دمِ تیغِ توکل سے اگر پائے سبب کاٹے
اسدؔ، مجھ میں ہے اُسکے بوسۂ پا کی کہاں جرأت
کہ میں نے دست و پا باہم بہ شمشیرِ ادب کاٹے

جُرأت

پھر وُہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

بہ یادِ قامت اگر ہو بلند آتشِ غم — ہر ایک داغِ جگر آفتابِ محشر ہو
ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا — اب اس سے ربط کروں جو بہت ستمگر ہو
جام ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے — کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے
ہزار قافلۂ آرزو بیاباں مرگ — ہنوز محملِ حسرت بہ دوشِ خود رائی

جس طرف سے آئے ہیں آخر اُدھر ہی جائینگے
مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم پیمودہ ہے

رباعی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے [illegible] جاہل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

بادۂ نیم رس

غزلیات

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ　　صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے　　سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے　　مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا　　تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا
بہ فیضِ بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے　　کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ، غمخوارِ جانِ دردمند آیا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا، مگر، بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دُود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر
کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے، ہمنے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تمنے کیا مزا پایا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہمنے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

خاکبازیِ اُمید، کارخانۂ طفلی
یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہمنے اپنا دل — خوں کیا ہوا دیکھا، گُم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اسقدر یعنی — ہمنے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا

دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم

آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرّۂ خاک — شوقِ دیدار بلا آئنہ ساماں نکلا

بوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل م — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

زخم نے داد نہ دی، تنگیِ دل کی، یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینہ میں، لیکن آخر — جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا

دل حسرت زدہ تھا، مائدۂ لذّتِ درد — کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

تھی نوآموزِ فنا، ہمّتِ دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا — ہے یہ وُہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا — یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہوا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی — گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقوی نہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پر بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

یار نے تشنگیِ شوق کے مضموں چاہے
ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا
بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

زکوٰۃ حسن دے، اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہے کاسہ گدائی کا

نہ مارا جان کر بیجرم، قاتل، تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ، حق آشنائی کا

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو، زنجیرِ رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدستِ و پائی کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے — چمن کا جلوہ، باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھدے

کہ حسرت سنج ہوں، عرضِ ستمہائے جدائی کا

شب، خمارِ شوقِ ساقی، رستخیز اندازہ تھا — تا محیطِ بادہ، صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قلم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا — جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے؟ — خانۂ مجنونِ صحرا گرد، بے دروازہ تھا

پوچھ مت، رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن — دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد

یادگارِ نالہ، اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا — رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز — چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر، مت پوچھ — اس قدر تنگ ہوا دل، کہ میں زنداں سمجھا

ہمنے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع — شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل، تا دمِ مرگ — دفعِ پیکانِ قضا، اس قدر آساں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خو ہوگا — نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام — رُخ پہ ہر قطرہ عرق، دیدۂ حیراں سمجھا

دل دیا جانکے کیوں اُسکو، وفادار اسدؔ

غلطی کی، کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

دل اسکو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا

حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اسکو یاد اسدؔ
جفا میں اُس کی ہے انداز کارفرما کا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

دیکھی وفائے فرصتِ رنج و نشاطِ دہر
خمیازہ یک درازیٔ عمرِ خمار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

۱ لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

سراپا یک آئینہ دارِ شکستن
ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا

ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

بصورت تکلف، بمعنی تاسف
اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا
اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

اے وائے غفلتِ نگہ شوق ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہِ طور تھا

درسِ تپش ہے برق کو اب اُسکے نام سے
وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اسکی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

ہر رنگ میں جلا اسدِؔ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلیِ شمعِ ظہور تھا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اسدؔ ساغر کشِ تسلیم ہو گردش سے گردوں کی

کہ ننگِ فہمِ مستاں ہے، گلہ بد روزگاری کا

غافل بوہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں — بے شانۂ صبا نہیں، طرہ گیاہ کا

بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ، کہ رنگ — صیدِ ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

جاں درہوائے یک نفسِ گرم ہے اسدؔ — پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے

پُر گل، خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا — بیکسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار — سبزہ بیگانہ صبا آوارہ گل نا آشنا

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے — گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف — عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز — ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ، دریا آشنا

میں، اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی، کہ ہے — عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر، نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس، اور آئینہ تیرا آشنا

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا — یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی — کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے — تریاکیِ قدیم ہوں، دودِ چراغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار — یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا
باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل — ابرِ بہار، خمکدہ، کس کے دماغ کا
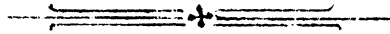
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل — کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھکو — آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ ازبسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے — جوہرِ آئینہ بھی، چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ — عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے شباب — تو ہو، اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا　　لذّتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُسنے جفا سے توبہ　　ہائے اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہوجائیگا　　بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہوجائیگا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب　　پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہوجائیگا

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر　　ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہوجائیگا

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط　　شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہوجائیگا

فائدہ کیا؟ سوچ آخر تو بھی ہے دانا اسدؔ　　دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہوجائیگا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا　　یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہوجائیگا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا　　مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہوجائیگا

باغ میں مجھ کو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر　　ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہوجائیگا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہوجائیگا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

عذرِ واماندگی، اے حسرتِ دل　　نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا، یعنی　　پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں　　دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ　　سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی　　کیوں ترا راہ گذر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر، یاد آیا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا　　اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے　　خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق، باندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم　　میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل، آزردگیِ یار سے خوش ہوں　　یعنی، سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی، تنک آبی سے ہوا خشک　　میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ، جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا — رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا
حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو — دل بدل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا
کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں — جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کسقدر یارب، ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج — قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ — تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل — سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

دُور اوفتادۂ چمنِ فکر ہے اسدؔ
مرغِ خیال بلبلِ بے بال و پر ہے آج

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ — اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ — برنگِ خار، مرے آئینے سے جوہر کھینچ
نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں — اگر یہی عرقِ فتنہ ہے، مکرّر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار، اے دل — کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
بہ نیمِ غمزہ ادا کر، حقِ ودیعتِ ناز — نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ
مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں — بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ
تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس — بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

خمارِ منتِ ساقی، اگر یہی ہے اسدؔ
دلِ گداختہ کے میکدہ میں ساغر کھینچ

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سُن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مئے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا مَیں نے
کہ گِر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

وہ آرہا ـــ ہمسایہ میں تو سایہ سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

نہ پوچھ بیخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھکر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانہ سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا — کہ پشتِ چشم سے جسکے نہ ہووے مہر عنواں پر
مجھے اب دیکھکر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا — کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا — قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُسنے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

برنگِ کاغذِ آتش زدہ، نیرنگِ بیتابی — ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر
میں اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے — شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر
اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے — کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی — گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
فلک سے ہمکو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے — متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز — دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز
نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود — ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز
وصالِ جلوہ تماشا ہے پھر دماغ کہاں — کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز

ہجومِ فکر سے دل، مثلِ موج لرزے ہے ث کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز
ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست گئی نہ خاک ہوئے پر، ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالب
جہاں، یہ کاسۂ گردوں ہے، ایک خاک انداز

نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو، اور آرائشِ خمِ کاکل
میں، اور اندیشہائے دُور و دراز

لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور رازہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے
ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا جلوہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

تو ہوا جلوہ گر، مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا
م
اے دریغا، وہ رندِ شاہد باز

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام — بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع
غم اُس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ — ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع
ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے — بجلوہ ریزیٔ باد و بہ پرفشانیٔ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ — شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیٔ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

نامہ بھی لکھتے ہیں تو بخطِ غبار حیف — رکھتے ہیں مجھ سے اتنی کدورت ہزار حیف
بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش — مجبوریاں تلک ہوئے، اے اختیار حیف
بیش از نفس بتاں کے کرم نے وفا نہ کی — تھا محملِ نگاہ بہ دوشِ شرار حیف
تھی میرے ہی جلانے کو اے آہ شعلہ ریز — گھر پر پڑا نہ غیر کے کوئی شرار حیف

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک — کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل — ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک
شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا؟ کہ آج — گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک
مجھکو ارزانی رہے، تجھکو مبارک ہوجیو — نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے — دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد — زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ فرطِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم — میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں، فرصتِ ہستی غافل — گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے — چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمعِ ماتم خانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں — ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال — ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو — ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں مَیں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پُرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا، کہ بِن کہے
اُس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیئے، ساتھ رقیب کو لئے
آئے وُہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

بزم میں اُس کے رُوبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اُس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مُدعا کہ یوں

مَیں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ "یوں"

غیر سے رات کیا بنی، یہ جو کہا، تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے، جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی، چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی، حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہے خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی!
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایکدن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھکر عذرِ مستی ایکدن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایکدن

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہی پستی ایکدن

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایکدن

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیشدستی ایکدن

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دلِ آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

رنجِ نومیدیِ جاوید، گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے	کوئی تقصیر بجز خجالتِ تقصیر نہیں

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں	ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر!	برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم	اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے	ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل	مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ	لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں	آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو	کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو
بقدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی	بھروں یک گوشۂ دامن اگر آبِ ہفت دریا ہو

اگر وہ سرو قد، گرمِ خرامِ ناز آجاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

جز دل سراغِ دردِ بدل خفتگاں نہ پوچھ!	آئینہ عرض کر خط و خالِ بیاں نہ پوچھ

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا — سامانِ بادشاہیِ وصلِ بتاں نہ پوچھ

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے — عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ — م — جس کی بہار یہ ہو، پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے — م — دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل

دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے — طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

ہستی فریب نامۂ موجِ سراب ہے — یک عمر نازِ شوخیِ عنواں اُٹھائیے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق — یعنی ہنوز منّتِ طفلاں اُٹھائیے

ضبطِ جنوں سے ہر سرِ مو ہے ترانہ خیز — یک نالہ بیٹھیے تو نیستاں اُٹھائیے

دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا نہ کیجیے — یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اُٹھائیے

انگور سعیِ بے سر و پائی سے سبز ہے

غالبؔ بدوشِ دل خُمِ مستاں اُٹھائیے

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے — تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا — یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد — زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانیکی

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانیکی

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو، دیکھنا شوخی بہانیکی

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا، ظالم مگر تمہید جانے کی

کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اُسنے جس سے ہم نے کی تھی بارہانیکی

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے!
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے

کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دُوں وہ بھی

نہ اتنا برّشِ تیغِ جفا پہ ناز فرماؤ

مرے دریائے بیتابی میں ہے اِک موجِ خُوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے

مرے دامِ تمنا میں ہے اِک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم

کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

نظر راحت پہ میری کر نہ وعدہ شب کے آنے کا

کہ میری خواب بندی کے لئے ہوگا فسوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں

خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

کیا خوب، تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
ابتک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

پی جسقدر ملے شبِ ماہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہرچند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل، فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت، کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

ہے ہے خدانخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل، یہ تجھے کیا خیال ہے

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

نظر بہ نقصِ گدایاں کمال بے ادبی ہے — کہ خارِ خشک کو بھی دعوئے چمن نسبی ہے

ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ — لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

خوشا وہ دل کہ سراپا طلسمِ بیخبری ہو — جنون و یاس و الم رزقِ مدعا طلبی ہے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو — حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

اسدؔ یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے — اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے — بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا — جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں — مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

گذرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے — قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا — نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے — صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں — آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ — شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
تا چند پستِ فطرتیِ طبعِ آرزو — یارب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے
یکبار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے — اے جوشِ عشق بادۂ مرد آزما مجھے
ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی — م — جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
م — تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی
پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

نکوہش ہے، سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی — مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی
رگِ لیلیٰ کو، خاکِ دشتِ مجنوں، ریشگی بخشے — اگر بو دے بجائے دانہ، دہقاں نوکِ نشتر کی
پرِ پروانہ، شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا — ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

غرور لطفِ ساقی نشۂ بیباکیٔ مستاں   نمِ دامانِ عصیاں ہے طراوت موجِ کوثر کی

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت   م   کہ طاقت اڑگئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اُسکے خیمے کے پیچھے قیامت ہے   م   مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

اسدؔ جز آب بخشیدن ز دریا خضر کو کیا تھا

ڈبوتا چشمۂ حیواں میں گر کشتی سکندر کی

آ، کہ مری جان کو قرار نہیں ہے   طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے   نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھکو   ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہم سے عبث ہے، گمانِ رنجشِ خاطر   خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے

دل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی   غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے   وائے اگر عہد اُستوار نہیں ہے

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالبؔ

تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھکو حاصل ہے

کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

بہ سیلِ اشکِ لختِ دل ہے دامنگیر مژگاں کا

غریقِ بحر جویائے خس و خاشاکِ ساحل ہے

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی
۴ سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ دل کا صدائے خندۂ دل ہے

غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے

پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
نقشِ نازِ بتِ طنّاز، بہ آغوشِ رقیب

وہ تپِ عشقِ تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ، تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد

ہے نگاہِ آشنا، تیرا سرِ ہر مو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت

ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تُو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ

کثرتِ جور و ستم سے ہو گیا ہوں بیدماغ
خوبرویوں نے بنایا غالبؔ بدخو مجھے

امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی

شوق، گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی
خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے

ایک دن گر نہ ہُوا بزم میں ساقی نہ سہی
مے پرستاں خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے

گر نہیں، شمعِ سیہ خانۂ لیلی نہ سہی
نقشِ قیس، کہ ہے چشم و چراغِ صحرا

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر یاں نالے کو اور اُلٹا دعوائے رسائی ہے

از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

وہ دیکھ کے حسن اپنا مغرور ہوا غالبؔ
صد جلوۂ آئینہ یک صبحِ جدائی ہے

سیماب پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بیقرار کے

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسدؔ
لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بہ دنداں ہے

تکلف بر طرف ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ یار تیغِ تیزِ عریاں ہے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے
غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

عاشق نقابِ جلوۂ جانانہ چاہیے
فانوسِ شمع کو پرِ پروانہ چاہیے

ہے وصل ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

پیدا کریں دماغِ تماشائے سرو و گل
حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے

دیوانگاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق
اے بے تمیز گنج کو ویرانہ چاہیے

اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جراتِ رندانہ چاہیے

ساقی! بہارِ موسمِ گل ہے سرور بخش
پیماں سے ہم گذر گئے، پیمانہ چاہیے

جادہ ہے طرزِ گفتگوئے یار، اے اسدؔ
یاں جز فسوں نہیں، اگر افسانہ چاہیے

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے
صبح کی مانند زخمِ دل گریبانی کرے

میکدہ گر چشمِ مستِ یار سے پائے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت کا عہد
یک قلم منظور رہے جو کچھ پریشانی کرے

جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے اگر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

ہر قدم دورئ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کسقدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں!
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو
پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے
جوں گلِ شمع ہو نظارہ پریشاں مجھ سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

اے اسدؔ! دسترسِ وصلِ تمنا معلوم
کاش ہو قدرتِ برچیدنِ داماں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے — م — مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری، عیادت کو تم آئے ہو — فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ، نور العینِ دامن ہے — دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی — شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بو بالش سے اسکی زلفِ مشکیں کی — ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
م
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ [1] — خطِ پیالہ، سراسر نگاہِ گلچیں ہے

بجا ہے گر نہ سنے، نالہ ہائے بلبلِ زار [1] — کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے — م — کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

اسد ہے نزع میں چل بے وفا برائے خدا
م
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے — سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در رہنِ سخن — تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے — رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

[1] یہ دو اشعار جو دیوانِ غالب کے عام نسخوں میں ملتے ہیں، نسخۂ حمیدیہ کے صفحہ ۲۲۳ اور صفحہ ۲۲۴ پر بطورِ غیر مطبوعہ اشعار کے شایع ہوئے ہیں۔ باقی دو اشعار نسخۂ حمیدیہ میں موجود نہیں اور غالباً بھوپالی نسخہ کی ترتیب کے بعد لکھے گئے۔

شومیِ طالع سے ہوں ذوقِ معاصی میں اسیر نامۂ اعمال ہے تاریکیِ کوکب مجھے!
طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے
دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

زبسکہ مشقِ تماشا، جنوں علامت ہے کشاد و بستِ مژہ، سیلیِ ندامت ہے
بہ پیچ و تابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے
وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے
نہ جانوں، کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے
اسدؔ! بہارِ تماشائے گلستانِ حیات
وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

شوخیِ مضرابِ جولاں، آبیارِ نغمہ ہے برگریزِ ناخنِ مطرب بہارِ نغمہ ہے
سازِ عیش بیدلی ہے خانہ ویرانی مجھے سیلِ یاں کوکِ صدائے آبشارِ نغمہ ہے
نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

خود فروشیہائے ہستی بسکہ جائے خندہ ہے تا شکستِ قیمتِ دلہا صدائے خندہ ہے
عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجام گل — یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام — ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

نقشِ عبرت در نظر ہا نقدِ عشرت در بساط — دو جہاں وسعت بہ قدرِ یک فضائے خندہ ہے

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

م

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر — فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر — کب تک خیالِ طرۂ لیلا کرے کوئی

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات — ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے — آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

تمثالِ جلوہ عرض کرائے حسن، کب تلک — آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی — کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل — تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز — یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز — تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

عرضِ سرشک پہ ہے فضائے زمانہ تنگ — صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست م نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ

پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

باغ تجھ بن گلِ نرگس سے ڈراتا ہے مجھے چاہوں گر سیرِ چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

میں ہوں اور حیرتِ جاوید مگر ذوقِ خیال بہ فسونِ نگہ ناز ستاتا ہے مجھے

جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے م سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے

م

دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

یاد رکھئے نازہائے التفاتِ اولیں ! آشیانِ طائرِ رنگِ رسا ہو جائیے

بیضہ آسا، ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

لطفِ عشق ہر یک اندازِ دگر دکھلائیگا بے تکلف یک نگاہِ آشنا ہو جائیے

داد از دستِ جفائے صدمۂ ضرب المثل

گر ہمہ افتادگی، جوں نقشِ پا ہو جائیے

کارگاہِ ہستی میں، لالہ داغ ساماں ہے — برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

غنچہ تا شگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم — باوجودِ دلجمعی، خوابِ گل پریشاں ہے

م

ہم سے رنجِ بیتابی، کس طرح اٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بہ دنداں ہے

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے — نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا — شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

خیمۂ لیلیٰ سیاہ و خانۂ مجنوں خراب — جوشِ ویرانی ہے عشقِ داغ بیروں دادہ سے

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم اسدؔ
دیکھتے ہیں چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ سے

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے — نافہ، دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غبارِ شوق — گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو، اے خدا — آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب — اے عندلیب، وقتِ وداعِ بہار ہے

دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی — اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر — ہر ذرے کے نقاب میں دل بیقرار ہے

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں — طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ — م — نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے م وُہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

غلفت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے نگاہ دل سے تری سُرمہ سا نکلتی ہے

برنگِ شیشہ ہوں یک گوشۂ دل خالی کبھی پری مری خلوت میں آنکلتی ہے

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم صبا جو غنچہ کے پردے میں جانکلتی ہے

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ

کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ہے انتظار سے شرر آبادِ رستخیز مژگانِ کوہکن، رگِ خارا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے

کس فرصتِ وصال پہ ہے گل کو عندلیب زخمِ فراق، خندۂ بیجا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو یہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے وُہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے !
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے — داغِ دلِ بیدرد نظرگاہِ حیا ہے
دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار — آئینہ بدستِ بُتِ بدمستِ حنا ہے
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق — آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے
قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ — اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے
مجبوریِ دعوائے گرفتاریِ الفت — دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی — سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گذشتہ — تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے
بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب — کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی — جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے
خُو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو — معشوقی و بے حوصلگی طُرفہ بلا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد !
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
مستی[1] بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے — موجِ شراب، یک مژۂ خوابناک ہے

۱؎ یہ شعر جو مروجہ دیوان میں ملتا ہے۔ نسخہ حمیدیہ کے صہ ۲۳۲ پر غیر مطبوعہ غزلوں کی تحت میں شایع ہوا ہے۔

جز[1] زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوشِ[1] جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک ہے

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
بفرازِ گاہِ عبرت چہ بہار و کو تماشا کہ نگاہ ہے سیہ پوش بعزائے زندگانی
بہ فراقِ رفتہ یاراں خط و حرف مو پریشاں دلِ غافل از حقیقت ہمہ ذوقِ قصہ خوانی
نہ وفا کو آبرو ہے نہ جفا تمیز جو ہے چہ حسابِ جانفشانی چہ غرورِ دلستانی
شر و شورِ آرزو سے تب و تابِ عجز بہتر نہ کرے اگر ہوس پر غمِ بیدلی گرانی
مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی
مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی مطلع کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
دلِ نا امید کیونکر بہ تسلی آشنا ہو جو امیدوار رہیئے نہ برگِ ناگہانی
مجھے بادۂ طرب ہے بہ خمار گاہِ قسمت جو ملی تو تلخ کامی جو ہوئی تو سرگرانی
نہ ستم کرا ب تو مجھ پر کہ وہ دن گئے کہ ہاں تھی مجھے طاقت آزمائی، تجھے الفت آزمائی
یونہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالبؔ
کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

---

[1] یہ دو نو اشعار جو مروجہ دیوان میں ملتے ہیں۔ نسخہ حمیدیہ کے صفحہ ۲۳۴ پر غیر مطبوعہ غزلوں کی تحت میں شایع ہوئے ہیں

میرے بعد

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنی
انکے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

درخور عرض نہیں جوہر بیداد کو جا
نگہ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

ہے جنوں اہل جنوں کے لئے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

تھی نگہ میری نہانخانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

نوحہ

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھکو آیا تھا خیال؟ — دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا — عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا — خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی — یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا — دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئے — اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال — ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال — ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسدؔ
میری دہلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی الفت کا رنگ — م — رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

قطعہ

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا — م — شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام — گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال — یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو — م — یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جُو — م — واں، وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی — م — جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا — م — یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ — ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا — م — دل، کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیری دل بیتاب تھا — شوخیٔ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا — تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے کیا نشاط آہنگ ہے — م — خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں — م — پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں — م — ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟ — م — کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا — م — انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
م
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

قصیدہ در منقبت

سازِ یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

مستیِ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

سبزہ ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت، روئے شرار

حسرتِ جلوۂ ساقی ہے کہ ہر پارۂ ابر
سینہ بیتابی سے ملتا ہے بہ تیغِ کہسار

مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار

کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤسِ شکار

کاٹ کر پھینکیے ناخن، تو بہ اندازِ ہلال
قوتِ نامیہ اسکو بھی نہ چھوڑے بیکار

میکدے میں ہو اگر آرزوئے گلچینی
بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار

موجِ گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام — رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ — وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

ذرہ اُس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز — گرد اُس دشت کی امید کو احرامِ بہار

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عُرفا — چشمِ نقشِ قدم، آئینۂ بختِ بیدار

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز — عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار — دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبلِ گلزار

تیری اولاد کے غم میں ہے بروئے گردوں — سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبیؐ — جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مُہرِ نماز — ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

تہمتِ بیخودیٔ کفر نہ کھینچے، یارب! — کمیِ ربطِ نیاز و حظِ نازِ بسیار

ہے اسیرِ ستمِ کشمکشِ دامِ وفا — دلِ وارستۂ ہفتاد و دو ملت بیزار

جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر — یک طرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ — خاکِ در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار

دشمنِ آلِ نبی کو بطرب خانۂ دہر — عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو، طاقِ دیوار

دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

قصیدہ فی المنقبت

توڑے ہے عجز تنک حوصلہ بر روئے زمیں
سجدۂ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں"

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
م
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

توڑے ہے نالہ سرِ رشتۂ پاسِ انفاس
سر کرے ہے دلِ حیرت زدہ شغلِ تسکیں

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

یاس، تمثالِ بہار آئینۂ استغنا
وہم، آئینۂ پیدائیِ تمثالِ یقیں

مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حُسنِ یقیں

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بیستوں، آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

موجِ خمیازۂ یک نشّہ، چہ اسلام و چہ کفر
کجیِ یک خطِ مسطر، چہ توہّم چہ یقیں

قبلہ و ابروئے بت یک رہ خوابیدۂ شوق
کعبہ و بتکدہ، یک محملِ خوابِ سنگیں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن
نہ سر و برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں

نہ تمنا، نہ تماشا، نہ تحیّر، نہ نگاہ
گرد جوہر میں ہے آئینۂ دل پردہ نشیں

شورِ اوہام سے مست ہو شبِ جوشِ انصاف
گفتگو بے مزہ و زخمِ تمنا نمکیں

نقش لاحول لکھ، اے خامۂ ہذیاں تحریر
"یا علیؑ" عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی، کعبۂ ایجادِ یقیں

نسبت نام سے اسکی ہے یہ رتبہ، کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدہ نازِ زمیں

جلوہ پرداز ہوں نقشِ قدم اُس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

برشِ تیغ کا اسکی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چیں

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیِ ختمِ رسل تو ہے بفتوائے یقیں

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

تیری مدحت کیلئے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

آستاں پر ترے ہے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لئے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد | کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب | ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں
دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حُسنِ قبول | کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں
غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز | کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیِ شوق | کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا | نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
صرف اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ | وقفِ احباب، گُل و سنبلِ فردوس بریں

اسد ہم وُہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا | حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بد دماغی ہے | کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا — خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا — غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

سرمۂ مفتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے — کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم — م — تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

ستمکشِ مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں — تکلف برطرف مل جائیگا تجھ سا رقیب آخر

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر — تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی — م — ہوا، جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک — گذرے ہے آبلہ پا ابرِ گوہر بار ہنوز
یکقلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت — نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے — لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش
فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق — نہ نکلے شمع کے پا سے، نکالے گر نہ خار آتش

جادۂ رہ، خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے
وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم

بہ نالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

اسدؔ فریفتۂ انتخابِ طرزِ جفا
وگرنہ دلبریِ وعدۂ وفا معلوم

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
وا ماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
م
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

برشکالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے
کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

الفتِ گل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

معافِ بیہدہ گوئی ہیں ناصحانِ عزیز — دلے بہ دستِ نگارے نہ دادہ رکھتے ہیں
زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد — وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا — م — بارے اپنے دردِ دل کی ہم نے پائی داد یاں

ہے مری وحشت عدمئے اعتبارات جہاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ — طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی — دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے — م — میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں — م
ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

تغافل دوست ہوں، میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے، تُو دشمن نہ ہو جائے
سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالب
اگر گل، سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن
چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

غم و عشرت قدمبوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے
دعائے مدعا گم کردگانِ عشق "آمیں" ہے
لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

رُباعیات

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال
ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمرِ گزشتہ، یک قدم استقبال

شب، زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک، دیدۂ پُر نم تھا

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی
بیتابیٔ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن، اے تجلّی افسوس
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

ہے خلق، حسد قماش، لڑنے کے لئے
وحشت کدۂ تلاش، لڑنے کیلئے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

اے کثرتِ فہمِ بے شمار اندیشہ
ہے اصلِ خرد سے شرمسار اندیشہ
یک قطرۂ خون و دعوتِ صد نشتر
یک وہم و عبادتِ ہزار اندیشہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

یا علی دانی کہ رویم سوئے تست از رہ نورد ۔ ہر چہ آغازم مخاطب انمت در خطاب
موئے آتش دیدہ را مانم کہ بہرِ خویشتن ۔ حلقۂ دام فنا گردیدہ ام از پیچ و تاب
غافل از رفتارِ عمر و فارغ از تکمیلِ عشق ۔ کردہ آغوشِ وداعِ دل نشیمنگاہِ خواب
نقدِ آگاہی بوہم فرصتے درباختہ ۔ دستِ خالی بر سر و دل پائمالِ اضطراب
خود تو میدانی کہ گم گردیدۂ دشتِ امید ۔ تشنہ تر میگردد از بے آبیٔ موجِ سراب
دل ز کار افتاد و پا وا ماند و دست از شکست ۔ قطع منزل کے تواں کردن بایں حالِ خراب
مدعا را بر زباں آوردن از بیگانگی است ۔ جز نگاہت شاہدِ ما را کفن باد انقاب
ذوقِ مطلب از تو و من از تو و مطلب ز تو ۔ خود تو می بخشی و می فہمی زبانِ اضطراب
شعلۂ شوقے ہوس دارم ز سودائے جنوں ۔ کاتشِ افسردہ را بخشد بہارِ التہاب
دین و دنیا را بلا گردانِ نازت کردہ ام ۔ جلوۂ رنگیں ترا از صد گلشنِ خلد انتخاب

حرمتِ جانِ محمد یک نظر کن سوئے من
یا علیؓ یا مرتضیٰؓ یا بوالحسنؓ یا بوترابؓ

خمخانۂ شباب
سنہ ۱۸۲۱ء تا سنہ ۱۸۳۲ء (؟)

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غزلیات

دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا   عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا!

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا   اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیف نسخہائے وفا کر رہا تھا میں   مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب   اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی؟   دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے   زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ق گ ب
۱۸۲۲

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا !

کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو

لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے

مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے

کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر

مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ، لاکھوں آرزوئیں ہیں

چراغِ مردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے

دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں، کہیں ورنہ

سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے، سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے، سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ، کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا
ق گ ب ۱۸۳۲

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا؟

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائینگے کیا؟

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دے کہ سمجھائینگے کیا؟

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا؟

گر کیا ناصح نے ہمکو قید، اچھا یوں سہی! — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا؟

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟ — ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا؟

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ

ق گ ب

ہمنے یہ مانا کہ دہلی میں رہیں، کھائینگے کیا؟ ۱۰۳۲

ہوس کو ہے نشاطِ کار، کیا کیا — نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟ — کہاں تک اے سراپا ناز "کیا کیا"

نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں — شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں — تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

فروغِ شعلۂ خس، یک نفس ہے — ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا، کیا

نفس، موجِ محیطِ بیخودی ہے — تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے — غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

دلِ ہر قطرہ ہے، سازِ انا البحر — ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہے؟ میں ضامن ادھر دیکھ — شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

سُن اے غارتگرِ جنسِ وفا، سُن — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟ — شکیبِ خاطرِ عاشق، بھلا کیا

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟ — یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

بلائے جاں ہے غالبؔ اسکی ہر بات

عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا　ق　آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں　　آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا　　میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں　　کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھکو دکھاتا، ورنہ داغوں کی بہار　　اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھکر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا　ق　جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے　ق　یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے　　ہوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں　　شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن　　غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار　　لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں　　حاصل، سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا　ق گ ب　۱۸۳۲

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھِسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اسقدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ضعف سے گریہ، مبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مِٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا، گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچہ کی ہوس؟
کیوں ہے؟ گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ق گ ب ۱۸۳۲

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہ سیہ مستئِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گذرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم، کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اُٹھتی ہے، طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

جسقدر روحِ نباتی ہے، جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال | ہے تصور میں زبس، جلوہ نما موجِ شراب
نشہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ | بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیتِ فصل | موجۂ سبزۂ نوخیز سے، تا، موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے، زہے موسمِ گل | ہے تصور میں زبس، جلوہ نما موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

جاتا ہوں جدھر سب کی اٹھی ہے ادھر انگشت | ق | یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے مگر انگشت
گرمی ہے زباں کی سببِ سوختنِ جاں! | ق | ہے شمع شہادت کے لئے، سر بسر انگشت
شوخی تری کہدیتی ہے احوال ہمارا | | رازِ دلِ صد پارہ کی ہے پردہ در انگشت
کس رتبہ میں باریکی و نرمی ہے کہ جوں گل | | آتی نہیں پنجہ میں بس اُسکے نظر انگشت
افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے | | جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
کافی ہے نشانی تری، چھلے کا نہ دینا | | خالی مجھے دکھلاکے بوقتِ سفر انگشت

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت ق ۱۸۳۲

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست | ق | دُودِ شمعِ کشتہ تھا، شاید خطِ رخسارِ دوست
برقِ خرمنِ زار گوہر ہے نگاہِ تیزیاں | ق | اشک ہو جاتے ہیں خشک از گرمیٔ رفتارِ دوست
ہے سوا نیزے پہ اسکے قامتِ نوخیز سے | ق | آفتابِ صبحِ محشر ہے گلِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

خانہ ویراں سازئ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن، کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہے پرسش مجھ سے اسکے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک
مجھکو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سرکرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھکو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخئ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے،
یا بیاں کیجیے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ ز بس تکرارِ دوست

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

جگر کو مرے، عشقِ خوں نابہ مشرب
لکھے ہے "خداوندِ نعمت سلامت"

دو عالم کی ہستی پہ خطِ وفا کھینچ
دل و دستِ اربابِ ہمت سلامت

علی الرغمِ دشمن، شہیدِ وفا ہوں
مبارک مبارک سلامت سلامت

نہیں گر بہ کامِ دلِ خستہ گردوں
جگر چاہیے جوشِ حسرت سلامت

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

نہ اوروں کی سُنتا نہ کہتا ہوں اپنی | سرِ خستہ وشوارِ وحشت سلامت
وفورِ بلا ہے، ہجومِ وفا ہے | سلامت ملامت، ملامت سلامت
نہ فکرِ سلامت، نہ بیمِ ملامت | زخود رفتگی ہائے حیرت سلامت

رہے غالبؔ خستہ مغلوبِ گردوں
یہ کیا بے نیازی ہے حضرت سلامت ۱۸۳۲ ق ح

کیوں جلگیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر | جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر
آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے | سرگرمِ نالہائے شرربار دیکھکر
کیا آبروئے عشق؛ جہاں عام ہو جفا | رُکتا ہوں، تم کو بے سبب آزار دیکھکر
آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے | مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھکر
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق | لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھکر
واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ | ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھکر
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ | لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھکر
زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال | رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں | جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھکر
کیا بدگماں ہے مجھسے کہ آئینہ میں مرے | طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر | دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھکر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھکر

ہوں گلفروشِ شوخیٔ داغِ کہن ہنوز ق ہے نازِ مفلساں زرِ ازدست رفتہ پر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر

میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیداد فن ہنوز

تو بھیجئے میخانے کی دیوار کے پاس کب فقیروں کو رسائی بتِ میخوار کے پاس
دام خالی، قفسِ مرغ گرفتار کے پاس مژدہ! اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
جوئے خوں ہمنے بہائی، بُنِ ہر خار کے پاس جگرِ تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا
خوب وقت آئے تم، اِس عاشقِ بیمار کے پاس مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہَے ہَے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس یاں بھی رُک رُک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے
نہ کھڑے ہو جئے خوبانِ دل آزار کے پاس دہنِ شیر میں جا بیٹھئے، لیکن اے دل
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس دیکھکر تجھکو چمن، بسکہ نمو کرتا ہے

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے!
ق ح
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس ۱۸۳۲

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل ہے کسقدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل!
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل آزادیٔ نسیم مبارک، کہ ہر طرف
اے وائے، نالۂ لبِ خونیں نوائے گل جو تھا، سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا، کہ جو

ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لئے بہار — میرا رقیب ہے، نفَسِ عطر سائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے — مینائے بے شراب و دل بے ہوائے گل
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی — خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل
تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک — بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گل

غالبؔ مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گل!

ق ۱۸۳۲ ح

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا — دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمارخانۂ عشق — واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

ق ۱۸۳۲ ح

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل — ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں
عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا — گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

مَیں اور صد ہزار نوائے جگر خراش تُو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہَے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
ق کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

ودیعت خانۂ بیداد کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھدیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش، مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی !
ہوا ہے خندۂ احباب، بخیہ جیب و دامن میں

ہوئے اُس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پَر افشاں جوہر آئینہ میں مثلِ ذرّہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا، ہر قطرہ خوں تن میں

اسدؔ زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
ق
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

آبرو کیا خاک اُس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں، کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں، تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ، نورِ صبح سے کم، جس کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے، عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے

جلوۂ گُل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے، نئے ناسور کا!

خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت، قلزم آشامی مری

موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمو!

قد کے جھکنے کے بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ، کہ ہو غربت میں قدر

بے تکلّف ہوں، وہ مشتِ خس، کہ گلخن میں نہیں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت　　میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے　　بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھکو ستمگر! ورنہ!

کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ق　گ ب　۱۸۳۲

عشق تاثیر سے نومید نہیں　　جاں سپاری شجرِ بید نہیں

سلطنت دست بدست آئی ہے　　جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

ہے تجلّی تری سامانِ وجود　　ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے　　ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے | غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ

ہمکو جینے کی بھی اُمید نہیں ق گ ب ۱۸۳۲

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں | غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق | مژدۂ قتل مقدّر ہے جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم | لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن | ہم کو تقلیدِ تُنک ظرفیِ منصور نہیں
حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی | عشقِ پُرعربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں "کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں" | کس رعونت سے وہ کہتے ہیں "کہ ہم حور نہیں"
ظلم کر ظلم، اگر لطف دریغ آتا ہو! | تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ | وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائیِ غالبؔ!

میرے دعوے پہ یہ حجّت ہے کہ مشہور نہیں ق گ ب ۱۸۳۲

نالہ جز حُسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں | ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں
عشق، و مزدوریِ عشرتگہِ خسرو، کیا خوب | ہم کو تسلیم نکونامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم | دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب | لطمۂ موج، کم از سیلیِ اُستاد نہیں

وائے محرومیِ تسلیم، و بدا حالِ وفا جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں
سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
نفی سے کرتی ہے، اثبات تراوش گویا دی ہے جائے دہن، اُسکو دمِ ایجاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

ق گ ب
۱۸۳۷

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زُبانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں، اُسکے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گوہر کو دیکھتے ہیں

دیوانگی سے دوش پہ زُنار بھی نہیں یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں
دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
ملنا اگر ترا نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت، بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا، کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہائے زار سے میرے، خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت وجلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں ۱۸۳۲ ق گ ب

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی، بہانۂ بیگانگی نہیں!
اپنے سے کر، نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی؟
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

ق گ ب ۱۸۳۲

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانوٗ
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانوٗ

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پانوٗ
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانوٗ

بھاگے تھے ہم بہت، سو اُسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانوٗ

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور
تن سے سوا فگار ہیں، اس خستہ تن کے پانوٗ

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانوٗ

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانوٗ

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دُکھتے ہیں آج اس بُتِ نازک بدن کے پانوٗ

غالبؔ مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو؟
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانوٗ

واں پہنچکر جو غش آتا پئے ہم ہے ہمکو
صد رہ، آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہمکو

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کسقدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہمکو

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہمکو

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز، تو سم ہے ہمکو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہمکو

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرّر چاہا
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہمکو"

دل کے خوں کرنیکی کیا وجہ، ولیکن ناچار — پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہمکو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہمکو

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہمکو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہمکو

لئے جاتی ہے کہیں، ایک توقع غالبؔ

جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہمکو — ق۔گ۔ب ۱۸۲۷

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا — ق — ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

اے سرِ شوریدہ، نازِ عشق و پاسِ آبرو — ق — یک طرف سودا و یکسو منتِ دستار ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں — ہم نہیں جلتے، نفس ہر چند آتشبار ہے

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ — جسکے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی — زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا

تجھ پہ کھل جاوے کہ اسکو حسرتِ دیدار ہے

بہ سختی ہائے قیدِ زندگی معلوم آزادی — ق — شررِ دربندِ دامِ رشتۂ رگہائے خارا ہے

اسدؔ یاسِ تمنا سے نہ رکھ امیدِ آزادی — ق — گدازِ آرزوہا، آبیارِ آرزوہا ہے

مری ہستی، فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے — جسے کہتے ہیں نالہ، وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کسکو؟ کوئی موسم ہو — وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائے شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

ق
ہو سکے کیا خاک دستِ و بازوئے فرہاد سے
بیستوں، خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے

ق
اِن ستم کیشوں کے کھائے ہیں زبس تیرِ نگاہ
پردۂ بادام یک غربالِ حسرت بیز ہے

ہے بہارِ تیز رو گلگونِ نکہت پہ سوار
یک شکستِ رنگِ گل صد جنبشِ مہمیز ہے

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو
یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی
وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

ق
عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پہ
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیئے

سیکھے ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

سر پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

یعنی برحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے ق گ.ب ۱۸۳۲

عشق مجھکو نہیں، وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟ اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں؟ نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف! آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی ق گ.ب ۱۸۳۲

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے

آبگینہ، تندئ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب! وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے!
گر حیا بھی اسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت، کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دُور چشمِ بد، تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں، گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اس کی بزم آرائیاں سنکر دلِ رنجور، یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر، بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھُلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

نقش کو اُسکے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

ق گ.ب ۱۸۳۲

گرمِ فریاد رکھا، شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بَردِ لیالی نے مجھے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

کثرت آرائیٔ وحدت ہے، پرستاریٔ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

ہوسِ گل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

سادگی پر اُس کی، مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا، کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے و لے، با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

بس ہجومِ نا امیدی! خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر، کہ کس مشکل میں ہے
ق گ۔ب ۱۸۳۲

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذّتِ فراغ — تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی
اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں — بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا — کل تم گئے، کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی!
ق گ۔ب ۱۸۳۲

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشمِ دلّالِ جنسِ رسوائی — دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی — وہی صد گونہ اشکباری ہے

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بیقراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے — روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اسی بیوفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز — گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشکباری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اُس کی روبکاری ہے

بیخودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
ق ۱۸۳۲ گ۔ب

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہوگئے اتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے — یاں تک مٹے، کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر — وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اللہ ری تیری تندیٔ خو جسکے بیم سے — اجزائے نالہ، دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق — جو پاؤں اُٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے — جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی

سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

ق گ۔ب ۱۸۳۲

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال — مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مَے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب — اے شوق، یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا — کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست — بزمِ خیال، مے کدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار، اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے، کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں — نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی، سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غالبؔ، صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے

ق گ۔ب ۱۸۳۲

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر، پاؤں سے ہے دو قدم آگے
قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت
فقط "خراب" لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے
خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو، اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے
دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے
قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اِس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مائگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

دے مجھکو شکایت کی اجازت، کہ ستمگر
کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اُس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب!
اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے؛ جب وُہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے

غارت گرِ ناموس نہو، گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے دلِ نالاں
جب اک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتشکدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے
ق گ۔ب ۱۸۳۲

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہ فشانی میری

کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے یار
مگر، آشفتہ بیانی میری

ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

متقابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرد بادِ رہِ بیتابی ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ
ننگِ پیری ہے جوانی میری
ق گ.ب ۱۸۳۲

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی	لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصوّر	دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے	یاں تو کوئی سُنتا نہیں فریاد کسو کی
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو	خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف، وہ ناکام، کہ اک عمر سے غالبؔ
حسرت میں ہے ایک بُتِ عربدہ جُو کی۔
ق گ.ب ۱۸۳۲

چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے	یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے
صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر	جائے مے اپنے کو کھینچا چاہئے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل	بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہئے
چاک مت کر جیب بے ایامِ گل	کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہئے
دوستی کا پردہ ہے، بیگانگی!	منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو	کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہئے
اپنی، رسوائی میں، کیا چلتی ہے سعی	یار ہی ہنگامہ آرا چاہئے
منحصر مرنے پہ ہو جسکی امید	ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے
غافل اِن مہ طلعتوں کے واسطے	چاہنے والا بھی اچھا چاہئے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
ق گ۔ب ۱۸۳۲

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھاکے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ، تو مُنہ سے کہیں جواب تو دے

پلادے اوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے "ذرا میرے پاؤں داب تو دے"
ق گ۔ب ۱۸۲۶

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے
گر باغ گدائے مَے نہیں ہے

ہرچند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہرچند کہیں "کہ ہے" نہیں ہے

شادی سے گزر، کہ غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو، تو دَے نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد　　مَے ہے یہ مگس کی قَے نہیں ہے

ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے؟ اے "نہیں ہے"

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے　　مرتے ہیں، ولے اُنکی تمنا نہیں کرتے
در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی　　ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے!
غالبؔ کو برا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے　　کر گئی وابستۂ تن میری عُریانی مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں　　مرحبا میں کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے
کیوں نہ ہو بے التفاتی، اسکی خاطر جمع ہے　　جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی　　لکھدیا من جملۂ اسباب ویرانی مجھے!
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے　　اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے
وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا　　لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے　　تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ! واہ!　　پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے ۔ سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

پیکرِ عشّاق سازِ طالعِ ناساز ہے ۔ نالہ گویا گردشِ سیّارہ کی آواز ہے

دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا

۔ یک بیابان جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے

جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی، مگر تاثیر الٹی ہے

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی!

عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے!

نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے

کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلف برطرف، نظارگی میں بھی سہی، لیکن

وہ دیکھا جائے 'کب' یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے، نبردِ عشق میں زخمی

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھسے

لاغر اتنا ہوں کہ گر، تو بزم میں جا دے مجھے

میرا ذمہ، دیکھکر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم

واں تلک، کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب

کھولکر پردہ، ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں

زلف گر بن جاؤں، تو شانے میں الجھا دے مجھے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے — دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی — تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم — بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟ — پردے میں گل کے، لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا — آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ — کی ایک ہی نگاہ، کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اُٹھائی کل اُسنے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جسکو دیکھ کے غمناک ہوگئے

ق گ.ب ۱۸۳۲

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کئے ہوئے

پھر گرمِ نالہائے شرربار ہے نفس
مُدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں، بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر، ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ، رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ، فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

دیوان غالب مملوکہ خان بہادر سید ابو محمد

(ص ۹۶)

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخون دل — ساز چمن طرازی داماں کئے ہوے

باہم دگر ہوے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب — نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوے

دل پھر طواف کوے ملامت کو جاے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرض متاع عقل و دل و جاں کئے ہوے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال — صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذر دلفریبی عنواں کئے ہوے

مانگے ہے پھر کسو کو لب بام پر ہوس — زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوے

چاہے ہے پھر کسو کو مقابل میں آرزو — سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوے

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسو کے پڑے رہیں — سر زیر بار منت درباں کئے ہوے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوے

تمام شد غزلیات

(یہ نسخہ دیوان غالب کا قدیم ترین مطبوعہ ایڈیشن ہے اس مین فقط ۱۰۹۲ اشعار ہین اور اس دیوان مین جسے شاعر نے سنہ ۱۸۵۵ مین مرتب کیا ۱۶۹۰ اشعار تھے *)

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن	بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

ق گ۔ب ۱۸۳۲

چکنی ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی	زیب دیتا ہے اُسے جسقدر اچھا کہئے
خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھئے	ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے
مُہرِ مکتوبِ عزیزاں گرامی لکھئے	حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہئے
مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھئے	داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہئے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھئے	سرِ پستانِ پریزاد سے ماناکہئے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے	خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلا کہئے
حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض	نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہئے
وضع میں اس کو اگر سمجھئے قافِ تریاق	رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہئے
صومعے میں اُسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز	میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہئے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھئے	کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہئے
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے	کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہئے
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھئے	کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہئے
اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجے فرض	اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہئے

ق ۱۸۳۰

تنہائی کی وادی میں

رہیے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کلکتہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

قطعہ

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس، اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو، مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں، "کیوں ہم نہ کہتے تھے"

متفرقات

مندگئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے، پرکس وقت

لو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو، تو مسیحا کا کیا علاج

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعوئے وارستگی کی شرم

واں اسکو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم کو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

غالبؔ ترا احوال سنا دینگے ہم ان کو
وہ سُن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

گھر میں تھا کیا؟ کہ تیرا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ، کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ہوں میں بھی تماشائیٔ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے، کہ مطلب ہی بر آوے

رُباعیات

آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کیلئے گیا ہے کیا کھیل نکال

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا
اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ
دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال[1]
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم[1]
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کی شبِ قدر و دِوالی باہم

---

[1] یہ معلوم نہیں کہ یہ رباعیات اور مرزا کی ردیف واؤ کی دوسری غزل کب لکھی گئیں۔ ان میں یا تو ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی کی طرف اشارہ ہے۔ یا ظفر کی طرف، موخرالذکر صورت میں مرزا پر بادشاہ کی عنایات ۱۸۴۲ء سے پہلے ہی شروع ہو گئی ہونگی۔

ا۔ لالۂ صحرا۔ ۱۸۲۷ تا ۱۸۳۰

ب۔ گلِ رعنا۔ ۱۸۳۰ تا ۱۸۳۷

ج۔ بادۂ شیراز۔ ۱۸۳۷ تا ۱۸۴۷

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم　　کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم
زخمہ بر تارم پریشاں میرود　　کایں نواہائے پریشاں میزنم
رازدانِ خوئے دھرم کردہ اند
خندہ بر دانا و ناداں میزنم

غالبؔ

لالۂ صحرا

غزلیات

بہ شغل انتظار مہوشاں در خلوتِ شبہا
سرِ تارِ نظر شد رشتۂ تسبیح کوکبہا

بروئے برگ گل تا قطرۂ شبنم نہ پنداری
بہار از حسرت فرصت بدنداں میگزد لبہا

بخلوتخانۂ کام نہنگ لا زدم خود را
ستوہ آمد دل از ہنگامۂ غوغائے مطلبہا

کند گر فکر تعمیر خرابیہائے ما گردوں
نیاید خشت مثل استخواں بیروں ز قالبہا

خوشا بیرنگیٔ دل دستگاہِ شوق را نازم
نمی بالد بخویش ایں قطرہ از طوفانِ مشربہا

ندارد حسن در ہر حال از مشاطگی غفلت
بود تہ بندیٔ خط سبزۂ خط در تہِ لبہا

خوشا رندی و جوشِ زندہ رود و مشربِ عذبش
بہ لب خشکی چہ میری در سرابستانِ مذہبہا

تو خوی پنداری و دانی کہ جاں بردم نمیدانی
کہ آتش در نہادم آب شد از گرمیِ تبہا

مبادا ہمچو تارِ سبحہ از ہم بگسلد غالبؔ
نفس با ایں ضعیفی بر نتابد شور یا ربہا

سنہ ؟

بر نمی آید ز چشم از جوشِ حیرانی مرا | شد نگہ زنّارِ تسبیحِ سلیمانی مرا
دامن افشاندم بجیب و ماندہ در بندِ تنم | وحشتے کو تا بروں آرد ز عریانی مرا
وہ کہ پیش از من بپابوسِ کسی خواہد رسید | سجدۂ شوقے کہ می بالد بہ پیشانی مرا
با ہمہ خرسندی از وے شکوہ ہا دارم ہمی | تا ندانند صید پرستمہائے پنہانی مرا
تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم | گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

با سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالبؔ نیست آہنگِ غزلخوانی مرا (کلکتہ)

تا کیم دود شکایت ز بیاں برخیزد | بزن آتش کہ شنیدن ز میاں برخیزد
می رمی از من و خلقی بگمانست ز تو | ہیچ با شو و بنشیں کہ گماں برخیزد
گر دہم شرح عتابے کہ بدلہا داری | دود از کارگہ شیشہ گراں برخیزد
با قدِ سروچہ شخصیست کہ ناگہ یکبار | بیخود از جا ز ہجومِ خفقاں برخیزد
بچہ گیرند عیار ہوس و عشق وگر | رسمِ بیداد مباد از جہاں برخیزد
کشتۂ دعوی پیدائیِ خویشیم ہمہ | وائے گر پردہ ازیں راز نہاں برخیزد
زینہار از تعب دوزخِ جاوید مترس | خوش بہاریست کز و بیم خزاں برخیزد
جزوی از عالمم و از ہمہ عالم بیشم | ہیچو موئے کہ ز بتاں ز میاں برخیزد
عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ | چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد

گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالبؔ
رسمِ امید ہمانا ز جہاں برخیزد (کلکتہ)

شبہائے غم کہ چہرہ بہ خوناب شستہ ایم
از دیدہ نقش وسوسۂ خواب شستہ ایم

افسون گریہ بُرد ز خوییت عتاب را
از شعلۂ تو دود بہفت آب شستہ ایم

زاہد خوش است صحبت از آلودگی مترس
کاین خرقہ بارہا بہ مئے ناب شستہ ایم

اے در عتاب رفتہ ز بیرنگیٔ سرشک
غافل کہ امشب از مژہ خوناب شستہ ایم

پیمانہ را ز بادہ بخوں پاک کردہ ایم
کاشانہ را ز رخت بسیلاب شستہ ایم

غرقِ محیط وحدت صرفیم و در نظر
از روئے بحر موجہ و گرداب شستہ ایم

بیدست و پا بہ بحرِ توکل فتادہ ایم
از خویش گردِ زحمت اسباب شستہ ایم

در مسلخِ وفا ز حیا آبگشتہ ایم
خوں از جبیں و دست ز قصاب شستہ ایم

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ و بہ مے
از سینہ داغ دُوری احباب شستہ ایم

۷

گر مہر و گر کیں ہمہ رعنائیٔ وہم ست
شاد آنکہ بہ نیرنگ نگر دید فریبا

اندیشہ دو صد گل کدہ گل بردہ بدامن
اما ہمہ از نقش و نگار پرِ عنقا

آں وعظ فقیہانۂ زاہد کہ نزیبد
بر صفحۂ دیں نقش رواجِ غمِ دنیا

واں نغمۂ مستانۂ رنداں کہ نیرزد
دم سردیٔ امروز بسر گرمیٔ فردا

آں حسن و دم ناز ز افسوں ادائی
جاں بازد میدان بہ تن صورت دیبا

واں عشق و گہِ عجز بہ امید نگاہے
از خویش گزشتن بسر راہِ تمنا

گردیدن ہفت اختر و نہ چرخ ہر سو | زیں عربدہ بالیدن آثار بہر جا
گل کردن صد رنگ بہار از جگر خاک | بہ جستن یکدستہ شرار از رگ خارا
ہنگامۂ ابلیس و نشاں دادن گندم | افسانۂ آوارگیٔ آدمؑ و حواؑ
دانستہ شود ہر چہ ز اسرار تعیّن | سنجیدہ شود ہر چہ ز آثار من و ما
از خامۂ نقاش برون نامدہ ہر گز | ہر نقش کہ بینی ز پس پردہ ہویدا
وحدت ہمہ حدیست معین کہ خود از وے | ہستی ہمہ جز ئیست حقیقی کہ مر اورا
طرفی نتوان بست بسر گرمیٔ اوہام | ہر گز نتوان کرد پراگندہ بر اجزا
آئینہ بہ بینش نظر و جلوہ فراواں | دل پر ہوس و صاحب خلوتکدہ تنہا
پیدا و نہاں مشغلہ حب ظہورست | چوں پردہ برافتد نہ نہانست نہ پیدا

تحفۂ دیر

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور | بہشت خرم و فردوس معمور
تناسخ مشرباں چوں لب کشانید | بہ کیش خویش کاشی را ستانید
کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد | دگر پیوند جسمانی نگیرد
چمن سرمایۂ امید گردد | بمردن زندۂ جاوید گردد
زہی آسودگی بخش روانہا | کہ داغ چشم می شوید ز جانہا
شگفتے نیست از آب و ہوایش | کہ تنہا جاں شود اندر فضایش

بیا اے غافل از کیفیت ناز	نگاہی بر پری زادانش انداز
ہمہ جانہای بے تن کن تماشا	ندارد آب و خاک این جلوہ حاشا
نہاد شاں چو بوی گل گران نیست	ہمہ جانند جسمی درمیان نیست
خس و خارش گلستانست گوئی	غبارش جوہر جانست گوئی
سوادش پایۂ تخت بت پرستاں	سراپایش زیارتگاہِ مستاں
عبادتخانۂ ناقوسیانست	ہما ناکعبۂ ہندوستانست
بتانش را ہیولے شعلۂ طور	سراپا نور ایزد چشم بد دور
میانہا نازک و دلہا توانا	زنادانی بکار خویش دانا
تبسم بسکہ در لبہا طبیعیست	دہنہا رشک گلہائے ربیعیست
ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار	خرامے صد قیامت فتنہ دربار
بہ لطف از موج گوہر نرم روتر	بناز از خونِ عاشق گرم روتر
زانگیز قد انداز خرامے	بپائے گلبنے گستردہ دامے
زرنگیں جلوہا غارتگرِ ہوش	بہار بستر و نوروز آغوش
زتاب جلوۂ خویش آتش افروز	بتانِ بت پرست و برہمن سوز
بسامانِ دو عالم گلستاں رنگ	زتاب رخ چراغاں لب گنگ
قیامت قامتاں مژگاں درازاں	زمژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں
بہ تن سرمایۂ افزایشِ دل	سراپا مژدۂ آسایشِ دل

به مستی موج را فرموده آرام | زنغزی آب را بخشیده اندام
فتاده شورشی در قالب آب | زماهی صد دلش در سینه بیتاب
زبس عرض تمنا مے کند گنگ | زموج آغوشها وا میکند گنگ

زتاب جلوه ها بیتاب گشته
گهرها در صدف ها آب گشته

بادِ مخالف

اے تماشائیان بزمِ سخن | وے مسیحا دمان نادر فن
اے سخن پروران کلکته | وے زبان آوران کلکته
اسد الله بخت برگشته | در خم و پیچ عجز سر گشته
گرچه ناخوانده میهمان شماست | بے سخن ریزه چین خوان شماست
به تظلم رسیده است اینجا | بامید آرمیده است اینجا
کار احباب ساختن رسم ست | میهماں را نواختن رسم ست
آں ره و رسم کارسازے کو | شیوهٔ میهماں نوازے کو
کیستم دل شکسته غمزدهٔ | بیدلے خستهٔ ستمزدهٔ
برق بے طاقتی بجان زده | آتش غم بخان ومان زده
از گداز نفس بتاب و تبے | در بیاباں یاس تشنه لبے

خس طوفانی محیط بلا — سر بسر گرد کاروان فنا

دردمندی جگر گداختۂ — از غم دہر زہرہ باختۂ

در آگاہی فنا زدۂ — ہمہ بر خویش پشت پا زدۂ

چہ بلاہا کشیدہ ام آخر — کہ بدینجا رسیدہ ام آخر

بسیہ روز غربتم بینید — تیرہ شبہائے وحشتم بینید

اندہ دورے وطن نگرید — غم ہجران انجمن نگرید

نہ ہمیں نالہ و فغاں بلبم — من و جاں آفریں کہ جاں بلبم

من کہ در عزم داوری کردن — ساز بزم سخنوری کردن

با بزرگاں نیاز ہا دارم — ہم بدیں شیوہ ناز ہا دارم

بندہ ام بندہ مہربانان را — رمز فہمان و نکتہ داناں را

نہ ز آویزش بیاں ترسم — من و ایمان من کزاں ترسم

کہ پس از من بسا لہائے دراز — بزباں ماند ایں حکایت باز

کہ سفیہے رسیدہ بود اینجا — چند روز آرمیدہ بود اینجا

با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت — زحمتے داد و راہ خویش گرفت

شوخ چشمے و زشت خوئے بود — بیحیائے و ہرزہ گوئے بود

برگ دنیا نہ ساز دینش بود — ننگ دہلی و سرزمینش بود

آہ ازاں دم کہ بعد رفتن من — خون دہلی بود بگردن من

تاب ہنگامہ ام خدارا نیست — مہربانان دلست خارا نیست

دیدنکہ در پیشگاہ بزمِ سخن — بزبانہا فتادہ است زمن

کہ فلاں با قتیل نیکو نیست — مگس خوان نعمت او نیست

زلہ بردار کس چرا باشم

من ہمایم مگس چرا باشم

فریاد

نہ مراد دولت دنیا نہ مرا اجرِ جمیل — نہ چو نمرود توانا نہ شکیبا چو خلیل

با رقیباں کف ساقی بمیٔ ناب کریم — با غریباں لب جیحوں بدمِ آب بخیل

اے بہ مسمار قضا دوختہ چشمِ ابلیس — بدم گرم رواں سوختہ بال جبریل

با توام خرمیٔ خاطر موسیٰ برطور — با خودم خستگی لشکر فرعون بہ نیل

بر کمال تو درا ندازہ کمال تو محیط — بر وجود تو درا ندیشہ وجود تو دلیل

نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را — اے تبرسا بچگاں کردہ مٔے ناب سبیل

غالبِ سوختہ جاں را چہ بگفتار آری

بدیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

تشبیب قصیدہ

تو اے ستارہ ندانی کہ رنجم از آزار — تو اے سپہر نہ سنجی کہ ترسم از بیداد

ترا غمیست بسرمایۂ گرانئ کوہ | مرا دمیست بہ نیروئے تیشۂ فرہاد
من و بلائے تو نطع ادیم و تاب سہیل | من و جفائے تو شاگرد و سیلئ اُستاد
من و ستم دلِ رنجور و التفاتِ طبیب | من و خطرِ رگِ مجنوں و نشترِ فصاد
بگوشِ تابِ طبیعت روم معاذاللہ | ندیدہ ام کہ از کیست جملہ بست و کشاد
ستارہ راہمہ رفتار ز اقتضائے قضا است | چنانکہ جنبشِ نرد از انامِلِ نرّاد
فلک کجائی و طالع چہ دستارہ کدام | کنم شکایت دشمن ز دوست شرمم باد
غزل سرایم و در مہر پیچم از اندوہ | ترانہ سنجم و برخیزم از سرِ فریاد
بیا کہ شوقِ عنانِ سخن بگرداند | ز سنگلاخ شکایت بہ مرغزارِ وداد
بیا کہ نیست ثباتے بدیں نشاط و ملال | بیا کہ نیست دوامے بدیں بیاض و سواد
بیا کہ نہ و سرایدزمانۂ اندوہ | شود روانِ گرامی ز بندِ تن آزاد

بیا کہ دادہ نوید نکوئی فرجام
حسینؓ ابن علیؑ آبروئے دانش و داد

شباب

آں بلبلم کہ در چمنستاں بشاخسار | بود آشیانِ من شکنِ طرۂ بہار
آں مطربم کہ سازِ نوائے خیالِ من | غیر از کمند جاذبۂ دل نداشت تار
آں ریشۂ نگاہ امیدم کہ دمبدم | بود از نمِ طراوتِ دل شوقم آبیار

هر غنچه از دمم بفضائے شگفتگی — فیض نسیم و جلوهٔ گل داشت پیشکار

هر جلوه راز من بتقاضائے دلبرے — از غنچه بود محمل نازے برهگزار

هم سینه از بلائے جفا پیشهٔ دلیراں — فرہنگ کاردانی بیداد روزگار

ہم دیده از ادائے مغاں شیوہ شاہداں — فہرست روزنامهٔ اندوه انتظار

شوقم جریدهٔ رقم آرزوئے بوس — ذوقم قلمرو ہوس مژدهٔ کنار

فکرم بجیب شاہد اندیشه گلفشاں — کلکم بطرف گلشن نظاره لاله کار

از چشم و دل نہاد مرا بود تاج و تخت — وز رنگ و بو بساط مرا بود پود و تار

بختم بجیب عشرتیاں میفشاند گل — سعیم ز پائے محنتیاں میکشید خار

وقت مرا روائے کوثر در آستیں — بزم مرا طراوت فردوس در کنار

ساقی ز باده بر اثر نغمه عذرخواه — مطرب ز نغمه در ہوس باده حق گزار

از پرده ہائے ساز نفسہا اثرفشاں — وز جلوه ہائے ناز نظرہا کرشمه بار

ہمواره ذوق مستی و لہو و سرور و سوز — پیوسته شعر و شاہد و شمع و می و قمار

با کیسه در خصومت و با کاسه در لجاج — رندان پاکباز و شگرفان شاد خوار

بد مستئ شبینه و خواب سحرگہے — رنگینئ سفینه و اشعار آبدار

اکنوں منم ز رنگ بروئیم نمے رسد — تا رخ بخوں دیده بشوئیم ہزار بار

چشم کشوده اند بکردار ہائے من
زاینده ناامیدم و از رفته شرمسار

گلِ رعنا

غزلیات

سحر دمیده و گل در دمیدنست مخسپ
جهان جهان گل نظّاره چیدنست مخسپ

مشام را به شمیم گلے نوازش کن
نسیم غالیه سا در وزیدنست مخسپ

ز خویش حسن طلب بین و در صبوحی کوش
مئے شبانه ز لب در چکیدنست مخسپ

ستارهٔ سحری مژده سنج دیداریست
ببیں که چشم فلک در پریدنست مخسپ

تو محو خواب و سحر در تاسف از انجم
به پشت دست بدنداں گزیدنست مخسپ

نفس ز ناله به سنبل درودنست بخیز
ز خون دل مژه در لاله چیدنست مخسپ

نشاط گوش بر آواز قلقلست بیا
پیاله چشم براه کشیدنست مخسپ

نشان زندگی دل دویدنست مایست
جلائے آئینه چشم دیدنست مخسپ

ز دیده سود حریفاں کشودنست مبند
ز دل مراد عزیزاں تپیدنست مخسپ

بذکر مرگ شبی زنده داشتن ذوقیست
گرت فسانهٔ غالب شنیدنست مخسپ

ظہور بخشش حق را ذریعہ بے سببیست — وگرنہ شرم گنہ در شمار بے ادبیست

زگیر و دار چہ غم چوں بعالمیکہ منم — ہنوز قصۂ حلاج حرف زیرلبیست

رموز دیں نشناسم درست و معذورم — نہاد من عجمی و طریق من عربیست

نشاط جم طلب از آسمان شوکت جم — قدح مباش زیاقوت بادہ گر عنبیست

بالتفات نیرزم ور آرزو چہ نزع — نشاط خاطر مفلس نہ کیمیا طلبیست

نہ ہم بپا لگے زاہداں بلائے بود — خوش است گرمی بغیش خلاف شرع نبیست

ہر آنچہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست — عیار بیکسئے ما شرافت نسبیست

کسیکہ از تو فریب وفا خورد داند — کہ بیوفائی گل در شمار بوالعجبیست

میاں غالب و واعظ نزاع شد ساقی

بیا بہ لا بہ کہ ہیجان قوت غضبیست

آہے بعشق فاتح خیبر کنیم طرح — در گنبد سپہر مگر در کنیم طرح

در فصل دے کہ گشتہ جہاں زمہریر ازد — بنشیں کہ آب گردش ساغر کنیم طرح

تا چند نشنوی تو و ماحسب حال خویش — افسانہ ہائے غیر مکرر کنیم طرح

مارا زبوں مگیر گر از پا در آمدیم — از ما عجب مدار گر از سر کنیم طرح

خود را بشاہدی بپرستم زیں سپس — در راہ عشق جادۂ دیگر کنیم طرح

از داغ شوق پردہ نشینے نشاں دہیم — در زخم رشک روزنۂ در کنیم طرح

از تار و پود نالہ نقابے دہیم ساز — وز دود سینہ زلف معنبر کنیم طرح

برگ حنا ز شعلہ و آذر بہم نہیم | پیرایہ از شرارہ و اخگر کنیم طرح
از زخم و داغ لالہ و گل در نظر کشیم | از کوہ و دشت حجلہ و منظر کنیم طرح
از سوز و ساز محرم و مطرب کنیم جمع | از خارہ و خارہ بالش و بستر کنیم طرح

آئین برہمن بنہایت رساندہ ایم
غالب بیا کہ شیوۂ آذر کنیم طرح

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند | شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند | دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند
سوخت آتش کدہ ز آتش نفسم بخشیدند | ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند
گہر از رایت شاہان عجم برچیدند | بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارک ترکان پشنگی بردند | بہ سخن ناصیۂ فرکیانم دادند
گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند | ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند
ہرچہ در جزیہ ز گبراں مئے ناب آوردند | بشب جمعۂ ماہ رمضانم دادند
ہرچہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند | تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند
دل ز غم مردہ و من زندہ ہمانا این مرگ | بود ارزندہ بماتم کہ امانم دادند

ہم ز آغاز بخوف خطر ستم غالب
طالع از قوس و شمار از سرطانم دادند

عاشق چو گفتیش کہ بروز زد میرود | نازم بخواجگی غضب آلود میرود

از ناله ام مرنج که آخر شدست کار — شمع خموشم و ز سرم دود میرود

شادم به بزم وعظ که رامش اگرچه نیست — بارے حدیث چنگ و نے و عود میرود

فردوس جو عمر بوسواس داده را — سرمایه نیز در هوس سود میرود

ماهم به لاغ و لابه تسلی شویم کاش — ناداں ز بزم دوست چه خوشنود میرود

رشک وفا نگر که بدعوی گه رضا — هر کس چگونه در پے مقصود میرود

فرزند زیر تیغ پدر مے نهد گلو — گر خود پدر در آتش نمرود میرود

غالب خوش است فرصت موهوم فکر عیش

تارے که نیست در سر این پود میرود

چه خیزد از سخنے کز درون جاں نبود — بریده باد زبانے که خونچکاں نبود

حکیم ساقی و مے تند و من ز بدخوئی — ز رطل باده بخشم آیم ار گراں نبود

نگفته ام ستم از جانب خدا است ولے — خدا به عهد تو بر خلق مهرباں نبود

زمام ناقه بدست تصرف شوق است — بسوی قیس گرایش ز ساربان نبود

مرا که لب بطلب آشنا نخواسته — روا مدار که شاهد ضمیر داں نبود

بالتفات نگارم چه جائے تهنیت ست — دعا کنید که نوعے ز امتحاں نبود

عجب بود سرِ همخوابئے کسے غالب

مرا که بالش و بستر ز پرنیاں نبود

یارب ز جنوں طرح غمے در نظرم ریز — صد بادیه در قالب دیوار و درم ریز

از مہر جہانتاب امید نظرم نیست — این تشت پر از آتش سوزاں بسرم ریز

دل را ز غم گریۂ بے رنگ بجوش آر — اجزائے جگر حل کن و در چشم ترم ریز

ہر برق کہ نظارہ گداز ست نہادش — بگزار و بہ پیمانۂ ذوق نظرم ریز

سرمست مئے لذت دردم بخرام آر — وین شیشۂ دل بشکن و در رہگذرم ریز

ہر خوں کہ عبث گرم شود در دلم افگن — ہر برق کہ بیصرفہ جہد بر اثرم ریز

ہر جا نم آبیست بمژگان ترم بخش — از قلزم و جیحوں کف خاکے بسرم ریز

از شیشہ گر آئیں نتواں بست شبم را — باری گل پیمانہ بجیب سحرم ریز

گیرم کہ بہ افشاندن الماس نیرزم — مشتی نمک سودہ بزخم جگرم ریز

ایں سوز طبیعی نگدازد نفسم را — صد شعلہ بیفشار و بہ مغز شررم ریز

مسکیں خبر از لذت آزار ندارد — خارم کن و در رہ گزر چارہ گرم ریز

وجہی کہ بہ پامزد تواں داد ندارم — آبم کن و اندر قدم نامہ برم ریز

دارم سر ہمطرحی غالب چہ جنوں ست
یارب ز جنوں طرح غمے در نظرم ریز

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ — ترا کہ ہست و نیاشامی از بہار چہ حظ

خوشست کوثر و پاکست بادہ کہ در دست — ازاں رحیق مقدس دریں خمار چہ حظ

چمن پر از گل و نسریں و دلربائے نے — بدشت فتنہ ازیں گردبی سوار چہ حظ

چنیں کہ نخل بلندست و سنگ ناپیدا — ز میوہ تا نفتد خود ز شاخسار چہ حظ

نہ ہر کہ خونی و رہزن بپایہ منصور ست — بدین حضیض طبیعی زاوج دار چہ حظ
بہ بند زحمت فرزند و زن چہ می کشیم — ازین نخواستہ غمہائے ناگوار چہ حظ

بعرضِ غصّہ نظیری وکیلِ غالب بس
اگر تو نشنوی از نالہ ہائے زار چہ حظ

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم — در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر افگنم
در وجد اہلِ صومعہ ذوقِ نظارہ نیست — ناہید را بزمزمہ از منظر افگنم
معشوقہ راز نالہ بد انساں کنم حزیں — کز لاغری ز ساعد او زیور افگنم
ہنگامہ را جحیم جنوں بر جگر زنم — اندیشہ را ہوائے فسوں در سر افگنم
نخلم کہ ہم بجائے رطب طوطی آورم — ابرم کہ ہم بروئے زمیں گوہر افگنم
با غازیاں ز شرحِ غمِ کارزار نفس — شمشیر را برعشہ ز تن جوہر افگنم
با دیریاں ز شکوۂ بیدادِ اہلِ دیں — مہرے ز خویشتن بدلِ کافر افگنم
ضعفم بہ کعبہ مرتبۂ قربِ خاص داد — سجّادہ گستری تو و من بستر افگنم
تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر — بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم
راہے ز کنجِ دیر بہ مینو کشودہ ام — از خُم کشم پیالہ و در کوثر افگنم
منصورِ فرقۂ علی اللّٰہیاں منم — آوازۂ انا اسد اللہ در افگنم
ارزندہ گوہرے چو من اندر زمانہ نیست — خود را بخاکِ رہ گزرِ حیدر افگنم

غالب بہ طرحِ منقبتِ عاشقانۂ
رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بہ گردش رطل گراں بگردانیم

ز چشم و دل بتماشا تمتع اندوزیم — ز جان و تن بمدارا زیاں بگردانیم

بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم — بہ کوچہ بر سر رہ پاسباں بگردانیم

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم — وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم

اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم — وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

گل افگنیم و گلابے برہگزر پاشیم — مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم — بکار و بار زنے کارواں بگردانیم

گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم — گہے ببوسہ زباں در دہاں بگردانیم

نہیم شرم بیک سو و باہم آویزیم — بشوخیئے کہ رخ اختراں بگردانیم

ز جوش سینہ سحر را نفس فرو بندیم — بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم

بوہم شب ہمہ را در غلط بیندازیم — ز نیمہ رہ رمہ را باشباں بگردانیم

بجنگ باج ستاناں شاخساری را — تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم

بہ صلح بال فشاناں صبح گاہی را — ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود — گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

بمن وصال تو باور نمی کند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

تازہ دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن — ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوج قبولی بوده است — شهرت شعرم به گیتی بعد من خواهد شدن

حرف حرفم در مذاق فتنه جا خواهد گرفت — دستگاه ناز شیخ و برهمن خواهد شدن

شاد باش ای دل درین محفل که هر جا نغمه ایست — شیون رنج فراق جان و تن خواهد شدن

هم فروغ شمع هستی تیرگی خواهد گزید — هم بساط بزم مستی پرشکن خواهد شدن

از تب و تاب فنا یکباره چون مشتے سپند — هر یکے گرم وداع خویشتن خواهد شدن

حسن را از جلوهٔ نازش نفس خواهد گداخت — نغمه را از پردهٔ سازش کفن خواهد شدن

دهر بے پروا عیار شیوه‌ها خواهد گرفت — داوری خوں در نهاد ما و من خواهد شدن

پرده‌ها از روے کار زهد گر خواهد فتاد — خلوت گبر و مسلماں انجمن خواهد شدن

گرد پندار وجود از رهگذر خواهد نشست — بحر توحید عیانی موجزن خواهد شدن

در ته هر حرف غالب چیده ام میخانهٔ

تا ز دیوانم که سرمست سخن خواهد شدن

حق که حقیست سمیعست فلانی بشنو — بشنو گر تو خداوند جهانی بشنو

لن ترانی بجواب ارنی چند و چرا — من نه اینم بشناس و تو نه آنی بشنو

سوے خود خواں و بخلوت گهِ خاصم جا دہ — آنچه دانی به شمار آنچه ندانی بشنو

پردهٔ چند به آهنگ نکیسا بسراے — غزل چند به هنجار فغانی بشنو

لختے آئینه برابر نه و صورت بنگر — پارهٔ گوش به من دار و معانی بشنو

هر چه سنجم بتو از اندیشهٔ پیری بپذیر — هر چه گویم بتو از عیش جوانی بشنو

داستانِ من و بیداری شبہائے فراق | تا نخسپی و بپایم نفشانی بشنو
چارہ جو نیستم و نیز فضولی بکنم | من و اندوہ تو چندانکہ توانی بشنو
زینکہ دیدی بہ تجسیم طلب رحم خطاست | سخنے چند ز غمہائے نہانی بشنو

نامہ در نیمۂ رہ بود کہ غالب جاں داد
ورق از ہم وردایں مژدہ زبانی بشنو

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو | کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو
از ہرزہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن | جوئی بخیاباں رو سیلی بہ بیاباں شو
ہم خانہ بساماں بہ ہم جلوہ فراواں بہ | در کعبہ اقامت کن در بتکدہ مہماں شو
آوازۂ معنی را بر ساز دلبستاں زن | ہنگامۂ صورت را بازیچۂ طفلاں شو
گر چرخ فلک گردی سر بر خط فرماں نہ | ور گوئی زمیں باشی وقف خم چوگاں شو
آوردہ غم عشقم در بندگی ایزد | اے داغ بدل در رو و ز جبہہ نمایاں شو
سرمایہ کرامت کن وانگاہ بغارت بر | بر خرمن ما برقے بر مزرعہ باراں شو

جان و ادبغم غالب خشنودی روحش را
در بزم عزا می کش در نوحہ غزلخواں شو

بدل زعربدہ جائے کہ داشتی داری | شمار عہد وفائے کہ داشتی داری
تو کے ز جور پشیماں شدی چہ میگوئی | دروغ راست نمائے کہ داشتی داری
بسینہ چوں دل و در دل چو جاں خزیدی و باز | نگاہ مہر فزائے کہ داشتی داری

عتاب و مہر تو از ہم شناختن نتواں | خرد فریب ادائے کہ داشتی داری
خراب بادۂ دوشینہ سرگرم | ادائے لغزش پائے کہ داشتی داری
بہ کردگار نگر دیدی و ہماں بفسوں | حدیث روز جزائے کہ داشتی داری
کرشمہ بار نہالے کہ بودۂ ہستی | بسر ز فتنہ ہوائے کہ داشتی داری

جہانیاں ز تو برگشتہ اند گر غالب
تراچہ باک خدائے کہ داشتی داری

صبح میکدہ

صبحے کہ در ہوائے پرستاریِ وثن | جنبد کلیدِ بتکدہ در دست برہمن
در رُفتِ در دوب دیدم گرم راہیاں | آرد بروں گداختہ شمع ازلگن
خیزند و ستہ وستہ مغان رشتہ دوی | در اہتمام چیدن رسم زنار ون
از شورویریاں بگماں خروش صور | اموات را ز رقص بتں بر درد کفن
رخشند ستارہ از رخ ناشستۂ صنم | بالد بنفشہ از قدخم گشتہ دشمن
بر روے خاک جلوہ کند سایہ در نظر | بر بوے دوست حلقہ زند مرغ در چمن
خواہد چراغ کشتہ چو شخص بریدہ سر | خیزد گل شگفتہ چو رنجور خستہ تن
غوغائے روز پردہ کشاید ز خوب و زشت | آوائے کوس خواب رباید ز مرد و زن

داری سر غریب نوازی نہ بے نشاط
غالب ندیدہ کہ غریبست در وطن

گربۂ غالب

دارم بجہاں گربۂ پاکیزہ نہادے — کز بال پریزاد بود موج رمِ او
سرمست اداچوں بزمیں بازخراید — از خاک دمد غنچہ زنقش قدم او
چوں صورت آئینہ زافراط لطافت — آید بنظر بچۂ او از شکم او
ہر شیر ژیانے کہ بہ بینی بہ نیستاں — دارد سرِ دریوزہ غُرِش زدمِ او
گرجانورے مردہ بہ بیند سرِ راہے — از پاکی طینت نخورد غیر غم او
ہر بچہ کہ کنجشک بوے باز سپارد — در پرورش او نخورد جز قسم او
آرے بود از غیرت انداز خرامش — بر کبک وتدروست اگر خود ستم او
رخشندہ ادیم تنش از لطف زبانش — گوئی بہ اثر تاب سہیل ست نم او
جوش گل و بالیدگی موجۂ رنگست — دُم لابہ کناں آمدن دمبدم او
در عربدہ چوں بند زدم باز کشاید — لرزد شکن طُرّہ خوباں زخم او
تا مہرہ کش صفحۂ افلاک بود مہر — بادا کف دست من و پشت و شکم او

قطعہ

چوں مرانیست دستگاہِ ستیز — چوں مرانیست رسم وراہ مصاف
میکشایم بے بہا یاہائے — میکشم خنجر زبان زغلاف

لیک در ہجو بادم امساک | در شکایت نشایدم اسراف
بندہ را بودہ است از سرکار | وست مزد شفقتِ اسلاف
زر سالانۂ برائے دوام | وجہ شائستہ بقدر کفاف
ملزمم کردہ اند ہاں بدروغ | حق من خوردہ اند ہیں بگزاف
آہ از اقربائے بے آزرم | داد از حاکمان نا انصاف

قطعہ

اے کہ خواہی کہ بعد ازیں ہاشم | مخلص صادق الولائے تو من
گر ترا شیوہ شاہدی بودے | کرمے جان و دل فدائے تو من
ور ترا پیشہ شاعری بودے | سومے چشم و سر بپائے تو من
ور ترا پا خسروی بودے | سفتمے گوہر ثنائے تو من
چوں ازینہا نہ مراچہ ضرور | کہ شوم ہرزہ مبتلائے تو من
راست گویم بہانہ چند آرم | ناصح مشفقم برائے تو من
بسکہ بر مال و جاہ مغروری | نیستم خوش ازیں ادائے تو من
چہ کنی ایں فساد سیم و زر ست | وائے من گر بوم بجائے تو من
بتو ہرگز ندادمے زر و سیم | خواجہ گر بودمے خدائے تو من

قطعۂ ہجویہ

ایا بے ہنر دشمن دیوسار | چہ نازی بہنگامۂ زور و زر
زما باش فارغ کہ ما فارغیم | نداریم پروائے ایں شور و شر

ترا شیوہ دزدی و ما بینوا
تو بدروی و بدگوی دما کور وکر

نوائے سروش

غالب افسردہ دل و جاں بیا | بے سروپا وصفِ رنداں بیا
بیخبراں را خبرے بازدہ | زاں مئے دیرین قدرے بازدہ
آں اثر پردۂ سازت چہ شد | زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد
آں نفسِ نالہ کندت کجاست | واں نگہِ جلوہ پسندت کجاست
درہوسِ جاہ فرو رفتۂ | حیف کہ درچاہ فرو رفتۂ
راہ غلط کردہ بافسونِ دیو | می سپری مرحلۂ رنگ وریو
بندۂ زر بودن ازاہرمنیست | مردِ خدا ایں چہ خدا دشمنیست
آہ از دنیا طلبیہائے تو | ویں ہمہ ابرام وتقاضائے تو
گرمئے خونت کہ ازیں پیش بود | صرف برانداختن خویش بود

آتشِ ہنگامہ بجاں داشتی — داغِ مغاں شیوہ بُتاں داشتی

آں ہمہ دیوانگی و جاہلی — واں ہمہ ناکامی و بیحاصلی

آں ہمہ بیراہہ روی ہائے تو — واں ہمہ بیصرفہ دویہائے تو

آں ز جنوں برق بخرمن زدن — واں بخمِ دامِ ہوس تن زدن

نیمہ شب از عمرِ تو در خواب رفت — نیمہ بہ بیہودنِ مہتاب رفت

بیں کہ دریں کارگہِ ہیچ ہیچ — ماحصلِ سعیِ تو ہیچ است ہیچ

اے ہمہ تن وسوسہ سُود تو کُو — دہر سراب است وجودِ تو کُو

خلق کہ از وہم نمودیش ہست — وہم تو دانست کہ بودیش ہست

پیرویٔ وہم مکن زینہار — سر ز گریبانِ حقیقت بر آر

خیز و چو منصور نوائے بزن — ہستیٔ خود را سرِ پائے بزن

ساقیٔ ہمت کہ صلا میدہد — بادہ ز خمخانۂ لا میدہد

ہمت اگر بال کشائی کند — صعوہ تواند کہ ہمائی کند

نیّرِ توفیق اگر بر دمد — لالہ عجب نیست کز اخگر دمد

ہمتِ ما نیز شہودِ حق است — ہر چہ بسنجیم وجودِ حق است

ہمتِ ما غیرتِ حق است و بس — کثرتِ ما وحدتِ حق است و بس

از اثرِ سطوتِ حق در کلام

حرف ز لب میرمدم والسلام

زندگی

تو نالی از خلۂ خار و نشگری کہ سپہر
سرِ حسینؑ علیؑ بر سناں بگرداوند
برو بشادی و اندوہ دل منہ کہ قضا
چو قرعہ بہ نمط امتحاں بگرداوند
یزید را بہ بساط خلیفہ بنشاند
کلیم را بہ لباسِ شباں بگرداوند

بادِ شیراز

غزلیات

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را　　رشک نگزارد کہ گویم نام را
آں منم باید کہ چوں ریزم بجام　　زورے در گردش آرد جام را
بیگناہم پیر دیر از من مرنج　　من بمستی بستہ ام احرام را
از دل تست آنچہ بر من میرود　　می شناسم سختیٔ ایام را
تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود　　خوش بود گر دانہ نبود دام را
ما کجا او کوچہ سودا در سرست　　ذرہ ہائے آفتاب آشام را

دلستاں در خشمؔ غالب بوسہ جو
شوق نشناسد ہمے ہنگام را

بوادیئے کہ دراں خضر را عصا خفتست　　بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

بدین نیاز که با تست ناز میرسدم
گدا بسایهٔ دیوار پادشا خفتست

به صبح حشر چنین خسته روسیه خیزد
که در شکایت درد و غم دوا خفتست

خروش حلقهٔ رندان ز نازنین پسریست
که سر بزانوی زاهد بوریا خفتست

هوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز
گسسته لنگر کشتی و ناخدا خفتست

غمت بشهر شبیخون زنان به بنگهٔ خلق
عسس بخانه و شه در حرم سرا خفتست

دلم به سبحه و سجاده و ردا لرزد
که دزد مرحله بیدار و پارسا خفتست

درازی شب و بیداری من اینهمه نیست
ز بخت من خبر آرید تا کجا خفتست

ببین ز دور و مجو قرب شه که منظر را
دریچه باز و بدروازه اژدها خفتست

براه خفتن من هر که بنگرد داند
که میر قافله در کاروانسرا خفتست

دگر ز ایمنی راه و قرب کعبه چه حظ
مرا که ناقه ز رفتار ماند و پا خفتست

بخواب چون خودم آسوده دل مدان غالب
که خسته غرقه بخون خفته است تا خفتست

بیا ز جوش تمنای دیدنم بنگر
چو اشک از سر مژگان چکیدنم بنگر

ز من بجرم تپیدن کناره می کردی
بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

شنیده ام که نه بینی و نا امید نیم
ندیدن تو شنیدم شنیدنم بنگر

رمید دانه و بالید و آشیان گم شد
در انتظار هما دام چیدنم بنگر

نیازمندی حسرت کشان نمیدانی
نگاه من شو و دزدیده دیدنم بنگر

بداد من نرسیدی ز درد جاں دادم | بداد طرز تغافل رسیدنم بنگر
تواضعی نکنم بے تواضعے غالب
بسایۂ خم تیغش خمیدنم بنگر

بمرگ من کہ پس از من بمرگ من یاد آر | بکوئے خویشتن آں نعش بے کفن یاد آر
من آں نیم کہ ز مرگم جہاں بہم نخورد | فغان زاہد و فریاد برہمن یاد آر
ببام و در ز ہجوم جواں و پیر بگو | بکوئے و برزن از انبوہ مرد و زن یاد آر
بساز نالہ گروہے ز اہل دل دریاب | بہ بند مرثیہ جمعے ز اہل فن یاد آر
بخود شمار وفاہائے من ز مردم پرس | بمن حساب جفاہائے خویشتن یاد آر
چہ دید جان من از چشم پرخمار بگو | چہ رفت بر سرم از زلف پرشکن یاد آر
بسنج تا ز تو بر من بداں محل چہ گذشت | نخواندہ آمدن خویش در انجمن یاد آر
ہزار خستہ و رنجور در جہاں دریاب
یکے ز غالب رنجور خستہ تن یاد آر

دیدم آں ہنگامہ بیجا خوں بمحشر داشتم | خود ہماں شورست کاندر زیست در سر داشتم
طول روز حشر و تاب مہر ذوقے بودہ بس | جلوۂ برقے درا بود دامن تر داشتم
تا چہ سنجم دوزخ و کوثر کہ من نیز ایں چنیں | آتشے در سینہ و آبے بساغر داشتم
دوش بر من عرض کردند آنچہ در کونین بود | زاں ہمہ کالائے رنگا رنگ دل بر داشتم
از خرابی شد فنا حاصل خوشم زیں اتفاق | بود مقصودم محیط و سیل رہبر داشتم

کور بودم کز حرم راندند رفتم سوئے دیر | از جمال بت سخن میرفت باور داشتم

سوزم از حرماں مے باآنکہ آبم در سبوست | تا چہ می کردم اگر بخت سکندر داشتم

ہیچ میدانی کہ غالب چوں بسر بردم بدہر

منکہ طبع بلبل و شغل سمندر داشتم

دارم دلے ز غصہ گرانبار بودہ | بر خویشتن ز آبلہ چیزے فزودہ

دل زاں بلا کزو نفسے برق خرمنے | بخت آنچناں کز اثر مرگ دودہ

از بہر خویش ننگم و دارم ز بخت چشم | خود را در آب و آئینہ رخ نانمودہ

گمنام و زہد کیشم و خواہم بمن رسد | در رخت خواب شاہ بہ ہستی غنودہ

خواہم ز خواب بر رخ لیلےٰ کشائمش | چشمے نگہ بہ پردہ محمل نسودہ

خواہم شود بہ شکوہ و بیچارہ رام من | در گونہ گوں ادا بزبانہا ستودہ

بادیں و دانشے چو منے تا چہا کند | سجادہ و عمامہ ز صنعاں ربودہ

با دوستاں مباحثہ دارم ز سادگی | در باب آشنائی ناآزمودہ

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند | جز روزۂ درست بصہبا کشودہ

در بزم غالب آی و بشعر و سخن گرائے

خواہی کہ بشنوی سخن ناشنودہ

شاہا ببزم جشن چو شاہاں شراب خواہ | زر بیحساب بخش و قدح بیحساب خواہ

بزمت بہشت و بادہ حلالست در بہشت | گر باز پرس رو دہد از من جواب خواہ

تو پادشاہ عہدی و بخت تو نو جوان — بر خور ز عمر و باج نشاط از شباب خواہ

در روزہائے فرخ و شبہائے دلفروز — صہبا بروز ابر و شب ماہتاب خواہ

گل بوے و شعر گوئی و گہر پاش و شاد باش — مستی ز بانگ بربط و چنگ و رباب خواہ

خون سیاہ نافہ آہو چہ بود ہد — از حلقہائے زلف بتاں مشک ناب خواہ

خواہش ازیں گروہ پریچہرہ ننگ نیست — از چشم غمزہ وز شکن طرہ تاب خواہ

از رازہا حکایت ذوق نگاہ گوئے — از کارہا کشایش بند نقاب خواہ

ہر چند خواستن نہ سزاوار شان تست — قوت ز طالع و نظر از آفتاب خواہ

در برگ و ساز گوئے نشاط از بہار بر — در بذل وجود جمعیت خویش از سحاب خواہ

از شمع طور خلوت خود را چراغ نہ — از زلف حور خیمہ خود را طناب خواہ

از آسمان نشیمن خود را بساط ساز — از ماہ نو جبینت خود را رکاب خواہ

غالب قصیدہ را بشمار غزل درآر

وز شہ بریں غزل رقم انتخاب خواہ

گستاخ گشتہ ایم عذر جمال کو — پیچیدہ ایم سر ز وفا گوشمال کو

تا کے فریب حلم خدا را خدا نہ — آں خوئے خشمگیں واد اے ملال کو

برگشتہ ام ز مہر و نمے گیریم بہ قہر — دارم دو صد جواب ولے یک سوال کو

یا می گسست صحبت دیا میفزود ربط — لیکن مرا ملال و ترا انفعال کو

خواہی کہ بر فروزی و سوزی درنگ چیست — خواہم کہ تیز سوئے تو بینم مجال کو

گر گفتہ ایم کشتن و بستن بما مخند | مارا تدارکے بسزا در خیال کو
دل فتنہ جوئے و فرصت تکمیل عشق نیست | ہنگامہ سازئ ہوس زود بال کو
در بادۂ طہور غم محتسب کجا | در عیش خلد لذت بیم زوال کو

غالب بشعر کم ز ظہوری نیم ولے
عادل شہ سخن رس دریا نوال کو

بر دست و پائے بند گرانے نہادۂ | نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادۂ
این نیم زمرگ اگر رستہ ام زبند | دلدوز ناوکے بہ کمانے نہادۂ
تا در امید عمر بہ پندار بگزرد | از لطف در حیات نشانے نہادۂ
تاختۂ بلا نبود بے گریز گاہ | در مرگ احتمال امانے نہادۂ
راز ست گر دلے بجائے شکستۂ | وا دست گر سرے بسنانے نہادۂ
دوزخ بداغ سینۂ گدازے نہفتۂ | قلزم بچشم اشک فشانے نہادۂ
بر ہر دلے فسون نشاطے دمیدۂ | بر ہر تنے سپاس روانے نہادۂ
ہر دیدہ را درے بخیالے کشودۂ | ہر فرقہ را دلے بگمانے نہادۂ

غالب زغصہ مرد ہمانا خبر نداشت
کاندر خرابہ گنج نہانے نہادۂ

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمار دلبری | در دل سنگ بنگرد رقص بتان آزری
اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بروِ تو روئے نیست | در طلبت تواں گرفت بادیہ را برہبری

ہر کہ دلست در برش داغ تو رویدش ز دل | تا چو بدیگرے دہد باز برد بداوری
رشک ملک چہ دحرا چوں بتو رہ نمی برد | بیہدہ در ہوائے تو می پرداز سبکسری
حیف کہ من بخوں تپم وز تو سخن رود کہ تو | اشک بدیدہ بشمری نالہ بسینہ بنگری
کوثر اگر بمن رسد خاک خورم نبے نمی | طوبےٰ اگر ز من شود ہیمہ کشم زبے بری

بنیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالبؔ اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

ترانۂ شوق

زمن گرت نبود باور انتظار بیا | بہانہ جوئے مباش و ستیزہ کار بیا
بیک دو شیوہ ستم دل نمیشود خرسند | بمرگ من کہ بسامان روزگار بیا
بہانہ جوست در الزام مدعی شوقت | یکے برغم دل ناامیدوار بیا
ہلاک شیوۂ تمکیں مخواہ مستاں را | عناں گسستہ تراز بادِ نوبہار بیا
زما گسستی و با دیگراں گرو بستی | بیا کہ عہد و فا نیست استوار بیا
وداع و وصل جداگانہ لذتی دارد | ہزار بار برو صد ہزار بار بیا
تو طفل سادہ دل و ہمنشیں بد آموزست | جنازہ گر نہ تواں دید بر مزار بیا
فریب خوردۂ نازم چہا نمی خواہم | یکے بہ پرسشِ جانِ امیدوار بیا
ز خوئے تست نہادِ شکیب نازک تر | بیا کہ دوست و دلم میرود ز کار بیا

رواج صومعہ ہستیست زینہار مرو　　متاع میکدہ مستیست ہوشیار بیا

حصار عافیتی گر ہوس کنی غالب

چو ما بہ حلقۂ رندان خاکسار بیا

واسوخت

رفت آنکہ کسب بوی تو از باد کردمے　　گل دیدمے و روئے ترا یاد کردمے

رفت آنکہ گر براہ تو جاں دادمے ز ذوق　　از موج گرد رہ نفس ایجاد کردمے

رفت آنکہ گر لبت نہ بنفریں نواختی　　رنجیدمے و عربدہ بنیاد کردمے

رفت آنکہ قیس را بستر گی ستودمے　　در چابکی ستائش فرہاد کردمے

رفت آنکہ جانب رخ و قدت گرفتمے　　در جلوہ بحث با گل و شمشاد کردمے

رفت آنکہ در ادائے سپاس پیام تو　　ہر گونہ مرغ صد قفس آزاد کردمے

اکنوں خود از وفائے تو آزار می کشم　　رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمے

بندم منہ ز طرہ کہ تابم نماندہ است　　رفت آنکہ خویش را بہ بلا شاد کردمے

آخر بداد گاہ دگر او فتاد کار　　رفت آنکہ از تو شکوہ بیداد کردمے

غالب ہوائے کعبہ بسر جا گرفتہ است

رفت آنکہ عزم خلخ و نوشاد کردمے

قصیدہ

اے ز وہمِ غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ

دیدہ بیرون و دروں از خویشتن پُر وانگہے
پردۂ رسمِ پرستش در میاں انداختہ

نقش بر خاتم ز حرفِ بے صدا انگیختہ
شور در عالم ز حُسنِ بے نشاں انداختہ

چرخ را در قالبِ ابداع در دَوار ریختہ
خاک را بر نطعِ پیدائی ستاں انداختہ

عاشقاں در موقفِ دار و رسن وا داشتہ
غازیاں در معرضِ تیغ و سناں انداختہ

غم چو گیرد سخت نتواں شکوہ از دلدار کرد
بہرِ آسانی اساسِ آسماں انداختہ

گل چو ماند دیر گردد بر دلش بازار سرد
بہرِ تجدیدِ طرب طرحِ خزاں انداختہ

آتشے از روئے گلہائے بہار افروختہ
شعلۂ در جانِ مرغِ صبح خواں انداختہ

جز بدیں آب آتشِ زردشت نتواں سرد کرد
کعبہ را جوئے بہشت از ناوداں انداختہ

جز بدیں الماس نتواں اینچنیں دُر دانہ سُفت
رخنہ از اسلام در کیشِ مغاں انداختہ

تا دریں صورت ز چشمِ دشمناں پنہاں بود
دوست را اندر طلسمِ امتحاں انداختہ

تا علاجِ خستگی آسائشِ دیگر دہد
خارہا در رہ گزارِ میہماں انداختہ

میسرایم نغمۂ توحید و شورِ ایں نوا
چوں نیم سوراخہا در استخواں انداختہ

ترکیب بند

آں سحر خیزم کہ مہ را در شبستاں دیدہ ام
شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام

انیّت خلوتخانۂ روحانیاں کانجا ز دور
زہرہ را اندر ردائے نور عریاں دیدہ ام

ہر یکے فارغ ز غیر و ہر یکے نازاں بخویش
لولئے را در دو عشرت گہ دو مہماں دیدہ ام

ہر گز اے ناداں برسوائی نہ بندی دل کہ من
ماہ را در ثور و کیواں را بہ میزاں دیدہ ام

رفتہ ام زاں پس بسیر باغ و مرغا نزا بباغ
سر بر سم خواب زیرِ بال پنہاں دیدہ ام

کلک موج نکہتِ گل دم ز گردش نازدہ
نامۂ فیض سحر بنوشتہ عنواں دیدہ ام

شانۂ بادِ سحرگاہی بہ جنبش نامدہ
طرۂ سنبل ببالیں بر پریشاں دیدہ ام

باد سرمستانہ می جنبید و شبنم میچکید
غنچہ را در رخت خواب آلودہ داماں دیدہ ام

صبح اول گو بمہ روئے کس نیاورد از حیا
صبح ثانی را بریں ہنگامہ خنداں دیدہ ام

محرمِ رازِ نہانِ روزگارم کردہ اند
تا بجرم فہم گوش تنہد خلق خوارم کردہ اند

روشناس چرخ در جمع اسیرانش منم
نور چشم روزن دیوار زندانش منم

ثابت و سیارۂ گردوں را رصد بستم بعلم
رشتۂ تسبیح گوہرہائے غلطانش منم

نے بدانش کامیاب و نے بسختی تنگدل
شرمسارِ کوشش برجیس و کیوانش منم

در یتیمی شہرۂ دہر از تہیدستیست چرخ
رفتہ مسکیں راز یاد و گنج پنہانش منم

تیر نازد گر بہ ادریسی بخاک اندازمش
زہرہ نازد گر بہ بلقیسی سلیمانش منم

کعبہ با من از مروت عذر خواہ پائے ریش
ورادب شرمندۂ خارِ مغیلانش منم

در غریبی خویش را از غصہ در دل میخلم
خوردہ ام از شست غم تیر کہ پیکانش منم

نوش چوں راہ بہم گیرد ادا فہمش نیم
نیش چوں مغز دلم کاود زباندانش منم

ماندہ ام تنہا بکنج از دورباش پاس وضع
خانۂ دارم کہ پندارند دربانش منم

پایۂ من جز بچشم من نیاید در نظر
از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

مرد نبود کز ستم بر خاطرش بارے رسد
ہم ز خود رنجم گرم از دشمن آزارے رسد

در رہ یارم ز رشک پائے رہ پیمائے خود
خوں فتد در دل ز زخمے کز سر خارے رسد

یخ فروشم در تموز و کلبہ دور از چارسوست
میرود سرمایہ از کف تا خریدارے رسد

راحت ما را ز بیرنگی برات آوردہ اند
بت پرستاں را سلام از نقش دیوارے رسد

دانش آں باشد کہ چشم دل بحق بینا شود
نے گماں باطلے کز وہم و پندارے رسد

طور دخل طور نبود گرچہ در خرگاہ خویش
ہر کس افروزد چراغے چوں شب تارے رسد

از دم باد سحرگاہی دل آساید ولے
جاں فزاتر باشد آں کز یاسمن زارے رسد

خوش بود دریوزۂ فیض الٰہی از علیؓ
گرچہ از ہر در نصیب ہر طلبگارے رسد

کہنہ دانم گر دہندم طیلساں مشتری
تازہ گردم از ردائے خواجہ گر تارے رسد

عاشقم لیکن ندانی کز خرد بیگانہ ام
ہوشیارم با خدا و با علی دیوانہ ام

نوحہ

وقتست کہ در پیچ و خمِ نوحہ سرائی — سوز و نفسِ نوحہ گر از تلخ نوائی

وقتست کہ در سینہ زنی آل عبا را — سرپنجہ حنائی شود و رنگ ہوائی

وقتست کہ جبریل ز ہمسائگی درد — غم را ز دلِ فاطمہ خواہد بگدائی

وقتست کہ آں پردگیاں کز رہِ تعظیم — بر درگہِ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی

از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آئند — چوں شعلہ دخاں بر سرِ شاں کردہ ردائی

جانہا ہمہ افسردۂ تشویشِ اسیری — دلہا ہمہ خوں گشتۂ اندوہ رہائی

اے چرخ چہ آں شد دگر از بہر چہ گردی

اے خاک چہ ایں شد دگر آسودہ چرائی

خوں گرد و فرو ریز اگر صاحب بصری

برخیز و بجوں غلط گر از اہلِ وفائی

تنہاست حسین ابنِ علی در صفِ اعدا — اکبر تو کجا رفتی و عباس کجائی

توقیع شفاعت کہ پیمبر ز خدا داشت — از خونِ حسین ابنِ علی یافت روائی

فریاد از اں حاملِ منشورِ امامت — فریاد از اں نسخۂ اسرارِ خدائی

فریاد از اں زاری و خونابہ فشانی — فریاد از اں خواری و بے برگ و نوائی

فریاد ز بیچارگی و خستہ درونی — فریاد ز آوارگی و بے سر و پائی

غالب جگرے خوں کن واز دیدہ فرو بار
گر روئے شناس غم شاہ شہدائی!

قصیدہ

ردیف شعر ازاں کردم اختیار گرہ — کہ از منست برابروئے شہریار گرہ
گرہ کشائے رموز خرد بہا در شاہ — کہ پیش ناخن تدبیر اوست خوار گرہ
ایا شہنشہ کشور کشائے دشمن بند — زبندہ در خم ابرو روا مدار گرہ
کہ چوں بدیں صفت اندر ضمیر من گذری — بہ پیچ و تاب دلم را دہد فشار گرہ
دلست تنگ ازاں رو مشو شم کہ مباد — شود ز تنگیِ جا در دلم فگار گرہ
بد لکشائی گفتار من کہ غالب را — مزن برشتۂ امید زینہار گرہ
ازیں گرہ کہ برابرو زدی چرا ترسم — کہ در دولت زصفا نیست پائدار گرہ

نشاط سالِ نو و جشن ایں ہمایوں سال
بروز ناصیۂ شاہِ نامدار گرہ

خطاب بہ ذوق

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتۂ — کے برگوئی فلاں در شعر ہمسنگ منست
نیست نقصاں یکدو جزو ست ار سواد ریختہ — کاں دہِ شم برگ زنخلستان فرہنگ منست

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال — مانی و ارژنگم و آں نسخۂ ارژنگ منست

کے درخشد جوہر آئینہ تا باقیست زنگ — صیقلی آئینہ ام ایں جوہر آں زنگ منست

ہاں من و یزداں بنائے شکوہ بر مہر و وفاست — تا نہ پنداری بپرخاش تو آہنگ منست

دوست بودی شکوہ سر کردم ولے جرم تو نیست — کانیہمہ بیداد بر من از دلِ تنگ منست

بخت من ناساز و خوئے دوست زاں ناسازتر — تا چہ پیش آید کنوں با بخت خود جنگ منست

دشمنی را ہمعنی شرط ست وآں دانی کہ نیست — از تو بنود نغمہ ور سازے کہ در چنگ منست

درسخن چوں ہمزباں و ہمنوائے من نۂ — چوں دلت را پیچ و تاب از رشک آہنگ منست

راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید — ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ منست

میفرستم تا نظرگاہ جہاندار ایں ورق — نامہ بر بادا اگر خود طائر رنگ منست

دیدہ ور سلطاں سراج الدیں بہادر شہ کہ او — آں شرر بیند کہ پنہاں در رگِ سنگ منست

جم حشم شاہے کہ در ہنگامۂ عرضِ سپاہ — میتواند گفت دارا را کہ سرہنگ منست

انوری و عرفی و خاقانی سلطاں منم — پادشہ طہمورث و جمشید و ہوشنگ منست

شاہ میداند کہ من مداح شاہم باک نیست — گر تو اندیشی کہ ایں دستانِ نیرنگ منست

از ادب دورم ز خاقاں ورنہ در اظہار قرب — خطوہ و گام تو گوئی میل و فرسنگ منست

مقطع ایں قطعہ زیں مصرع مصرّع بادو بس

ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ منست

مرثیۂ شاہزادہ

اے دل بچشم زخم حوادث فگار شو — اے چشم از تراوش دل اشکبار شو
اے خوں بدیدہ دُر رو گداز جگر فرست — اے دم بسینہ دود چراغِ مزار شو
اے لب بنوحہ نالۂ جانکاہ سازدہ — اے سر بغصہ خاک سرِ رہگزار شو
اے خاک چرخ گر نتواں زد زجا در آئے — اے چرخ خاک گر نتواں شد غبار شو
اے نو بہار چوں تن بسمل بخوں بغلط — اے روزگا چوں شب بے ماہ تار شو
اے ماہتاب روی بہ سیلی کبود کن — اے آفتاب داغ دلِ روزگار شو
اے فتنہ باد صبح وزید اینقدر مخسپ — اے رستخیز وقت رسید آشکار شو

آہ ایں چہ سیل بود کہ مارا از سر گذشت
تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گذشت

بگذر کہ بر من و تو جفا کرد روزگار — با پادشاہ عہد چہا کرد روزگار
شاہ سخن سرائے سخنور نواز را — در بزم عیش نوحہ سرا کرد روزگار
شاخیکہ بود موسم آتش کہ بُر بُہ — از نخل عمر شاہ جدا کرد روزگار
مرگ اینچنیں رخ و تن نازک ندیدہ بود — کام اجل بہدیہ روا کرد روزگار
شہزادہ خرد سال و بود روزگار پیر — شوخی بشاہزادہ چرا کرد روزگار
فرزند بادشہ نشناسد معانقہ — آغوش گور بہر چہ وا کرد روزگار

اے آنکساں کہ خاک رہ شہریار را توجیہ آبروئے شما کرد روزگار

ہر چند بے اجل نتواں ہیچگاہ مُرد
آتش بخود زنید کہ فرخندہ شاہ مُرد

اے قوم خویش را بشکیب امتحان کنید این کار را بشیوۂ کار آگہان کنید
طفلست شاہزادۂ و در رہ خطر بسیست منعش ز عزم رہروئی آنجہاں کنید
از میوہ و گل آنچہ دلش خواہد آں دہید از حیلہ آنچہ رائے شما باشد آں کنید
ہر حرف دلنشیں کہ بگوئید و نشنود آں گفتہ را بعربدہ خاطر نشاں کنید
ورخود ز رفتنش نتوانید باز داشت بیخود شوید جامہ درید و فغاں کنید
گیرید دشنہ درکف و ہم بر جگر زنید تا سینہ را ز دیدہ فزوں خونچکاں کنید
زنہار پیش شاہ مگوئید و بیخبر تابوت را بجانب مرقد رواں کنید

اے اہلِ شہر مدفن ایں دودماں کجاست
خاکم بفرق خوابگہ خسرواں کجاست

اے رہ نورد عالم بالا چگونۂ ما بے تو در ہمیم تو بے ما چگونۂ
از سایہ در غم تو سیہ پوش شد ہما اے خفتہ در نشیمن عنقا چگونۂ
زاں پس کہ باتو آب و ہوائے جہاں نساخت در روضۂ جناں بتماشا چگونۂ
با گلرخانِ دہر وفائے نداشتی با حوریان آئینہ سیما چگونۂ
ما بیخوداں بحلقۂ ماتم نشستہ ایم از خویشتن بگوئے کہ تنہا چگونۂ

بے مطرب و ندیم و غلامان خردسال | بے باغ و قلعۂ و لب دریا چگونۂ
بعد از تو شاہ خیل ترا بر قرار داشت | اینجا عزیز بودۂ آنجا چگونۂ

اے بعد مرگ راتبہ خوار تو عالمے
پروانۂ چراغ مزارِ تو عالمے

قصیدہ

داد کو تا ستم بر اندازد | طرح نۂ چرخ دیگر اندازد
در رگ ساز من نوائے ہست | کہ بہر غولہ اخگر اندازد
زیں نوائے شرر فشاں ترسم | کاتش اندر نواگر اندازد
سرگزشتیست بر زباں کہ زباں | بر من از خویش خنجر اندازد
بامداداں کہ آسماں خواہد | کاہر من راز پا در اندازد
لمعۂ مہر در رگ جانش | خلۂ نوک نشتر اندازد
تا ز چستی بہ مبحث کشتن | نون مصدر ز مصدر اندازد
زنگبار ی زنے بماتم دیو | از رخ زشت چادر اندازد
وانگہ از زیر گوشۂ چادر | گوہر آمود معجر اندازد
گوہر آما پرند در پیچد | از بر و دوش گوہر اندازد
گچہ و بارہ گہ فرو فگند | گاہ خلخال و پرگر اندازد

رہروان لوامع سحری — ہرچہ خاتون ز زیور اندازد
بربایند و ناپدید کنند — خود فلک طرح دیگر اندازد
ناگرفت آں بساط برچینند — ناگریز آں بہ نابر اندازد
چوں عرق کز جبیں چکد در سعی — جبہۂ چرخ اختر اندازد
ہرکہ بینی ہمی بروے طناب — جامۂ را کہ شد تر اندازد
رخت نمناک خویشتن گردوں — می برد تا بہ محور اندازد
تابش مہر و جنبش ذرات — شور در ہفت کشور اندازد
مہ چو طفلے کہ ترسد از غوغا — خویشتن را ز منظر اندازد
سایہ را پایۂ نمودارے — با دبند ار در سر اندازد
باد کز بوئے بادہ مست شود — پردہ از روئے گل بر اندازد
ساقئ انجمن یگہ خیز ست — بادہ در کاسۂ زر اندازد
مطرب بزم زخمہ اش تیز ست — تاب در زلف مزمر اندازد
کلک من بیں کہ ہر نفس جانے — در رگ تار مسطر اندازد
در سیہ مستی و سر اندازی — ہر کجا ہرچہ در خور اندازد
با سلیماں زندم از بلقیس — دررہ مور شکر اندازد
با زلیخا اگر شود ہمراز — طرح کاخ مصوّر اندازد
با سمندر اگر بود دمساز — ہمہ آتش بدفتر اندازد

از نوائے کہ در غزل سنجد | حلقہ در گوش را در اندازد
از طرازے کہ در دعا بندد | بر ورق مشک از فر اندازد
آں قدر نئی کہ در زمانہ تو | چرخ راکہنگی بر اندازد

تا قضا بہر آستانۂ تو
طرح نہ چرخ دیگر اندازد

سالکانِ طریقت

رہرواں چوں گہر آبلۂ پا بینند | پائے را پایۂ فرا تر ز ثریا بینند
ہر چہ در دیدہ عیانست نگاہش دارند | ہر چہ در سینہ نہانست ز سیما بینند
راستی از رقم صفحۂ ہستی خوانند | نقش کج بر ورق شہپرِ عنقا بینند
راز زیں دیدہ وراں جوئے کہ از دیدوری | نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند
راہ زیں دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی | جادہ چوں نبض تپاں در تن صحرا بینند
شررے راکہ بنا گاہ بدر خواہد جست | زخمہ کردا بتارِ رگ خارا بینند
قطرہ راکہ ہر آئینہ گہر خواہد بست | صورت آبلۂ بر چہرۂ دریا بینند
شام در کوکبۂ صبح نمایاں نگرند | روز در منظر خفاش ہویدا بینند
وحشت تفرقہ در کاخ مصور سنجند | مجمع انس بہ نے بست زلیخا بینند
ہر چہ گوید عجم از خسرو شیریں شنوند | ہر چہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند

نستوہند اگر ہمہ مجنوں گردند | نخروشند اگر محمل لیلا بینند
قشقہ را رونق ہنگامۂ ہندو خوانند | بادہ را شمع طرب خانۂ ترسا بینند
برسم و زمزمہ و قشقہ و زنار و صلیب | خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلا بینند
دل نہ بندند بہ نیرنگ و دریں پردہ و رنگ | ہر چہ بینند بعنواں تماشا بینند
ہر چہ در سو نتواں یافت بہر سو یابند | ہر چہ در جا نتواں دید بہر جا بینند

بُردہ از یاد کہ دنیاست نمودے بود
ایں دل افروز نمودے کہ ز دنیا بینند

راز و نیاز

بروزے کہ مردم شوند انجمن | شود تازہ پیوند جاں ہا بہ تن
رواں را بہ نیکی نوازندگاں | بسرمایۂ خویش نازندگاں
گہرہائے شہوار پیش آورند | فرو ہیدہ کردار پیش آورند
ز نورے کہ ریزند و خرمن کنند | جہاں را بخود چشم روشن کنند
بہنگامہ با ایں جگر گوشگاں | درآیند مشتے جگر توشگاں
ز حسرت بدل بردہ دنداں فرو | ز خجلت سر اندر گریباں فرو
درآں حلقہ من باشم و سینۂ | نہ غمہائے ایام گنجینۂ
درآب و درآتش بسر بردۂ | ز دشوارئ زیستن مردۂ

بہ بخشائے بر ناکیبہائے من | تہیدست و درماندہ ام وائے من
بدوشش نزا ز دمنہ بارِ من | نسنجیدہ بگزار کردار من
بکردار سنجی میفزائے رنج | گرانباریئے دردِ عمرم بسنج
اگر دیگراں را بود گفت و کرد | مرا مایۂ عمر رنجست و درد
وگر ہمچنیں ست فرجام کار | کہ می باید از کردہ راندن شمار
مرا نیز یارائے گفتار دہ | چو گویم بر آں گفتہ زنہار دہ
دریں خستگی پوزش از من مجو | بود بندۂ خستہ گستاخ گو
دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود | چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود
زباں گرچہ من دارم اما ز تست | بہ تست ارچہ گفتارم اما ز تست
ہمانا تو دانی کہ کافر نیم | پرستار خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را بہ اہرمنی | نبردم ز کس مایہ در رہزنی
نگرمے کہ آتش بگورم از وست | بہنگامہ پرداز مورم از وست
من اندوہگیں و مے اندہ ربا | چہ میکردم اے بندہ پرور خدا
حساب مے و رامش و رنگ و بوے | ز جمشید و بہرام و پرویز جوے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند | دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ | بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ | نہ دستانسرائے نہ جانانۂ

نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط — نہ غوغائے رامشگراں در رباط
شبانگہ بہ مے رہنمونم شدے — سحرگہ طلبگار خونم شدے
تمنائے معشوقۂ بادہ نوش — تقاضائے بیہودۂ میفروش
چہ گویم چو ہنگام گفتن گزشت — ز عمر گرانمایہ بر من گزشت
بسا روزگاں را بد لدادگی — بسا نوبہاراں بہ بی بادگی
بسا روز باراں و شبہائے ماہ — کہ بودست بی مے بچشمم سیاہ
افقہا پر از ابر بہمن مہی — سفالینہ جام من از مے تہی
بہاراں و من در غم برگ و ساز — در خانہ از بینوائی فراز
جہاں از گل و لالہ پر بو و رنگ — من و حجرہ و دامنے زیر سنگ
دم عیش جز رقص بسمل نبود — باندازۂ خواہش دل نبود
اگر تافتم رشتۂ گوہر شکست — دگر یافتم بادہ ساغر شکست
سر از منت ناکساں زیر خاک — لب از خاکبوس خساں چاک چاک
بہ گیتی درم بینوا داشتی — دلم را اسیر ہوا داشتی
نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد — بہر بار زر ہیل بارم دہد
کہ چوں ہیل زانجا برانگیزمے — نہ زرش بہ گدایاں فرو ریزمے
نہ نازک نگارے کہ نازش کشم — بہر بوسہ زلف درازش کشم
چو زاں غمزہ نیشے بدل بر خورد — رگ جان غم نوک نشتر خورد

چو آں نامرادی بیاد آیدم | بفردوس ہم دل نیاسایدم

بہشت

صبوحی خورم گر شراب طہور | کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شب روِ ہائے مستانہ کو | بہنگامہ غوغائے مستانہ کو
دراں پاک میخانۂ بیخروش | چہ گنجائشِ شورشِ نائے و نوش
سیہ مستئ ابر و باراں کجا | خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ | غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار | چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسہ اینش کجا | فریبد بسوگند و بینش کجا
برد حکم و نبود لبش تلخ گو | دہد کام و نبود دلش کامجو
نظر بازی و ذوق دیدار کو | بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزومند دلالۂ | نہ دل تشنۂ ماہ پرکالۂ
ازینہا کہ پیوستہ میخواست دل | ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل

معراج

قدم زد براہے کہ رفتن نداشت | نگہبان و ہمراہ و راہزن نداشت

درآنجا کہ از روئے فرہنگ و رائے — بجا باشد ار خود نگویند جائے

جہت را دم خود نمائی نماند — زمان و مکاں را روائی نماند

غبار نظر شد ذرہ ناپدید — سراپائے بینندہ شد جملہ دید

درآورد بے کلفت سمت و سوئے — بنور السمٰوات والارض روئے

تماشا ہلاک جمال بسیط — فروغ نظر موجہ زاں محیط

شنیدن شہید کلام شگرف — منزہ ز آمیزش صوت و حرف

کلامے بہ بیرنگئ ذات علم — شنیدن بعقل اندر اثبات علم

نخستیں و راز لا کشود آں رواق — نہ اِلّا بصدر اندرش بیشتاق

بہ اِلّا رسید و ز لا در گزشت — رسیدن ز پیوند جا در گزشت

دراں خلوت آباد راز و نیاز — بروے دوئی بود چوں در فراز

نماند اندر احمدؐ ز میمش اثر — کہ آں حلقہ بود بیرون در

احد جلوہ گر با شیون و صفات — نبی محو حق چوں صفت عین ذات

دو عالم خروشش نواہائے راز — ولیکن ہماں در خم بند ساز

ورق در ورق نکتۂ دلپذیر — ولیکن ہماں در خیال دبیر

ز گفتن شنیدن جدائی نداشت — نمودن ز دیدن جدائی نداشت

چو اندازۂ ہر نمائش گرفت — ز وحدت بکثرت گرائش گرفت

بحکم تقاضائے حبِّ ظہور — تنزل در اندیشہ آورد زور

احد کسوت احمدی یافتہ | دم دولت سرمدی یافتہ

محفل شراب

ہوائے انجمن آرائیم فتاد بسر | شراب خوارہ تنے چند خواہم از احباب
کہ مے خورند چو از بادہ رخ برافروزند | بسوز رشک دل حاسداں کنند کباب
نوائے ندیم و نوائے ساقی و نوائے مطرب | بسوز عود و بہ پیمانہ مے و بساز رباب
کجائی اے مہ خورشید جلوہ ہیں ساغر! | کجائی اے بت ناہید نغمہ ہاں مضراب
معاشران نکونام و فرخی فرجام | پس از ادائے سپاس مفتح الابواب
بزمگاہ بیارید یک دو گلشن گل | بخاک راہ بپاشید یک دو دجلہ گلاب
بنام خویش بگیتی زنید نقش مراد | بزم عیش بساغر کنید لعل مذاب
بخاک راہ ز مستی مے آں قدر ریزید | کہ تا ابد دمد از خاک لالۂ شاداب
دہید بادۂ گلفام و چوں سلام کنم | ہماں بہ بادہ سلام مرا دہید جواب
بیفگنید قنا دیل آبگینہ ز کف | بہ سقف حجرہ بہ بندید زہرہ و مہتاب
زنید چشمک آشام مے بیکدیگر | دمے کہ بردمد از بادہ در پیالہ حباب
دو جام بادۂ شیریں بمن دہید کہ من | نہ خوش بود کہ بوم تلخکام زہر عتاب
یکے بشادیٔ تسخیر صوبۂ لاہور | دوم بفرخیٔ عمر و دولت نواب
جہاں ستان و جہاں بخش ہارڈنگ کہ ہست | شہاب رمح و فلک توسن و ہلال رکاب

غالبؔ کا اسیریہ

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم — غمِ دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم

بہ نوائے کہ ز مضراب چکاند خوناب — خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم

در خرابی بہ جہاں میکدہ بنیاد نہم — در اسیری بہ سخن دعوئے اعجاز کنم

بے مشقت نبود قید، بہ شعر آویزم — روزکے چند رسن تابیٔ آواز کنم

چوں سرایم سخن انصاف ز مجرم خواہم — چوں نویسم غزل اندیشہ ز غماز کنم

تا چہ افسوں بہ خود از ہیبتِ صیاد دمم — تا چہ خوں در جگر از حسرتِ پرواز کنم

یارِ دیرینہ، قدم رنجہ بفرما کاینجا — آں نگنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم

ہائے ناسازیِ طالع کہ بہ من گردد باز — با خرد شکوہ گر از طالعِ ناساز کنم

اہلِ زنداں بسر و چشم خودم جا دادند — تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم

ہلہ، دزدانِ گرفتار، وفا نیست بشہر — خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم

من گرفتارم و ایں دائرہ دوزخ تن تن — در سخن پیرویِ شیوۂ ایجاز کنم

گرچہ توقیعِ گرفتاریِ جاویدم نیست
لیکن از دہر دگر خوشدلی امیدم نیست

شمع ہر چند بہ ہر زاویہ آساں سوزد — خوشتر آنست کہ بر نطع در ایواں سوزد

عودِ من ہرزہ مسوزید و گر سوختنی ست — بگزارید کہ در مجمعِ سلطاں سوزد

خانہ ام ز آتشِ بیدادِ عدو سوخت دریغ
سوختن داشت ز شمعیکہ شبستاں سوزد

منم آں خستہ کہ گر زخمِ جگر بنمایم
بر من از مہرِ دلِ گبر و مسلماں سوزد

منم آں سوختہ خرمن کہ ز افسانۂ من
نفسِ راہرو و رہزن و دہقاں سوزد

منم آں قیس کہ گر سوئے من آید لیلیٰ
محمل از شعلۂ آوازِ حدی خواں سوزد

تا چساں گزرد روز بہ شبہا دریاب
از چراغے کہ عسس بر درِ زنداں سوزد

تنم از بندِ در انبوہِ رقیباں لرزد
دلم از دردِ برا ندوہِ اسیراں سوزد

از نمِ دیدۂ من فتنۂ طوفاں خیزد
از تفِ نالۂ من جوہرِ کیواں سوزد

آہ ازیں خانہ کہ روشن نشود در شبِ تار
جز بداں خواب کہ در چشمِ نگہباں سوزد

آہ ازیں خانہ کہ در روئے نواں یافت ہوا
جز سمومے کہ خس و خارِ بیاباں سوزد

اے کہ در رز اویہ شبہا بجراغم شمری
دلم از سینہ بر دل آر کہ داغم شمری

پاسباناں بہم آئید کہ من می آیم
در زنداں بکشائید کہ من می آیم

ہر کہ دیدے بدرِ خویش سپاسم گفتے
خیر مقدم بسرائید کہ من می آیم

جادہ نشناسم و ز انبوہِ شماری ترسم
راہم از دور نمائید کہ من می آیم

رہروِ جادۂ تسلیم درشتی نہ کند
سخت گیر ند چرائید کہ من می آیم

خستہ تن در رہ و تعذیب ضرور است اینجا
نمک آرید و بسائید کہ من می آیم

عارضِ خاک بپاشیدنِ خوں تازہ کنید
رونقِ خانہ فزائید کہ من می آیم

چوں من آیم بشما شکوۂ گردوں نہ رواست — زیں سپس ثمرا ز شمائید کہ من می آیم

ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید — بخت خود را بستائید کہ من می آیم

تا بدروازۂ زنداں پئے آوردنِ من — قدمے رنجہ نمائید کہ من می آیم

چوں سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من است — بہرہ از من بربائید کہ من می آیم

بخود از شوق ببالید کہ خود باز رسید — بمن از مہر گرائید کہ من می آیم

بسکہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بدنامیِ من

غیر نشگفت، خورد گر غمِ ناکامیِ من

آنچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی — آفتاب از جہتِ قبلہ بر آمد گوئی

دل و دستیکہ مرا بود فرو ماندنیہ کار — شب و روزیکہ مرا بود بسر آمد گوئی

سرگزشتم ہمہ رنج و الم آرد گفتی — سرنوشتم ہمہ خوف و خطر آمد گوئی

بہرۂ اہلِ جہاں چوں ز جہاں درد و غم است — بہرۂ من ز جہاں بیشتر آمد گوئی

خستن و بستنِ من حد کسے نیست برو — بر من اینہا ز قضا و قدر آمد گوئی

ہنرم را نتواں کرد بہ خستن ضایع — خستگی غازۂ روئے ہنر آمد گوئی

غم دل داشتم اینک غمِ جانم دادند — زخم را زخم دگر بر اثر آمد گوئی

چرخ یکبارِ دگر ما نمایہ بزنداں خواہد — یوسف از قیدِ زلیخا بدر آمد گوئی

مژہ امشب ز کجا اینہمہ خوناب ورد — ایں چنیں گرم ز زخمِ جگر آمد گوئی

خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسشِ وے — پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادارِ من است

خواجہ دانم کہ بپے روز نمانم در بند
لیک دانی کہ شب از روز ندانم در بند

نہ پسندم کہ کس آید نتوانم کہ روم
جانبِ در بہ چہ حسرت نگرانم در بند

خستہ ام خستہ من و دعویٔ تمکیں حاشا
بند سخت ست تپیدن نتوانم در بند

شادم از بند کہ از بندِ معاش آزادم
از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

آمدہ و خامہ بیارید و بحل بنویسید
خواب از بخت ہمی دام ستانم در بند

یارب این گوہرِ معنی کہ فشانم ز کجاست
بند بر دل بود و نیست زبانم در بند

ہر کس از بندِ گران نالد و ناکس کہ منم
نالم از خویش کہ بر خویش گرانم در بند

خوئے خوش بہر مصیبت زدہ رنجے دگر است
رنجہ از دیدنِ رنج دگرانم در بند

رفتہ در بارۂ من حکم کہ باور دو دریغ
شش مہ از عمرِ گرامی گزرانم در بند

اگر این است خود آنست کہ عید الضحیٰ
گزرد نیز چو عیدِ رمضانم در بند

مدتِ قید اگر در نظرم نیست چرا
خونِ دل از مژہ بے صرفہ چکانم در بند

نیستم طفل کہ در بندِ رہائی باشم
ہم ز ذوق ست کہ در سلسلہ غائی باشم

من نہ آنم کہ ازین سلسلہ تنگم نبود
چکنم چون بقضا زہرہ جنگم نبود

زین دو رنگ آمدہ صد رنگ خرابی ظہور
گلہ نیست کہ از بخت دو رنگم نبود

راز دانا، غم رسوائی جاوید بلاست | بہر آزار غم از قید فرنگم نبود
لرزہ از خوف دریں حجرہ کہ از خشت و گِل است | ورنہ در دل خطر از کام نہنگم نبود
منم آئینہ و ایں حادثہ زنگ ست وے | تاب بدنامی آلایشِ زنگم نبود
ہمدما، دارم امیدِ رہائی در بند | دامن از بعد رہائی تہ سنگم نبود
جور را عار ورد از دل برہائی لیکن | طعن احباب کم از زخم خدنگم نبود
بہ شگافِ قلم از سینہ بروں می ریزم | بسکہ گنجائیِ غم در دلِ تنگم نبود
حاش للہ کہ دریں سلسلہ باشم خوشنود | چکنم چوں سر ایں رشتہ بچنگم نبود

بصر یہ تسلیم خویش بود مستی من
اندریں بند گراں بیں دستکد ستیِ من

ہمدماں، دردلم از دید نہانید ہمہ | غالب غمزدہ را روح دروانید ہمہ
للہ الحمد کہ در عیش و نشاطید ہمہ | للہ الشکر کہ با شوکت و شانید ہمہ
ہم در آئینِ نظر سحر طرازید ہمہ | ہم در اقلیم سخن شاہ نشانید ہمہ
چشمِ بد دور کہ فرخندہ لقائید ہمہ | شاد باشید کہ فرخ گہرانید ہمہ
سود بینید، وفا دیدہ و لورید ہمہ | زندہ مانید، جفا تا لب و جانید ہمہ
من بکنجے خفتہ و بینم ہمہ بینید ہمہ | من جگر خستہ و دانم ہمہ دانید ہمہ
درمیاں ضابطۂ مہر و وفائے بود ست | من برنیم اکہ ہر آئینہ بر آنید ہمہ
روزے از مہر نگفتید فلانے چون ست | بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ

گر نباشم بجہاں خار و خسے کم گیرید | اینکہ سرو و سمن باغ جہانید ہمہ
چارہ گر نتواں کرد دعائے کافی ست | دل اگر نیست خداوند زبانید ہمہ
ہفت بند است کہ در بند رقم ساختہ ام | بنویسید و ببینید و بخوانید ہمہ

آں نباشم کہ بہر بزم ز من یاد آرید
دارم امید کہ در بزم سخن یاد آرید

سحرِ حلال

زخمہ بر تار رگ جاں میزنم | کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم
زخمہ بر تارم پریشاں میرود | کایں نواہائے پریشاں میزنم
چوں ندیدم کز نوائش خوں چکد | طعنہ بر مرغ سحر خواں میزنم
خامہ ہمراز دم گرم منست | آتش از نے در نیستاں میزنم
جوئے شیراز سنگ راندن ابلہی ست | بہر گوہر تیشہ بر کاں میزنم
دیگراں گر تیشہ بر کاں میزنند | من شبیخوں بر بدخشاں میزنم
گریہ را در دل نشاطے دیگرست | خندہ بر بہائے خنداں میزنم
باز شوقم در خروش آوردہ است | بازہوئے ہمچو مستاں میزنم
رازدانِ خوے دہرم کردہ اند | خندہ بر دانا و ناداں میزنم
در خرابا تم ندید ستی خراب | بادہ پنداری کہ پنہاں میزنم

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام ‏ ‏ آشکارا دم ز عصیاں میزنم
بادہ در ابر بہاراں میزدم ‏ ‏ حالیا در تیرِ باراں میزنم
طعنہ بر دلق مے آلودم مزن ‏ ‏ نیست ساغر مے بہ مژگاں میزنم
غالبم از مے پرستی نگذرم ‏ ‏ غوطہ در گرداب طوفاں میزنم
تو درینجا بینی و من خود ہنوز ‏ ‏ جام مے در بزم اعیاں میزنم
در ترقی مے نگنجد گفتگو ‏ ‏ در تنزل دم ز عرفاں میزنم
می ستیزم با قضا از دیر باز ‏ ‏ خویش را بر تیغ عُریاں میزنم
لعب با شمشیر و خنجر مے کنم ‏ ‏ بوسہ بر ساطور و پیکاں میزنم
بر خرام زہرہ و رفتار تیر ‏ ‏ چشمکے دارم کہ پنہاں میزنم
گہ گہے کز پایہ می آیم فرود ‏ ‏ حرف با برجیس و کیواں میزنم
می بُرد از من قضا چنداں کہ من ‏ ‏ گوئے گردوں را بہ چوگاں میزنم

آرزو

از نکوئی نشاں نمے خواہم ‏ ‏ خویش را بدگماں نمیخواہم
زیست بے ذوق مرگ خوش نبود ‏ ‏ دل اگر رفت جاں نمیخواہم
باغبانم گرفت و خست و گذاشت ‏ ‏ جز بباغ آشیاں نمیخواہم
کس نمیتالد از فسانۂ من ‏ ‏ درد دل رایگاں نمیخواہم

ہیچکس سود من نمیخواہد — ہیچکس را زیاں نمیخواہم

ہر یکے دشمنیست دوست نما — یاری از اختراں نمیخواہم

آرزو عیب نیست خردہ مگر — خواہم اما چناں نمیخواہم

رنج صاحبدلاں روا نبود — بند اہل زباں نمیخواہم

دوشہا را فگار نپسندم — بارہا را گراں نمیخواہم

مور را بارگیر نپسندم — پشہ را پیلباں نمیخواہم

ہاں دہاں نیستم محال طلب — نو بہار از خزاں نمیخواہم

گہر افشانم و بہا طلبم — سیم و زر رائیگاں نمیخواہم

نتواں کرد با فلک پرخاش — خرد خردہ داں نمیخواہم

خستۂ چشم زخم خویشتنم — ناوکے بر نشاں نمیخواہم

خو بہ بیداد کردہ ام غالب — عید نوشیرواں نمیخواہم

خواہشے چند مے کنم لیکن — کارہا را رواں نمیخواہم

پائے فرسودہ در رکاب وہنوز — دست خود بر عناں نمیخواہم

سخن از عالم دگر دارم — ہمدم و رازداں نمیخواہم

گر بود خود سروش وحی سرائے — با خودش ہمزباں نمیخواہم

سینہ صافم قلندرم مستم — راز خود را نہاں نمیخواہم

پایۂ در نظر نماند دگر — خویشتن را شباں نمیخواہم

یوسف از مصر گشتہ خوشدل و من | بہ تلافی جہاں نمیخواہم

بہ زلیخا شباب بخشیدند | بخت خود را جواں نمیخواہم

بر رُخِ حکمت موجبۂ حق | غازۂ امتحاں نمیخواہم

عین من ہر چہ اقتضا می کرد | خواستم غیر آں نمیخواہم

چوں حکایت بجائے خویش رسید | تن زدم داستاں نمیخواہم!

جواہراتِ پریشاں

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را | خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

نازم بہ صنمخانہ کہ شاہانِ جہاں جو | ہم بر درِ آں خانہ گزارند حشم را

چوں فاش شد آخر کہ ہم از خلق گرفتند | بیفائدہ از خلق نہفتند ارم را

رواست شور تشید و ترانہ مستاں را | بشرطِ آنکہ نگویند رازِ پنہاں را

نگیر خوردہ کزاں فرقہ ام کہ پندارند | سوادِ خالِ رخِ دوست داغِ عصیاں را

منم کہ بر دل و دینِ خود اعتمادم نیست | بہ نیم غمزہ ہم ایں را ربائے وہم آں را

گدائے ترک نژادم ز دودۂ سلجوق | فراخ تا نبود خواں نمی خورم ناں را

شود روانئ طبعم فزوں ز سختئ دہر | بسنگ تیز تواں کرد تیغِ بُرّاں را

بپایانِ محبت یاد می آرم زمانے را | کہ دل عہدِ وفا نابستہ وادادم دلستانے را

ندارم تابِ ضبطِ راز دمی ترسم ز رسوائی	مگر جویم ز بہرِ همزبانی بیزبانے را

گفتمش ذرہ بہ خورشید رسد گفت محال
گفتمش کوشش من در طلبش گفت رواست

عمرے بسیری گشت و بہاں بر سرِ جوراست	گویند بتاں را کہ وفا نیست چرا نیست
جنت نکند چارۂ افسردگیٔ دل	تعمیر باندازۂ ویرانیٔ ما نیست

انتظارِ جلوۂ ساقی کبابم می کند	مے بساغر آبِ حیواں و بہ مینا آتش ست
بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلا	قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست

ناچار با تغافل صیاد ساختم	پنداشتم کہ حلقۂ دام آشیانہ است
پابستۂ نوردِ خیالی چو وارسی	ہر عالمے ز عالمِ دیگر فسانہ ایست
غالب وگر ز منشاء آوارگی پرس	گفتم کہ جبہہ را ہوسِ آستانہ ایست

امشب آتشیں روئے گرمِ شرند خوانیہاست	کز لبش نوا ہر دم در شرر فشانیہاست
کشتۂ دل خویشم کز ستمگراں یکسر	دید دلفریبیہا گفت مہربانیہاست

بیخود بزیرِ سایۂ طوبیٰ غنودہ اند	شبگیرِ رہروانِ تمنا بلند نیست

ہم وعدہ و ہم منع زبخشش چہ حساب است	جاں نیست مگر نتواں داد شراب است
در مژدہ زجوئے عسل و کاخ زمرد	چیزے کہ بدبستگی ارزد مئے ناب است
از جلوہ بہنگامہ شکیبا نتواں شد	لب تشنۂ دیدار ترا خلد سراب است

شادی و غم ہمہ سرگشتہ تراز یکدگر اند	روزِ روشن بوداعِ شبِ تار آمد و رفت

اخترے خوشتر از نیم بجہاں میبایست — خود پیر مرا بخت جواں میبایست

بزمے کہ بہ آہنگ غزل بنشینیم — خاک گلبوئے و ہوا مشک فشاں میبایست

بہ تماشا بسبو بادہ ز دور آوردن — خانۂ من بسر کوئے مغاں میبایست

یا تمنائے من از خلد بریں نگزشتے — یا خود امید گہے درخور آں میبایست

گل فراواں و مے پر زور و دوشم بر بساط — خود بخود پیمانہ میگردید گردیدن نداشت

گر منافق وصل ناخوش ور موافق ہجر تلخ — دیدہ داغم کرد روئے دوستاں دیدن نداشت

برد آدم از امانت ہرچہ گردوں برنتافت — ریخت مے برخاک چوں جام گنجیدن نداشت

منت از دل نمیتواں برداشت — شکر ایزد کہ نالہ بے اثر است

قفس و دام را گناہے نیست — ریختن در نہاد بال و پر است

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند — ہم خزاں ہم بہار در گزر است

از یک سبو است بادہ و قسمت جدا جدا است — جمشید جام بر دو قلندر کدو گرفت

رضواں چو شہد و شیر بہ غالب حوالہ کرد — بیچارہ باز داد و مے مشکبو گرفت

دریں روش بچہ امید دل تواں بستن — میانۂ من و او شوق حائل افتاد است

در پردۂ رسوائی منصور نوائیست — رازت نشنودیم ازیں خلوتیاں ہیچ

بمن گرائے و وفا جو کہ سادہ بہ منشم — بسنگ ہر کہ دہد دل بغمزہ چوں ندہد

خون ہزار سادہ بگردن گرفتہ اند — آنانکہ گفتہ اند نکویاں نکو کنند

لب تشنہ جوئے آب شمارد سراب را — می زیبد ار بہستی اشیا غلو کنند

پیداست بے نیازیٔ عشق از فنائے ما   گر زورقے شکست ز دریا چہ می رود

با ما کہ محو لذتِ بیداد گشتہ ایم   دیگر سخن ز مہر و مدارا چہ می رود

ہفت آسماں بگردش و ما در میانہ ایم   غالب دگر بپرس کہ بر ما چہ می رود

دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند   کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروئے تو بود

اگر بدل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد   زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد

بوصل لطف باندازۂ تحمل کن   کہ مرگ تشنہ بود آب چوں ز سر گزرد

غالب ترا بدیر مسلماں شمردہ اند   آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

من سر از پائے نشناسم برہِ سعی و سپہر   ہر دم انجام مرا جلوۂ آغاز دہد

اندراں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گزشت   کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

از درختانِ خزاں دیدہ بناشم کاینہا   ناز بر تازگیٔ برگ و نوا نیز کنند

گفتہ باشی کہ نہ ما خواہش دیدار خطاست   ایں خطائیست کہ در روزِ جزا نیز کنند

تمکین برہمن دلم از کفر بگرداند   بتخانہ بتے خانہ برانداز ندارد

کسے با من چہ در صورت پرستی حرفِ دیں گوید   ز آذر گفت دانم گر ز صورت آفریں گوید

دلم در کعبہ از تنگی گرفت آوارۂ خواہم   کہ با من وسعت بتخانہ ہائے ہند و چیں گوید

بخشم ناسزا میگوید و از لطف گفتارش   گماں دارم کہ حرفِ دلنشینے بعد ازیں گوید

چرا راند غالب را ازاں در رہروے باید   کہ رازِ خلوتِ شہ با گدائے رہ نشیں گوید

گر رفتہ ام ز کوئے تو آساں نرفتہ ام   ایں قصہ از زبانِ عزیزاں شنیدہ ام

ذوقیست ہمدمی بفغاں بگذرم زرشک | خارِ رہت بہ پائے عزیزاں خلیدہ باد

بغرضِ شہرتِ خویش احتیاج ما دارد | چو شعلۂ کہ نیاز ادفتد بخار و خسش

زیاس گشتہ سگِ نفس درتلاشش دلیر | مگر زرشتۂ طولِ امل کنم مرسش

مرا بہ غیر زیک جنس در شمار آورد | فغاں کہ نیست زپروانہ فرق تا مگسش

خوشم کہ دوست خود آنما یہ بیوفا باشد | کہ در گماں نسگالم امیدگاہ کسش

بہ خلد از سردیٔ ہنگامہ خواہم | برافروزم بگردِ کوثر آتش

خنک شو قیکہ در دوزخ بغلطد | می آتش شیشہ آتش ساغر آتش

دلے دارم کہ در ہنگامۂ شوق | سرشتش دوزخ است گوہر آتش

بسانِ موج میبالم بہ طوفاں | برنگِ شعلہ می رقصم در آتش

درسلوک از ہرچہ پیش آمد گزشتن داشتم | کعبہ دیدم نقش پائے رہرواں نامیدمش

برامید شیوۂ صبر آزمائے زیستم | تو بریدی از من و من امتحاں نامیدمش

فرسودہ رسمہائے عزیزاں فرو گزار | در شورِ نوحہ خواں و بہ بزمِ عزا برقص

تکیہ برعہدِ زبانِ تو غلط بود غلط | کایں خود از طرزِ بیانِ تو غلط بود غلط

غنچہ را نیک نظر کردم ادائے دارد | دیں کہ ماند بدہانِ تو غلط بود غلط

ایں مسلّم کہ لبِ ہیچ نگوئے داری | خاطرِ ہیچدانِ تو غلط بود غلط

رنگ و بو بود ترا برگ و نوا بود مرا | رنگ و بو گشت تہِ من برگ و نوا گشت تلف

گیرم امروز دہی کام دل آں حسن کجا | اجرِ ناکامیٔ سی سالۂ ما گشت تلف

کاش پائے فلک از سیر بماندے غالب ۔۔۔ روزگارے کہ تلف گشت چرا گشت تلف

از عشق و حسنِ ما و تو باہمدگر در گفتگو ۔۔۔ خسرو و مجنوں یک طرف شیریں بہ لیلےٰ یکطرف

در ہیچ نسخہ معنیٔ لفظِ امید نیست ۔۔۔ فرہنگنامہ ہائے تمنّا نوشتہ ایم

میر بایم بوسہ و عرضِ ندامت میکنم ۔۔۔ اختراعے چند در آدابِ صحبت میکنم

سنگ و خشت از مسجدِ ویرانہ می آرم بہ شہر ۔۔۔ خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت میکنم

کردہ ام ایمانِ خود را دستمزدِ خویشتن ۔۔۔ می تراشم پیکر از سنگ و عبادت میکنم

آتش افروختہ و خلق بحیرت نگراں ۔۔۔ رخصتے دہ کہ بہنگامہ ہنر بنمایم

حسرتِ روئے ترا حور تلافی نکند ۔۔۔ از تو آخر بچہ امید شکیبا باشم

سر از حجابِ تعیّن اگر بدر آید ۔۔۔ چہ جلوہ ہا کہ بہر کیش میتواں کردن

مائیم و ذوقِ سجدہ چہ مسجد چہ بتکدہ ۔۔۔ در عشق نیست کفر ز ایماں شناختن

سرشک افشانیٔ چشمِ ترش بیں ۔۔۔ شہِ خوباں و گنجِ گوہرش بیں

ادائے دلستانی رفتہ از یاد ۔۔۔ ہوائے جانفشانی در سرش بیں

بجا ماندہ عتاب و غمزہ و ناز ۔۔۔ متاعِ ناروائے کشورش بیں

گزشت آں کز غمِ ما بیخبر بود ۔۔۔ بخویش از خویش بے پرواترش بیں

برسمِ چارہ جوئی پیشِ غالب
شکایت سنجِ چرخ و اخترش بیں!

رباعیات

راہیست ز عبد تا حضورِ اللہ — خواہی تو درازگیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبیٰ کہ نشاں ہا دارد — سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

زانجا کہ دلم بوہم دربند نبود — باہیچ علاقہ سخت پیوند نبود
مقصود من از کعبہ و آہنگِ سفر — جز ترکِ دیار و زن و فرزند نبود

در بزم نشاط خستگاں را چہ نشاط — از عربدہ پائے بستگاں را چہ نشاط
گر ابر شرابِ ناب بارد غالب — ما جام و سبو شکستگاں را چہ نشاط

کشتی از موج سوئے ساحل برود — رہرو از جادہ تا بمنزل برود
خود شکوہ دلیل رفع آزار بس است — آید بزباں ہر آنچہ از دل برود

اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش — آں روز کہ وقتِ باز پرس آید پیش
بگزار مرا کہ من حسابے دارم — با حسرتِ عیشہائے ناکردۂ خویش

گر دیدنِ زاہداں بجنت گستاخ — ویں دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ — مانند بہ بہائم و علف زار فراخ

در عالمِ بے زری کہ تلخ است حیات — طاعت نتواں کرد بامید نجات
اے کاش ز حق اشارتِ صوم و صلوٰۃ — بودے بوجودِ مال چوں حج و زکوٰت

بہ قول تو اعتماد نتواں کردن — خود را بگزاف شاد نتواں کردن

از کثرتِ وعدہ ہائے پے در پے تو
یک وعدہ درست یاد نتواں کردن

گر در طلبِ دوست بود پائے تو سست
غمگیں مغنو

ور خود باشی بہ جستجو تو چابک و چست
مغرور مشو

اخلاص بہ نسبت است و نسبت ازلیست
چوں شبنم و مہر

گر جذبہ توی فتاد پیوند درست
بیخود می رد

ہر چند تواں بے سرو ساماں بودن
بازیچۂ خوی زشت نتواں بودن

باللہ کہ زدشنۂ جگر سخت تر است
از کردۂ خویشتن پشیماں بودن

اے تیرہ زمیں کہ بودۂ بسترِ من
ہر خاک کہ باشست ہمہ بہ سرِ من

زر بہر کساں و بہر من دانہ و دام
اے مادر دیگراں و مادندرِ من

یارب تو کجائی کہ بہ ما زر نہ دہی
بیدر د خدائی کہ بہ ما زر نہ دہی

نے نے تو نہ غائبی و نے بیرحمی
بے مایہ چو مائی کہ بہ ما زر نہ دہی

باید کہ جہانے دگر آباد شود
تا کلبۂ ویرانِ من آباد شود

در عالم انبساط از من خوشتر
مطرب کہ بہ سوز دگراں شاد شود

اوراقِ زمانہ در نوشتیم و گزشت
در فنِ سخن یگانہ گشتیم و گزشت

مے بود دوائے مایۂ پیری غالب
زاں نیز بہ ناکام گزشتیم و گزشت

قطعہ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابے و سرودے

زنہار ازاں قوم مباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

ا۔ نوائے ظفر.............۱۸۴۴ تا ۱۸۵۵

ب۔ چراغِ سحری...........۱۸۵۷ تا ۱۸۶۷

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

غالبؔ

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یا رب یہ در گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا

گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہکے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شب غم ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے؟ اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جانگسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا! اگر ایکبار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا!
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا؟ کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف! یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

درخورِ قہر وغضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے؟ کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ، اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تیری یکتائی کا
روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں — تیرا بیمار، برا کیا ہے؟ گر اچھا نہ ہوا

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا — خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا — کام کا میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بنِ مو سے، دمِ ذکر، نہ ٹپکے خونناب — حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل؟ — کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب، کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما — کام گر رک گیا، روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے! — لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

میں اور بزمِ مے سے، یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا بحر، گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا
بعد یک عمرِ ورع، بار تو دیتا بارے کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالبؔ مرگیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا، کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو، تو پتہ بتلادوں کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہاں، کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا ۔۔۔ بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسف اسکو کہوں اور کچھ نہ کہے! خیر ہوئی ۔۔۔ گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا
دیکھکر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا؟ ۔۔۔ نالہ کرتا تھا، ولے طالب تاثیر بھی تھا
پیشہ میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام ۔۔۔ ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی ۔۔۔ آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق ۔۔۔ آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا ۔۔۔ بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب ۔۔۔ آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر، اور ہم بنا سکتے ۔۔۔ عرش سے پرے ہوتا، کاشکے مکاں اپنا
دے وہ جسقدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے ۔۔۔ بارے آشنا نکلا، انکا پاسباں اپنا
دردِ دل لکھوں کبتک؟ جاؤں انکو دکھلاؤں ۔۔۔ اُنگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا، آپنے عبث بدلا ۔۔۔ ننگ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی، کرلیا ہے دشمن کو ۔۔۔ دوست کی شکایت میں ہمنے ہمزباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب، دشمن آسماں اپنا

جور سے باز آئے پر، باز آئیں کیا
کہتے ہیں "ہم تجھکو مُنہ دکھلائیں کیا"

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں، لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟
یارب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ، کہ غالب کون ہے؛
کوئی بتلاؤ، کہ ہم بتلائیں کیا

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تُو نہ مرا گھر! کہے بغیر

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر، کہے بغیر

کام اُس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ، ہم
سر جائے، یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑونگا میں نہ اس بت کافر کو پُوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دُونا ہو التفات
سُنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

ہے بسکہ ہر اک انکے اشارے میں نشاں اور — کرتے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل انکو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند! — ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو، تو ہمیں کیا غم؟ جب اٹھیں گے — لے آئینگے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سبکدست ہوئے، بت شکنی میں — ہم ہیں، تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا — ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے — جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا — ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم چین — کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے — رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز — کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے — ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لائے ہی بنیگی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں — ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر، اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ راہ کو ترے، ہم مہرِ گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مرگیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہر چند جاں گدازیٔ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشت گرمیٔ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو، مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں؟"
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں ق ۱۸۴۷

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؛
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں؛

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں؛

میں، اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں — ق ۱۸۴۷ — آثار الصنادید

کل کیلئے کر آج نہ خسّت شراب میں — یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟ — گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھئے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے — جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم، اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی — ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بوتراب میں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں — مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ ترے رہگذر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں "کہ یہ بے ننگ و نام ہے"
یہ جانتا اگر، تو لُٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی ہر ایک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بُتِ بیداد گر کو میں

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنا ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ بزم میں
ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

نہیں کہ مجھکو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے؟
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُنکے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
"کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم انکے وعدہ کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا، کہ تم کہو اور وہ کہیں "کہ یاد نہیں"

دائم پڑا ہوا ترے در پہ نہیں ہوں میں؛
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب! زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؛
لال و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؛
رتبے میں ماہ و مہر سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھکو منعِ قدمبوس کس لئے؟
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہمکو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں

شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش، کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا، کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اِن پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اسکی ہیں
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سُنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

وُہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ، روکا میں نے اور سینہ میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب؟
یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہوگئیں

جانفزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں!
دیکھنا اِن بستیوں کو تم، کہ ویراں ہوگئیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دَیر نہیں، حرم نہیں، دَر نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

دشنۂ غمزہ جانستاں، ناوکِ ناز بے پناہ

تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونو ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں؟

حُسن اور اس پہ حُسنِ ظن، رہگئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں؟

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اسکی گلی میں جائے کیوں؟

غالبِ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

کعبہ میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو

آئی اگر بلا تو جگہ سے ٹلے نہیں
ایرا ہی دیکے ہم نے بچایا ہے کشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو ۔۔۔ کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال ۔۔۔ کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے ۔۔۔ حیا ہے اور یہی گومگو، تو کیوں کر ہو

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا ۔۔۔ بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خُو تو کیوں کر ہو

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ ۔۔۔ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا ۔۔۔ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

ہمیں پھر اُن سے امید اور انہیں ہماری قدر ۔۔۔ ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلّی کا ۔۔۔ نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار ۔۔۔ یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو

مجھے جنوں نہیں غالبؔ، ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو ۔۔۔ مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے ۔۔۔ نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو، اس جراحت پر ۔۔۔ کیا سینے میں جس نے خونچکاں، مژگانِ سوزن کو

خدا، شرمائے ہاتھوں کو، کہ رکھتے ہیں کشاکش میں ۔۔۔ کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں ۔۔۔ نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا ۔۔۔ کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برقِ خرمن کو

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں، تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھکو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے؟ کہ جویاں ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے، کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھکو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بیگنہ کُش و حق ناشناس ہیں؛
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے انکے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب، اور مرا بادشاہ ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں، کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رُسوا، لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو
وفا کیسی کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو، تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ؟
ہوئے تم دوست جس کے دُشمن اُس کا آسماں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں ؟
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی"

بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ

ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجّادہ رہن مے
مدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ او لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے؟

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو؟
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اُسنے سینکڑوں وعدے وفا کئے

غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا

مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سُنا کئے

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا
دل لیجئے مگر مرے ارماں نکال کے

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت اگر ملے

اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا!
تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس مُنہ سے جاوٴگے غالبؔ
شرم تمکو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار،
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ "مدعا کیا ہے"؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

"ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا"
اور درویش کی صدا کیا ہے؟

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"

ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی، سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے

جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب، کون سُنے طعنۂ نا یافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار، تو کعبہ ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھکو ڈبو آئے

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں، اور تری تقدیر کو رو آئے

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے،

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں، پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سُست رَو، جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا، اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا، کہ وہ ہے بارُبدِ بزمِ سخن ‌‌ ‌‌ شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم ‌‌ ق ‌‌ تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے ‌‌ ‌‌ تو وہ لشکر کا ترے نعلِ بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال ‌‌ ‌‌ آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں ‌‌ ‌‌ یہ بھی تیرا ہی کرم، ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم "کہ تو کیا ہے" ‌‌ ‌‌ تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا ‌‌ ‌‌ کوئی بتاؤ، کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے ‌‌ ‌‌ وگرنہ، خوفِ بدآموزیِ عدو، کیا ہے

چپک رہا ہے لہو سے بدن پہ پیراہن ‌‌ ‌‌ ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا ‌‌ ‌‌ کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل ‌‌ ‌‌ جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کیلئے ہمکو ہو بہشت عزیز ‌‌ ‌‌ سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار ‌‌ ‌‌ یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی ‌‌ ‌‌ تو کس امید پہ کہئے، کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

وگرنہ شہر میں، غالبؔ کی آبرو کیا ہے

میں انہیں چھیڑوں اور وہ کچھ نہ کہیں — چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو، — کاشکے، تم مرے لیے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

آہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ

کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

حسنِ مہ اگرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے — اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا — ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اسمیں سوا ملتا ہے — وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

اُنکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض — اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا — جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے — کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضرِ سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز — شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن

دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے — ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ، کہ یہ ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا؟ مگر یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر دیکھئے کب دن پھریں حمّام کے

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطّۂ خاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گُل کے دیکھنے کے لئے چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادپیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیندار نے شفا پائی

دیا ہے دل اگر اُسکو، بشر ہے کیا کہیے ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے
یہ ضد کہ آج نہ آئے، اور آئے بن نہ رہے قضا سے شکوہ ہمیں کسقدر ہے کیا کہیے

رہے ہے یوں گہہ و بے گہہ کہ کوئے دوست کو اب — اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہیے؟

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب — کہ بن کہے ہی اُنہیں سب خبر ہے، کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال — کہ یہ کہے، کہ سرِ رہ گزر ہے، کیا کہیے

تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال — ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا! کہیے

اُنہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیئے — ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے — ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن
سوائے اِسکے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے — چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں، قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے — جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر — ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی — اُسے یوسف کی بُوئے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں، دیکھو! نہ کہیو پھر کہ غافل تھے — شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو، بہتر — غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی — وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ، اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل — مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو؟ — ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا غالبؔ
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُسکو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اُسکو، مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہے"، تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا؛
ہاتھ آئیں، تو اُنہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون؟ کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُسنے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا، مرے ہوتے
گِھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں، نہ کیوں ہوں؟ — بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار — رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گذرے ہے، میں رشک سے گزرا — کیونکر کہوں، "لو نام نہ ان کا مرے آگے"
ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام — مجنوں کو برا کہتی ہے لیلےٰ مرے آگے
خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے — آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے
ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو — آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالبؔ کو برا کیوں کہو، اچھا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہیے" — تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں" — مجھے تو خو ہے، کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے
وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جاوے — نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے
نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں — وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے
جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے، — جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہیے
کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے — کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے — کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجئے — کٹے زبان، تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو الفت نہو، نگار تو ہے، — روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت نہو بہار تو ہے — طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو، گر برا کہے کوئی — نہ کہو، گر برا کرے کوئی

روک لو، گر غلط چلے کوئی — بخش دو، گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

بہت[1] سہی، غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے — غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے

---

[1] مطبوعہ دیوانوں میں، اس غزل کے فقط تین اشعار ہیں۔ بقیہ اشعار مرزا نے ۱۸۶۵ء میں اضافہ کئے۔ (اردوئے معلی صفحہ ۲۹۶)

تمہاری طرز روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے

لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے ہمدم!
وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہمکو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگذار کی

جب اُسکے دیکھنے کیلئے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اسکی گردن پہ
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھلجائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اسکو خط، تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سُنی نہیں آوازِ صُور کی

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اُسنے شکایت ضرور کی

غالبؔ. گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ
ہے یوں، کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے، کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ!
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

غزل مشاعرہ

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کیلئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر!
نہ تم، کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کیلئے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کیلئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملّت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرایش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے (سنہ ۱۸۴۵)

مرثیہ عارف

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل، اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور؟

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارفؔ
کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیرّ سے لڑائی
بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش؛
کرنا تھا جواںمرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو، جو کہتے ہو، کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پہ سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھکو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا امبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مکرّر سہرا

جبکہ اپنے میں سمادیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک، گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائیگا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں!
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

معذرت

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سَو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ، ہاں اس سے مدّعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سُخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

نوحہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو اے ماتمیانِ شہِ معصوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہمکو ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہِ نُہ پایا جو مدت سے بچا ہے
کیا خیمۂ شبّیر سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہانتاب کہاں کا ہوگا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رُو سے کہو برق نہیں ہے

قصیدہ

ہاں، مہِ نو سُنیں ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب؛ — بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اُڑ کے جاتا کہاں، کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص — حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امیدگاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تُو — تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو، اے ماہ — قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا — جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اُسکے فیض سے تُو — پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بَن، ماہتاب بن، مَیں کون — مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام
میرا اپنا جُدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص — گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ　　کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام

جبکہ چودہ منازلِ فلکی　　کر چکی قطع تیری تیزیِ گام

تیرے پیکر سے ہوں فروغ پذیر　　کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھوں میں لبریز　　اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا　　توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام　　تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں　　غم سے جب ہوگئی ہو زیست حرام

بوسہ کیسا، یہی غنیمت ہے　　کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس　　اب تو باندھا ہے دَیر میں احرام

اُس قدح کا ہے دَور مجھ کو نقد　　چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ جام

بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار　　دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تُو کہہ　　اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا　　ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

تُو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن	نام شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ	مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف	نَوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز	جس کا ہر قول معنیِ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم	رزم میں اُوستادِ رستم و سام
اے ترا لطف زندگی افزا	اے ترا عہدِ فرخی فرجام
چشمِ بد دُور خسروانہ شکوہ	لوحش اللہ عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم	جُرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے	ایرج و تُور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے	گیو و گودرز و بیژن و رہام
مرحبا موشگافیِ ناوک	آفریں آبداریِ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف	تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند	برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جَسَد کی صدا	تیرے رخشِ سُبک عناں کا خرام
فنِ صورت گری میں تیرا گرز	گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اسکے مضروب کے سر و تن سے	کیوں نمایاں ہو صورتِ اِدغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے	صفحہ ہائے لیالی و ایّام

اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

لکھدیا شاہدوں کو عاشق کش
لکھدیا عاشقوں کو دشمن کام

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبد تیز گردِ نیلی فام

حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

مہر رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہِ تاباں کا نام شحنۂ شام

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بموجب حکم
اُس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائیٔ آغاز
ہو ابد تک رسائیٔ انجام

قصیدہ

صبحدم دروازۂ خاور کھلا
مہر عالمتاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اِک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

سطحِ گردوں پہ پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اِک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے — رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سُلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زرّیں، مہرِ تاباں سے سوا — خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دِل بہادر شہ، کہ ہے — رازِ ہستی اُس پہ سرتاسر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں — مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے — عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام — اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب — ق — تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب — تو کہے بتخانۂ آذر کھلا

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے — منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک — میری حدِّ وسع سے باہر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید — کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار — مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس — لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں، اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا ہے حال دشمن پر کھلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کمان
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی مِنہ اگر دم بھر کھلا

نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو، غالبؔ سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامے نے پائی طبیعت سے مدد
بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
عرض سے یاں رتبۂ جوہر کھلا

مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب علوِ پایۂ منبر کھلا

سِکّۂ شہ کا ہوا ہے روشناس — اب عیارِ آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح، ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستائش نا تمام — عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ اے خاقان نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

صفتِ انبہ

ہاں دلِ دردمندِ زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پہ رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے — نکتہ ہائے خرد فزا لکھئے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخلِ رُطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے — ثمر و شاخ گوئے چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں — آئے یہ گوئے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جائے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے — آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گُل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار — جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی — کوہکن، باوجودِ غمگینی

جان دینے میں اس کو یکتا جان — پر، وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر — کہ دوا خانۂ ازل میں مگر

آتشِ گُل یہ قند کا ہے قوام — شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے — باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے، بہ حکمِ ربُّ النّاس — بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مُہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات — مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل — ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

تھا ترنجِ زر، ایک خسرو پاس — رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

آم کو دیکھتا اگر اِک بار — پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا — نازشِ دودمانِ آب و ہوا

رہروِ راہِ خلد کا توشہ — طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم
نازپروردۂ بہار ہے آم

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد
عدل سے اس کے ہے حمایتِ عہد

فخرِ دیں عزِّ شان و جاہِ جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمائے دین و دولت و بخت
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا ہما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور
جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

اُس خداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بہ سخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ
بکرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توقیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش مری انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحّم مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

دُرِ معنی سے، مرا صفحہ، لقا کی داڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر؟
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں ڈھیل؟

گذارش بحضورِ شہنشاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیّار

گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کارگزار

خانہ زاد اور مرید اور مدّاح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر
نسبتیں ہو گئیں مشخّص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں!
مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد، اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انساں
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وَقِنا ربّنا عذابَ النّار

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سُود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستاں اگر سُنیے — ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے، — ہے قلم میری ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ

نہ پوچھ اِس کی حقیقت حضور والا نے — مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر — جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

مدح

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا، کہ مجھے — تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے — رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں — غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سردست — نسبت اِک گونہ مرے دلکو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں — یہ دعا شام و سحر قاضیٔ حاجات سے ہے
تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا — گو، شرف خضر کی بھی مجھکو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

قطعہ

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو — رکھدیں چمن میں بھر کے مۓ مشکبو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست — سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں — ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند
یوں سمجھیۓ کہ بیچ سے خالی کیۓ ہوئے — لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بیشمار چاند

غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشتِ خواند

قطعہ

اے شاہ جہانگیر جہاں بخشِ جہاندار — ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اس عقدہ کو، سو بھی بہ اشارت

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر!
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت

ہے نقش مریدی ترا فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے ستائش میں تری میری عبارت

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظّارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجھکو شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک
غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

رُباعیات وغیرہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

سہل تھا مسہل، ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گذرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے

تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل، تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے

خجستہ انجمنِ طوئے میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ

ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ
نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی محظوظ

۱۸۵۴ء

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید

کہا غالبؔ سے تاریخ اسکی کیا ہے
تو بولا "اِنشراحِ جشنِ جمشید"

۱۲۷۰ھ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ، شیوعِ دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر، کہ افزائشِ اعداد کرے

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سوا

ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں ——— عشّاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا ——— کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے ——— کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے، اللہ اللہ ——— وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں ——— آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے، غالبؔ لیکن ——— خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے ——— بھیجے ہیں جو ارمغاں، شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار ——— فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

نعت

حق جلوہ گر ز طرز بیانِ محمدؐ ست ——— آرے کلام حق بزبانِ محمدؐ ست
آئینہ دار پرتو مہر ست ماہتاب ——— شان حق آشکار ز شانِ محمدؐ ست
تیرِ قضا ہر آئنہ در ترکش حق ست ——— اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ ست

دانی اگر بہ معنیِ لولاک وارسی
خود ہر چہ از حقیقت ازانِ محمدؐ ست

ہر کس قسم بدآنچہ عزیز ست می خورد
سوگند کردگار بجانِ محمدؐ ست

واعظ حدیث سایۂ طوبےٰ فرو گذار
کاینجا سخن ز سرو روانِ محمدؐ ست

بنگر دو نیمہ گشتن ماہ تمام را
کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ ست

ور خود ز نقش مہر نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ ست

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ ست

حسنِ تغزل

دل بُرد و حق آنست کہ دلبر نتواں گفت
بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت

در رزم گہش ناچخ و خنجر نتواں برد
در بزم گہش بادہ و ساغر نتواں گفت

رخشندگیٔ ساعد و گردن نتواں جست
زیبندگیٔ یارہ و پرگر نتواں گفت

پیوستہ دہد بادہ و ساقی نتواں خواند
ہموارہ ترا شد بت و آذر نتواں گفت

از حوصلہ یاری مطلب صاعقہ تیز است
پروانہ شو اینجا ز سمندر نتواں گفت

ہنگامہ سرآمد چہ زنی دم ز تظلم
گر خود ستمے رفت بمحشر نتواں گفت

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم
با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بمنبر نتواں گفت

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا
مومن نبود غالبؔ و کافر نتواں گفت

روزِ ازل

گویند کہ در روز الست از رہ مستی
حرفے ز لب کافر و دیندار برآمد

آں از نعم آوازہ انکار در افگند
ایں راز بلے معنی اقرار برآمد

آں آب کہ از خاک ہمی سبزہ دماند
در طینت آہن ہمہ زنگار برآمد

در دشت یکے آبلہ زد دانۂ تسبیح
بر دوش یکے رشتۂ زنّار برآمد

زانگونہ در آمیخت یکے با صنم خویش
کش نقش دو پیکر بہ نمودار برآمد

زاں رنگ جگر خست یکے را ستم ہجر
کش لخت دل از دیدۂ خونبار برآمد

راندند یکے را کہ چو لب تشنہ ہمے رفت
ہم تشنہ لب از خانۂ خمّار برآمد

خواندند بلاں مہر کہ از کعبہ یکے را
آواز بیا از در و دیوار برآمد

آں روفت در میکدہ و خردۂ زر یافت
ایں کوفت در صومعۂ و مار برآمد

شوریدہ ادائے بدم تیشہ رواں داد
آشفتہ نوائے بسر دار برآمد

آسودہ بفردوس بریں آدم و ناگاہ
از دمدمۂ دیو تبہ کار برآمد

آں یک کہ برآمد چہ قدر نام برآورد
ویں یک کہ برآورد چساں خوار برآمد

ایں دائرہ کز دور نیا سود زمانے
بے واسطۂ گردش پرکار برآمد

آئینِ مغرب

صاحبانِ انگلستاں را نگر — شیوۂ و انداز ایشاں را نگر

تا چہ آئینہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت — سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت

حقِ ایں قوم ست آئیں داشتن — کس نیارد ملک بہ زیں داشتن

داد و دانش را بہم پیوستہ اند — ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

آتشے کز سنگ بیروں آورند — ایں ہنرمنداں ز خس چوں آورند

تا چہ افسوں خواندہ اند ایناں بر آب — دود کشتی را ہمی راند در آب

گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد — گہ دخاں گردوں بہاموں می برد

غلطک گردوں بگرداند دخاں — نرہ گاو و اسپ را ماند دخاں

از دخاں زورق برفتار آمدہ — باد و موج ایں ہر دو بیکار آمدہ

نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند — حرف چوں طائر بپرواز آورند

ہیں نمی بینی کہ ایں دانا گروہ — در دو دم آرند حرف از صد گروہ

می زنند آتش بباد اندر ہمے — می درخشد باد چوں اخگر ہمے

کاروبار مردمِ ہشیار بیں — در ہر آئیں صد نو آئیں کار بیں

پیشِ ایں آئیں کہ دارد روزگار — گشتہ آئینِ دگر تقویم پار!

چراغِ سحری

۱۸۵۷ تا ۱۸۶۷

قندِ پارسی

ہم انا اللہ خواں درختے را بگفتار آورد
ہم انا الحق گوئے مردے را بہ دار آورد

ایکہ پنداری کہ ناچاراست گردوں در روش
نیست ناچار آں کہ گردوں را برفتار آورد

نکتۂ داریم و با یاراں نمیگوئیم فاش
طالب دیدار باید تابِ دیدار آورد

آں کند قطع بیاباں ایں شگافد مغزِ کوہ
عشق ہر یک را بطرزِ خاص در کار آورد

جذبِ شوقش بیں کہ در ہنگامِ برگشتن زِ دیر
در قفائے خویشتن بُت را برفتار آورد

دانہا چوں ریزد از تسبیح تارے پیش نیست
ایں مشعبد ہر گاہ از سبحہ زنار آورد

نزدِ ما حیف است گو نزدِ زلیخا میل باش
جذبۂ کز چاہ یوسف را ببازار آورد

ہر انارے را کہ افشاریم از مے خوں چکد
ہر نہالے را کہ بنشانیم دل بار آورد

نیست چوں در منطقش جز ذکرِ شاید حرف و صوت
شاہدے باید کہ غالب را بگفتار آورد

(۱۸۶۵)

اے ذوقِ نوا سنجی بازم بخروش آور
غوغائے شبیخونے بر بنگہ ہوش آور

گر خود نجہد از سر از دیدہ فرو بارش
دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور

ہاں ہمدمِ فرزانہ دانی رہِ ویرانہ
شمعے کہ نخواہد شد از باد خموش آور

شورابہ ایں وادی تلخ است اگر دادی
از شہر بسوئے من سرچشمہ نوش آور

دانم کہ زرے داری ہر جا گزرے داری
مے گر ندہد سلطاں از بادہ فروش آور

گر مُغ بکدو ریزد بر کف نہ و راہی شو
ور شہ بسبو بخشد بردار و بدوش آور

ریحاں دمد از مینا رامش چکد از قلقل
آں در رہِ چشم افگن ویں از پئے گوش آور

گاہے بسبکدستی زاں بادہ ز خویشم بر
گاہے بسیہ مستی از نغمہ بہوش آور

غالب کہ بقایش باد ہم پائے اگر ناید
بارے غزلے فردے زاں موئینہ پوش آور

قصیدہ

در روزگار ما نتواند شمار یافت
خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

پرکار تیز گرد فلک در میاں ببیں
حق داد دادِ حق کہ بمرکز قرار یافت

درہائے آسماں بزمیں باز کردہ اند
ہر کس ہر آنچہ جست بہر رہگذار یافت

آمد اگر بغرضِ زبالا بلا فرود
بر روئے خاک پیچ و خم زلفِ یار یافت

چوں حسنِ ماہِ یکشبہ بینی بداں کہ ماہ
پاداش جانگدازیٔ شبہائے تار یافت

چوں رنگ روئے گل نگری شاد شو کہ گل
اجر جگر خراشیٔ پیکانِ خار یافت

درخاک و باد و آتش و آب آشتی فزود | ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت
ناچار جز بداد گرایش نمے کند | در دہر ہر چہ صورت ازیں ہر چہار یافت
ہر کس بقدر فطرت خویش ارجمند گشت | ہر شے بہ حسن جوہر خویش اشتہار یافت
گر خواجہ بندہ راخط آزادگی بنشست | ہم بر در سرائے خودش بندہ وار یافت
در بندہ خود ز خشم خط بندگی درید | توقیع خوشدلی ز خداوندگار یافت
مہ روشنی و مہر فروزش ز سر گرفت | لیل و نہار صورت لیل و نہار یافت
بہرام دل بہ بستن تیغ و کمر نہاد | ناہید ذوق ورزشِ مضراب و تار یافت
نظارہ فتنہ ہائے عیاں از نظر سترد | اندیشہ گنجہائے نہاں آشکار یافت
برہم زدند قاعدہ ہائے کہن بدہر | ہر کس نشاط تازہ ز ہر گونہ کار یافت
فیضِ سحر بہ غالب پیمانہ کش رسید | ذوقِ صبوح عابد شب زندہ وار یافت

غزلیاتِ اُردو

ممکن نہیں ہے بھول کے بھی آرمیدہ ہوں | میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار ہو | گہ نالۂ کشیدہ گہ اشکِ چکیدہ ہوں
جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن | از بسکہ تلخیٔ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں
نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ | میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں
ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ | نے دانۂ فتادہ ہوں نے دامِ چیدہ ہوں

جو چاہتے نہیں وہ مری قدر و منزلت — میں یوسفِ بہ قیمتِ اول خریدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ — ہوں میں کلام نغز ولے ناشنیدہ ہوں

اہلِ ورع کے حلقے میں ہرچند ہوں ذلیل — پر عاصیوں کے زمرہ میں مَیں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئنہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں[1] (؟)

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ — ہوا ہے موجبِ آرام جان و تن تکیہ

خراج بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج؛ — کہ بن گیا ہے خمِ جعدِ پر شکن تکیہ

بنا ہے تختۂ گلہائے یاسمیں بستر — ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ

---

[1] یہ غزل اور اسکے بعد کی دو غزلیں[2] بطورِ غیر متداول کلام کے رسالہ اُردو اورنگ آباد اور چند کتب میں شایع ہوئی ہیں۔ غالب کی تصنیفات میں ان کے متعلق کوئی اندراج نہیں۔ لیکن چونکہ یہ سبھی خاندانِ لوہارو کے افراد سے حاصل ہوئی ہیں۔ اور نواب ضیاء الدین کے ورثا سے اشعار غالب کا ملنا کوئی عجیب بات نہیں۔ ہم نے بھی انہیں درجِ کتاب کردیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ انہیں اس وثوق سے کلامِ غالب نہیں کہا جا سکتا جس طرح اُس غزل اور اُردو قطعہ کو جو مرزا کی زندگی میں اردوئے معلی میں انکے نام سے درج ہوگئے تھے۔

ممکن ہے۔ مرزا ان میں سے بعض کی اشاعت کو اپنی شاعرانہ شہرت کے لئے مفید نہ سمجھتے ہوں۔ ایک شاعر دوستوں کی خوشنودی کیلئے یا کسی موقع پر تفریحاً کئی ایسے اشعار لکھتا ہے۔ جو اسکے دیوان میں شایع ہونیکے قابل نہیں ہوتے۔ مثلاً غالب نے مرزا شہاب الدین ثاقب کے متعلق نواب علاء الدین کے خط میں جو دو اُردو رباعیاں لکھی ہیں۔ یا لوہارو نہ جانے کے متعلق جو قطعہ لکھا ہے۔ وہ شاعرانہ حیثیت سے یقیناً اس قابل نہیں کہ انہیں مرزا کے باقی کلام کے ساتھ محفوظ رکھا جائے۔ ہم نے غیر متداول کلام جمع کرتے وقت ان اشعار کو نظر انداز کردیا ہے۔ اور ردیف "تکیہ" والی غزل کے دو شعر جو سوقیانہ یا شاعرانہ حسن سے عاری تھے حذف کردیئے ہیں۔ ان کے علاوہ غالب کے مستند غیر متداول کلام کا مکمل ترین مجموعہ شاید "غالب نامہ" میں ہی ملے گا۔

[2] ہم یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ نواب سراج الدین والیٔ لوہارو ان غزلیات کو کلام غالب نہیں سمجھتے۔

فروغِ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام — جو رختِ خواب ہے پرویں تو ہے پرن تکیہ

اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر — اُٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ

بضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا — کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ

یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہوتے تک — رکھو نہ شمع پہ اے اہلِ انجمن تکیہ

اگرچہ پھینکدیا تم نے دُور سے لیکن — اٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ

غش آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو — ہوئی ہے اس کو مری نعشِ بے کفن تکیہ

شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا — کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے من تکیہ

روا رکھو نہ رکھو تھا جو لفظ "تکیہ کلام" — اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سخن تکیہ"

ہم اور تم فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں — فقیر غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

آپ نے مسّنی الضر کہا ہے تو سہی — یہ بھی اے حضرتِ ایوبؑ گلا ہے تو سہی

رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیوں سر — ذہن میں خوبیٔ تسلیم و رضا ہے تو سہی

ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر — نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی

دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری — نہ سہی نیک تمنائے دوا ہے تو سہی

غیر سے دیکھیے کیا خوب نباہی اس نے — نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں مَیں — کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آ جائیگی کیوں کرتے ہو جلدی غالب
شہرۂ تیزیٔ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہے ؟ تکلف بر طرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

ذرا کر زور سینہ پر کہ تیرِ پر ستم نکلے ؟ جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا واعظ ؟ کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتارِ بلا ہیں کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہے

یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

تم ہو بُت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یا رب سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا اور سہی

حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی آپکا شیوہ و اندازو ادا اور سہی

تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھاکے نہ پانی مانگوں زہر کچھ اور سہی آبِ بقا اور سہی

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی

ایک بیداد گہِ رنج فزا اور سہی سنہ ۱۲۸۲ھ

لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے جان جائے تو بلا سے پہ کہیں دل آئے

اُن کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری — دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ — ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے

آئیں جس بزم میں وہ لوگ پکار اٹھتے ہیں — لو وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے

دیدہ خوں بار ہے مدت سے ولے آج ندیم — دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے نہ کریں — عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے

اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ — آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

رستخیز بیجا

بسکہ فعالِ ما یُرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا

شہرِ دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک — ق — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا

گاہ جل کر کیا کئے شکوہ — سوزشِ داغہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کئے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا (۱۸۵۷)

فرد

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے — کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

قصیدہ

ملاذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ
جنابِ عالی ایلن برون والا جاہ

بلند رتبہ و حاکم وہ سرفراز امیر
کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کلاہ

وہ محضِ رحمت و رافت کہ بہرِ اہلِ جہاں
نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ

وہ عینِ عدل کہ دہشت سے جس کی پرسش کے
بنے ہے شعلۂ آتش انیس پرِ کاہ

زمیں سے سودہ گوہر اُٹھے بجائے غبار
جہاں ہو توسنِ حشمت کا اسکے جولاں گاہ

وہ مہرباں ہو تو انجم کہیں الٰہی شکر
وہ خشمگیں ہو تو گردوں کہے خدا کی پناہ

یہ اسکے عدل سے اضداد کو ہے آمیزش (ق)
کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہر سرِ راہ

ہزبر پنجے سے لیتا ہے کام شانے کا
کبھی جو ہوتی ہے اُلجھی ہوئی دمِ روباہ

نہ آفتاب ولے آفتاب کا ہم چشم
نہ بادشاہ ولے مرتبہ میں ہمسرِ شاہ

خدا نے اسکو دیا ایک خوبرو فرزند
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوئے ماہ

زہے ستارۂ روشن کہ جو اُسے دیکھے
شعاعِ مہرِ درخشاں ہو اُس کا تارِ نگاہ

خدا سے یہ ہے توقع کہ عہدِ طفلی میں
بنے گا شرق سے تا غرب اس کا بازیگاہ

جوان ہو کے کریگا یہ وہ جہانبانی
کہ تابع اسکے ہوں روز و شب سپید و سیاہ

کہے گی خلق اسے داورِ سپہر شکوہ
لکھیں گے لوگ اسے خسروِ ستارہ سپاہ

عطا کرے گا خداوندِ کارساز اسے
روانِ روشن و خوئے خوش و دلِ آگاہ

ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اسے
پڑے نہ قطعِ خصومت میں احتیاجِ گواہ

یہ ترک تازسے برہم کرے گا کشورِ روس — یہ لیگا بادشہ چیں سے چھین تخت و کلاہ
سنین عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھاون — یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ
یہ جتنے سیکڑے ہیں سب ہزار ہو جائیں — درازہ اس کی ہو عمر اس قدر سخن کو تاہ

۱۲۷۷ھ

اس کتابِ طرب نصاب نے جب — آب و تاب انطباع کی پائی
فکر تاریخ سال میں مجھ کو — ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو — دیئے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا — باہزاراں ہزار زیبائی
سال ہجری تو ہو گیا معلوم — بے شمولِ عبارت آرائی
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو — ہے جداگانہ کارفرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ — بہ امیدِ سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم — جن سے ہے چشم و جاں کو زیبائی
اور بارہ امام ہیں بارہ، — جن سے ایماں کو ہے توانائی
ان کو غالبؔ یہ سال اچھا ہے — جو ائمہ کے ہیں تولائی

سہرا

ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدیں خاں — بزمِ شادی ہے فلک کاہکشاں ہے سہرا
اُن کو لڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں سمجھو — ہے تو کشتی میں ولے بحرِ رواں ہے سہرا

قصیدہ

مرحبا! سالِ فرخی آئیں — عیدِ شوال و ماہِ فروردیں

شب و روز افتخارِ لیل و نہار — مہ و سال اشرفِ شہور و سنیں

گرچہ ہے بعد عید کے نوروز — لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں

سو اس اکیس دن میں ہولی کی — جا بجا مجلسیں ہوئیں رنگیں

شہر میں کو بہ کو عبیر و گلال — باغ میں سو بسو گل و نسریں

شہر گویا نمونۂ گلزار — باغ گویا نگار خانۂ چیں

تین تیوہار اور ایسے خوب — جمع ہرگز ہوئے نہ ہونگے کہیں

پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں — منعقد محفلِ نشاط قریں

محفلِ غسلِ صحتِ نواب — رونق افزائے مسندِ تمکیں

بزم گہہ میں امیرِ شاہ نشاں — رزم گہ میں حریفِ شیر نگیں

پیشگاہِ حضور شوکت و جاہ — خیر خواہِ جناب دولت و دیں

جن کی مسند کا آسماں گوشہ — جن کی خاتم کا آفتاب نگیں

جن کی دیوارِ قصر کے نیچے — آسماں ہے گدائے سایہ نشیں

دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور — نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں

انجمِ چرخ گوہر آگیں فرش — نور بے ماہ ساغرِ سیمیں

راجہ اندر کا جو اکھاڑہ ہے — ہے وہ بالائے سطحِ چرخ بریں

وہ نظر گاہِ اہلِ وہم و خیال — یہ ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں
واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم — کہ جہاں گد یہ گر کا نام نہیں
یاں زمیں پہ نظر جہاں تک جائے — ژالہ آسا بچھے ہیں دُرِّ ثمیں
نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا — جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں
اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون — یاں وہ دیکھا بہ چشمِ صورت بیں
سرورِ مہر فر ہوا جو سوار — بہ کمالِ تجمّل و تزئیں
سب نے جانا کہ ہے پری توسن — اور بالِ پری ہے دامنِ زیں
نقشِ سُمِ سمند سے یک سر — بن گیا دشت دامنِ گلچیں
فوج کی گرد راہ مشک فشاں — رہ رووں کے مشام عطر آگیں
بس کہ بخشی ہے فوج کو عزّت — فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں
موکبِ خاص یوں زمیں پر تھا — جس طرح ہو سپہر پہ پرویں
چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام — ران پہ داغِ تازہ دیکے وہیں
اور داغ آپ کی غلامی کا — خاص بہرام کا ہے زیبِ سُریں
بندہ پرور ثنا طرازی سے — مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں
آپ کی مدح اور میرا مُنہ — گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں
اور پھر اب کے ضعفِ پیری سے — ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و نیستی! خدا کی پناہ — دست خالی و خاطرِ غمگیں

صرف اظہار ہے ارادت کا ہے قلم کو جو سجدہ ریز ہیں

مدح گستر نہیں دعا گو ہے غالبؔ عاجزِ نیاز آگیں

ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں تم رہو زندہ جاوداں آمیں

خاتمہ

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے

عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

مآخذ

۱- دیوان غالب۔ قلمی نسخہ بھوپال لائبریری سنہ ۱۲۳۷ھ (مطبوعہ نسخۂ حمیدیہ)

۲- میخانۂ آرزو (فارسی نظم و نثر) قلمی نمبر ۱۴۱۴ خدا بخش لائبریری سنہ ۱۲۵۸ھ۔

۳- دیوان غالب مطبوعہ (؟ ۱۸۴۲) مملوکہ خان بہادر سید ابو محمدؐ کلکٹر پیلی بھیت۔

۴- نقل دیوان غالب فارسی (؟ ۱۸۴۷) قلمی نمبر ۴۱۱۔ رام پور سٹیٹ لائبریری۔

۵- پنج آہنگ انڈیا آفس لائبریری 306/331)26 سنہ ۱۸۵۴ء

۶- دیوان غالب اردو قلمی نسخہ نمبر ۱۵۲ رام پور سٹیٹ لائبریری سنہ ۱۸۵۵ء

کلیات نظم فارسی۔ کلیات نثر فارسی۔ اردوئے معلیٰ۔ عودِ ہندی۔ درفش کاویانی وغیرہ وغیرہ

---

(۱) عیار الشعرا۔ قلمی۔ انڈیا آفس لائبریری

(۲) تذکرہ سرور۔ قلمی۔ انڈیا آفس لائبریری

(۳) گلشن بیخار۔ قلمی۔ برٹش میوزیم نمبر ۲۱۶۴

(۴) دہلی ریذیڈنسی کے ریونیو ریکارڈز

(۵) آثار الصنادید سنہ ۱۸۴۵ء

(۶) تذکرۃ الشعرائے اردو۔ مولوی کریم الدین سنہ ۱۸۴۸ء

گلشنِ بیخزاں۔ جلوہ خضر۔ تذکرۂ غوثیہ۔ کلیاتِ شیفتہ وغیرہ وغیرہ

تصاویرِ غالبؔ

غالبؔ نے ۱۸۶۸ء میں اپنی ایک تصویر بڑودہ میں نواب میر ابراہیم علی خاں وفاؔ کو بھیجی تھی۔ خیال تھا کہ اس مستند تصویر کی ایک نقل ہم شایع کر سکیں گے۔ لیکن میر انتظام علی خاں صاحب سے جو نواب مرحوم کے پوتے ہیں معلوم ہوا ہے۔ کہ آج سے ۳۰۔۳۵ سال پہلے ظہیرِ دہلوی یہ تصویر دہلی لیگئے تھے۔ ہم نے خواجہ حسن نظامی صاحب کی وساطت سے دہلی میں اس تصویر کی تلاش کی۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔

ہم تصویر کے متعلق متردد تھے۔ کہ حُسنِ اتفاق سے نواب سر امیر الدین والئے لوہارو، نواحِ سُورت میں تشریف لے آئے۔ آپ نہ صرف مرزا کے ایک قریبی عزیز ہیں۔ بلکہ آپ کو غالب سے ملاقات کا فخر حاصل رہا ہے۔ اور مرزا کا ایک خط آپکے نام اردوئے معلےٰ میں موجود ہے۔ آپ ازراہِ کرم بخشی کئی مرتبہ غریب خانہ پہ تشریف لائے اور گھنٹوں غالب کے متعلق سوالات کا جواب دیتے رہے جس سے اس کتاب کے کئی اندراجات کی تصدیق ہوسکی۔ تصاویر کے متعلق آپنے فرمایا۔ کہ مرزا کی وفات سے دو تین سال پہلے اُن کی عکسی تصویر سدھاری خاں فوٹو گرافر نے کھینچی تھی۔ اسکی نقلیں اب عام طور پر ملتی ہیں۔ اصل تصویر میرے پاس ہے۔ مرزا نے اسکی نقلیں مختلف دوستوں کو بھیجی تھیں اس تصویر کے علاوہ نواب ممدوح کے پاس مرزا کی آخری دستخطی تحریر ہے۔ جسمیں انہوں نے مرنے سے چند مہینے پہلے نواب علاء الدین کو اردو شاعری میں اپنا جانشین قرار دیا تھا۔ مرزا اس زمانے میں خطوط دوسروں سے لکھواتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ تحریر ایک سند تھی اسے انہوں نے تمام و کمال اپنے ہاتھ سے لکھا۔

گذشتہ چند سالوں میں غالب کی جو نئی تصویریں شایع ہوئی ہیں وہ ہم نے نواب صاحب کو دکھائیں لیکن انہوں نے کسی کی تصدیق نہیں کی نسخہ حمیدیہ میں غالب کی جو تصویر شایع ہوئی ہے وہ مصورانہ نقطہ نظر سے اچھی ہے لیکن نواب صاحب نے اسے غالب یا غالب کے معاصرین میں سے کسی کے پاس نہیں دیکھا غالب کی جوانی کی جو رنگین تصویر "مکمل شرح کلام غالبؔ" میں شایع ہوئی ہے وہ تو یقیناً زمانۂ حال کی ہے۔ تاریخ ادبیات اردو میں بھی غالب کی ایک نئی تصویر ہے یہ بھی اس کتاب کیلئے حال ہی میں حکیم محمد حسن مصور نے تیار کی۔ غالب کی ایک معاصرانہ تصویر لال قلعہ دہلی میں موجود ہے۔ یہ غالباً ابھی تک کہیں شایع نہیں ہوئی۔

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام سید عظیم الدین منادی پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر مسلم گجرات سورت سے شائع ہوا۔ فیض تبسم کاتب

ملنے کا پتہ

۱ اپنے شہر کے ممتاز تاجران کتب سے طلب کریں

یا

۲ براہ راست مینیجر : مسلم گجرات پریس ـ سورت

صوبۂ بمبئی سے منگوائیں

قیمت

مجلد ـ تین روپیہ

بلاجلد ـ ڈھائی روپیہ

صرف ٹائٹل اور تصاویر "مسلم گجرات پریس" سورت میں طبع ہوئے